
شورش کاشمیری
پسِ دیوارِ زنداں

شورش کاشمیری



پسِ دیوارِ زنداں

اشاعت اوّل

فروری سنہ ۱۹۷۱

تعداد ــــ دو ہزار

مطبع ــــ چٹان پرنٹنگ پریس لاہور

ناشر ــــ مطبوعات چٹان ـــ لاہور

قیمت ــــ پندرہ روپے

پسِ دیوارِ زنداں

(۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک کے ایامِ قید و بند کی روداد)

شورش کاشمیری

مطبوعاتِ چٹان
۸۸ میکلوڈ روڈ ○ لاہور

میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں

ابوالکلام آزاد ——

اِنتساب

یہ کہانی میرے جواں سال بھائی یورش کاشمیری کی موت پر ختم ہوتی ہے، جی چاہتا تھا اس کے نام معنون کروں لیکن اس کے لئے ان اوراق میں کیا دھرا ہے، اس کی جواں مرگی کو چوتھائی صدی گذر چکی ہے وہ اپنا توشہ ساتھ لے گیا، یہ توشہ اس کے لئے بے معنی ہے۔

معاً بعض دوستوں کے چہرے سامنے آگئے لیکن نگہ نارسا کے باعث ایک ایک چہرہ اوجھل ہوگیا، کئی رہنماؤں کی تصویریں اُبھریں لیکن دلِ گستاخ تیوری چڑھا کر نکل گیا۔ شاہوں کا زمانہ نہیں کہ اس نالۂ احتجاج کو ان سے منسوب کروں، حکمرانوں کا دَور لد گیا ورنہ انہیں یہ آئینہ ضرور دکھاتا، نئی پود کا دل جھُریوں سے بہلانا مشکل ہے، بوڑھوں کے لئے عمرِ رفتہ میں کیا رکھا ہے تاہم ان اوراقِ عبرت کو ان ساتھیوں کی یاد سے منسوب کرتا ہوں جن سے کبھی قافلۂ جہاد رواں دواں تھا، آج ان میں سے کوئی باقی نہیں ——— جانے کب ملاقات ہو ؎

به آں گروه که از ساغرِ وفا مستند
سلامِ ما برسانید هر کجا هستند

شورش کاشمیری

لاہور
یکم فروری ۱۹۷۱ء

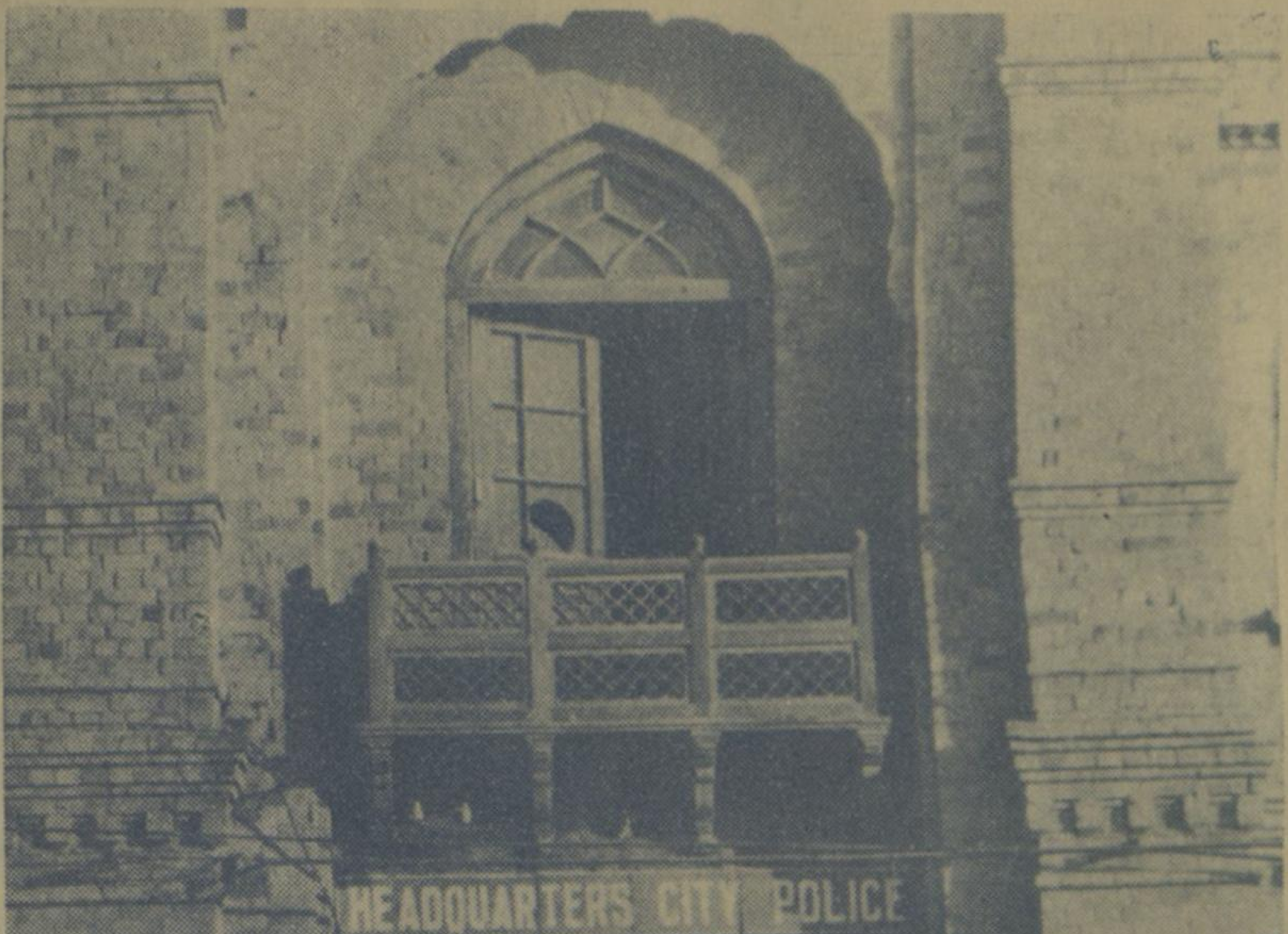


جواں مرگ یورش کاشمیری

اس کہانی کا حرفِ آخر

نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا





جواب بھی ہے

سٹی کوتوالی لاہور



جو کبھی تھا

بورسٹل جیل

لاہور



مولف کو
جب
درخت سے
باندھا گیا



کر غم کو اختیار کہ گزرے تو غم نہ ہو

بانجھ دھرتی

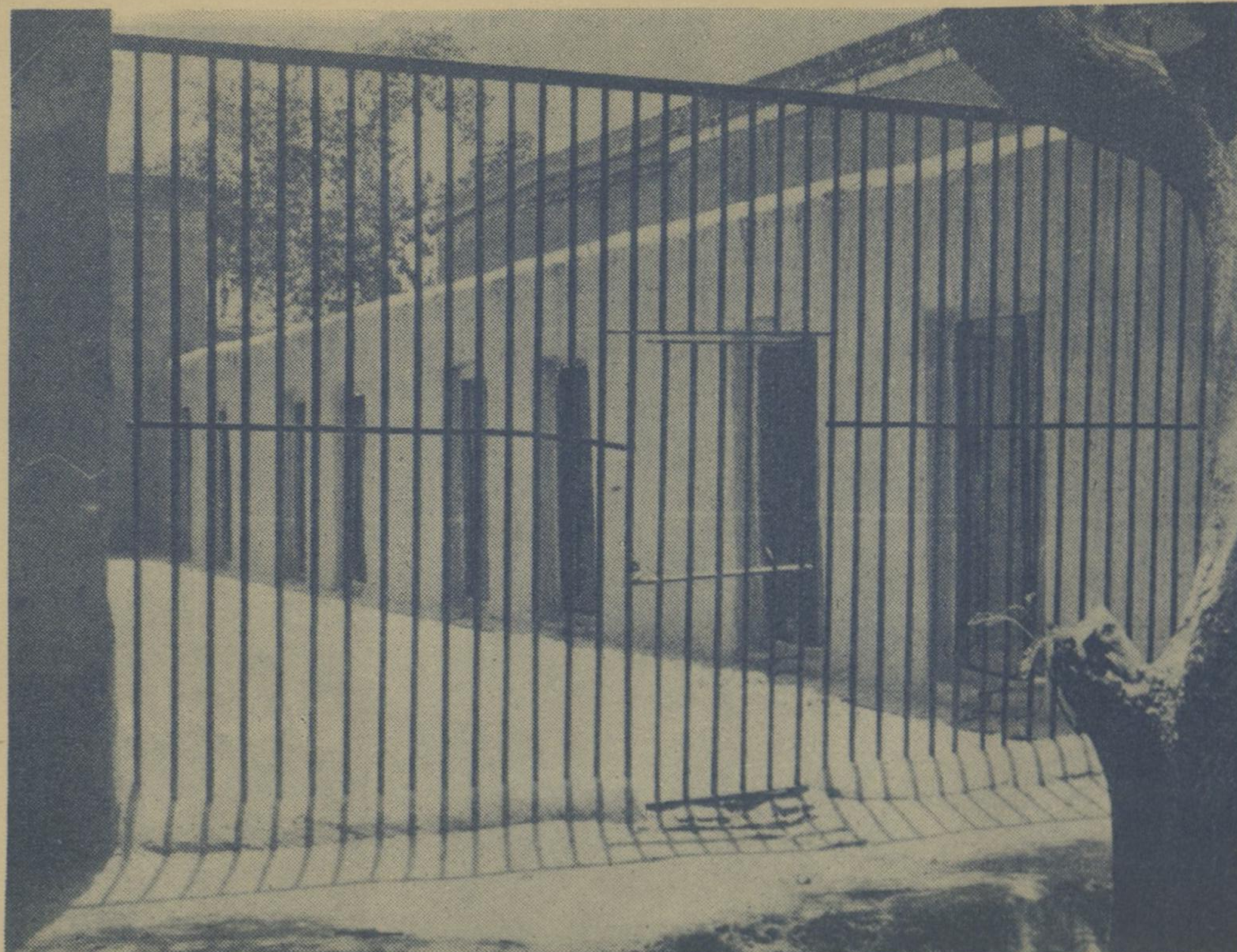
مقہور انسان



چھ چکیاں

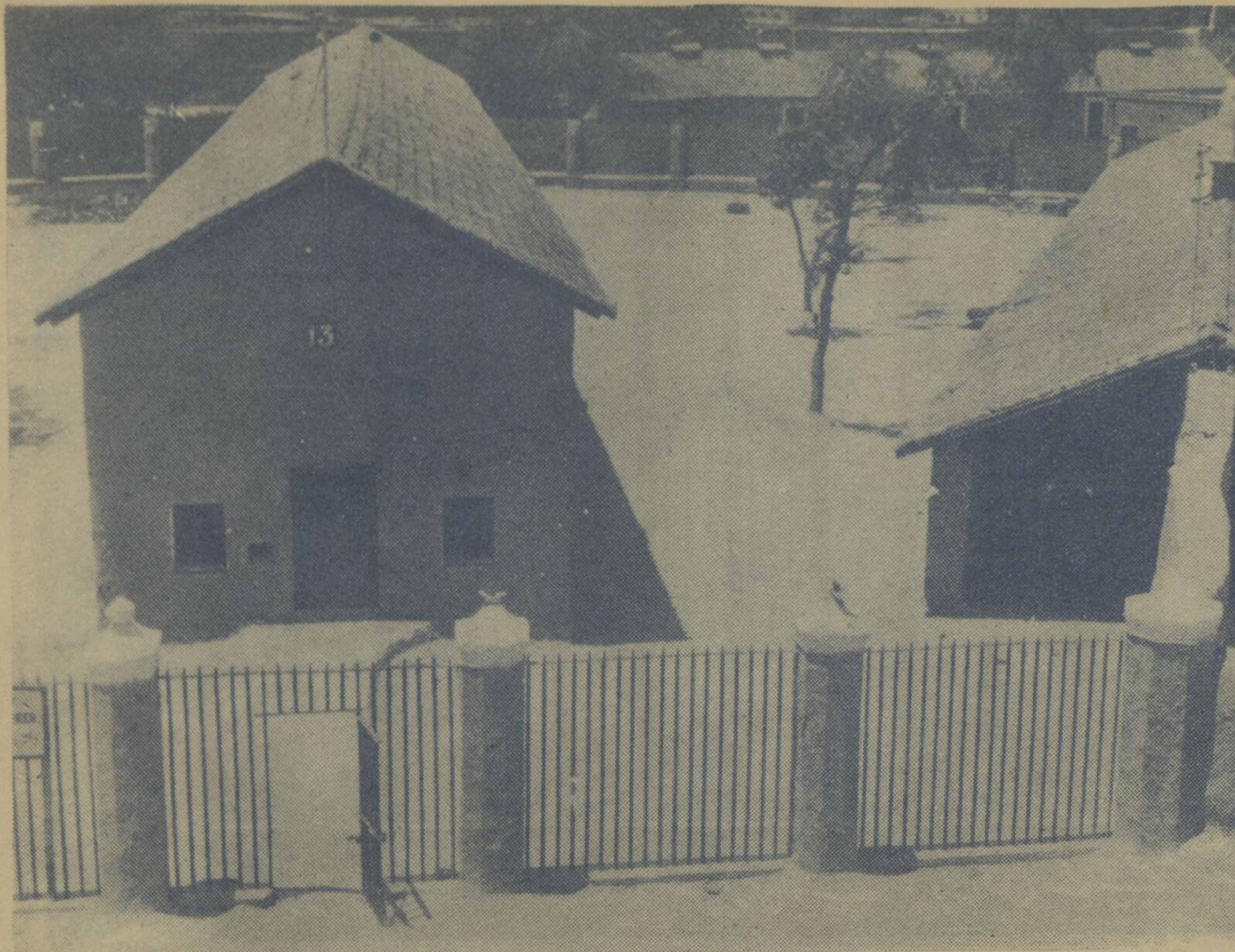
انسانوں کی

شکارگاہ





گورہ وارڈ ——— دس برس تک کتنی دیواروں کے پیچھے ہم رہے



سنٹرل جیل لاہور

احاطہ دوم

ایامِ قیدؒ
کے مدفن

غالباً ۱۹۵۲ میں اس کتاب کی اشاعت کا اعلان کیا تھا لیکن آج انیس سال بعد کتاب شائع کی جا رہی ہے، لطف کی بات یہ ہے کہ اس دوران میں تین دفعہ آزمائش و ابتلا کے انہی مرحلوں سے گذر چکا ہوں، ایک دفعہ ۱۹۵۲ء میں صوبائی حکومت نے سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کیا، میرا جرم ایک تقریر تھی۔ ہفتہ عشرہ جیل میں رہا، سیشن جج کی عدالت سے ضمانت ہو گئی تو وزارت نے مقدمہ واپس لے لیا، دوسری دفعہ ستمبر ۱۹۶۶ء میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان چٹان کے ایک اداریہ سے ناراض ہو گئے تو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت نظر بند کر دیا تب دو ماہ کے لگ بھگ سنٹرل جیل منٹگمری (اب ساہیوال) میں رہا، وہاں سے بیمار ہو کر لاہور میو ہسپتال منتقل ہو گیا، یہاں بھی قریب قریب دو ماہ کاٹے، کامن ویلتھ پریس یونین (لندن) اور انٹرنیشنل پریس انسٹی ٹیوٹ (جینوا) نے حکومت سے وجوہ دریافت کئے، چونکہ آئیں بائیں شائیں کے سوا کوئی جواب نہ تھا لہٰذا ایوب خان سپر انداز ہو گئے، ایکا ایکی رہا کر دیا ابھی ڈیڑھ سال گذرا تھا کہ ۲ مئی ۱۹۶۸ء کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت دوبارہ گرفتار کر کے ڈیرہ اسماعیل خان

جیل بھجوا دیا جن لوگوں کو اس جیل کا علم یا تجربہ ہے وہ جانتے ہیں کہ یہاں کن لوگوں کو رکھا جاتا، کیوں رکھا جاتا؟ اور تعزیر و سزا کے اس جہنّم کا حدود اربعہ کیا ہے؟ میری بھوک ہڑتال اور ہائی کورٹ کی مداخلت سے حکومت بے بس ہوگئی۔ ڈیرہ سے نکال کے طیارہ پر کراچی بھیج دیا، اس دفعہ نظربندی بلا میعاد تھی لیکن حکومت اس قدر رسوا ہوئی کہ اُسے جھکنا پڑا، میری پینتالیس دن کی بھوک ہڑتال نے اس کے چھکے چھڑا دیئے ایّوب خان کے گوبلز نے مشورہ دیا کہ حکومت کا جھکنا صحیح نہ ہوگا اس کے پرسٹیج میں دراڑ آجائے گی لیکن ایوب خان اور موسیٰ خان اپنے وقار کی مورتی توڑ چکے تھے، دونوں زرد پتوں کی طرح جھڑ گئے اور میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے رہا ہوگیا ——

پہلی نظربندی (۱۹۶۶ء) کے تاثرات و تصورات مَیں نے **"تمغۂ خدمت"** کے نام سے لکھے ہیں واضح رہے کہ تمغۂ خدمت سرکاری خطابات میں سے ایک خطاب ہے جو قومی خدمات کے صلہ میں صدرِ مملکت عطا کرتے ہیں، مَیں نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں قلم و زبان اور قول و عمل سے ملک و قوم کے لئے جو کچھ کیا اس کا اعتراف اور اس پر اظہار تحسین مملکت کے صدر، اور صوبہ کے گورنر بالمشافہ کر چکے تھے لیکن جنگ کی پہلی ہی سالگرہ پر جہاں دوسروں کو خطابات دیئے گئے وہاں مجھے گرفتار کر لیا گیا، اس رعایت سے مَیں نے اس کہانی کا نام **"تمغۂ خدمت"** رکھا ہے۔

دوسری نظربندی (۱۹۶۸ء) کے جانگداز واقعات اور رُوح فرسا حالات پر مشتمل ایک ایسی دستاویز ہے کہ اپنے ہی نفس پر غور کرتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ یہ ہنگامہ بھی گذر چکا ہے، آزادی سے پہلے دس سال قید و بند میں رہا لیکن اب کے آٹھ مہینوں میں گویا آٹھ صدیاں گذر گئیں، ایوب خان (صدرِ مملکت) اور موسیٰ خان (گورنر صوبہ) نے

شاید فرض کر لیا تھا کہ وہ ربِ قہار و جبار ہیں لیکن ربِّ رحمٰن و رحیم نے آنِ واحد میں انہیں پٹخ ڈالا، دونوں آوارہ قہقہوں کی طرح اُڑ گئے، تب یہ خیال ہی نہ تھا کہ موت کی سرحد سے واپس آجاؤں گا لیکن جب انسان کسی اعلیٰ مقصد کے لئے مرنے کو تیار ہو تو موت کنی کاٹ کے نکل جاتی ہے، مَیں نے موت کو بھاگتے دیکھا ہے، اس ساری کہانی کا نام اسی لئے **"موت سے واپسی"** رکھا ہے۔

زیرِ نظر کتاب برطانوی عہدِ استعمار میں زمانۂ اسیری کی روداد ہے، دس سال معمولی مدت نہیں، مَیں شعور کے حدود میں داخل ہو رہا تھا کہ پہلی دفعہ ایک تقریر میں ماخوذ ہو کر قید ہو گیا اس کے بعد یہ سلسلہ ۱۹۴۶ء کے اواخر تک چلتا رہا، آخری قید ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ میں سات سال تھی، عجب زمانہ تھا کرم بھی تھا اور ستم بھی، بہت سی یادداشتیں جیل میں قلم بند کر لی تھیں۔ اس سے پہلے ۱۹۳۵ء میں **"قیدی کا روزنامچہ"** لکھا لیکن وہ رہائی کے وقت حکام نے ضبط کر لیا، اب کے یادداشتیں ساتھ لے کر رہا ہُوا لیکن تقسیم کے ہنگاموں میں سارے کا سارا پلندہ غارت ہو گیا۔ قید خانہ ایک ایسی جگہ ہے کہ دماغ و دل پر جو بیتتی ہے ہمیشہ حافظہ پر نقش رہتی ہے، مجھ میں ایک نقص ہے کہ خوشگوار حافظہ کے باوجود سن و سال یاد نہیں رہتے مثلاً مجھ سے یہ پوچھا جائے کہ مَیں ۱۹۶۸ء میں کون سے مہینے اور کون سی تاریخ کو گرفتار ہو کر نظر بند ہُوا تھا تو لازماً مجھے اپنے حافظہ پر زور دینا ہو گا، اس کے باوجود مجھے تذبذب ہو گا کہ نظر بندی کی ٹھیک تاریخ کیا ہے؟ اس نسیان کے باوجود جہاں تک واقعات و حالات اور سانحات و حادثات کا تعلق ہے ان کی تفصیلات و جزئیات تک میرے حافظہ سے محو نہیں ہوتیں، اس بارے میں قدرت نے مجھے بلا کا حافظہ دیا ہے، مَیں اپنے پروردگار کے اس احسان و نعمت پر عرضِ شکر سے قاصر ہوں، انسان احسانات

ایزدی کا شکر ادا کرنا چاہے تو عمر بھر یہ قرض نہیں اتار سکتا۔

قلم اٹھانے سے پہلے اضطراب سا تھا کہ حافظہ کہاں تک ساتھ دیگا، قلم اٹھایا تو واقعات ابھر ابھر کر وارد ہو گئے، معلوم ہوا جیسے لکھ نہیں رہا پڑھ رہا ہوں، کئی سال صرف اس کشمکش میں نکل گئے کہ اسلوب کیا ہو؟ کئی اسلوب ذہن میں آتے اور چلے جاتے رہے، کسی اسلوب پر دل مطمئن نہ ہو سکا۔ باور کیجیے کئی مسودے لکھ کر پھاڑ ڈالے ایک دفعہ ساری کتاب مکمل کر لی لیکن پھر اس لئے سارے کا سارا مسودہ تلف کر دیا کہ میں خود مطمئن نہ تھا، یہ مسودہ جو اب آپ کے سامنے ہے میں نے پانچ چھ سال پہلے لکھا تھا کتابت د طباعت چنداں مشکل نہ تھی، اللہ تعالیٰ کا لطف وکرم شامل حال تھا لیکن سیاسی اشتغال مانع رہے ۱۹۶۶ء میں کتابت مکمل ہو گئی پروف دیکھ رہا تھا کہ نظر بند ہو گیا، اس کے بعد کتابت شدہ مسودہ سیف میں پڑا رہا، دفتر کے رفقا نے بارہا زور دیا طبیعت کو آمادہ نہ کر سکا، آخر اتنے دنوں کی سیاسی جبیت ہار کے بعد یہ کتاب چھپ کر تیار ہوئی ہے اللہ کرے آپ کے ہاتھوں میں پہنچ جائے، ان سطور کی ضرورت نہ تھی یہ ایک طرح کا معذرت نامہ ہے کہ دوستوں نے قریب قریب اُنیس ۱۹ برس انتظار کیا، بہرحال جس کہانی کا آغاز ۱۹۳۵ء میں ہوا تھا آج وہ کہانی ۳۵ برس بعد "شوخیٔ تحریر" سے بے نیاز "کاغذی پیرہن" میں نذر قارئین ہے، اس کا فیصلہ انہیں خود کرنا ہو گا کہ اس پر "نقش فریادی" کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں؟ لیکن اس اعتبار سے اس کے بعض اوراق پر "سخت جانیہائے تنہائی" کا اطلاق ضرور ہوتا ہے کہ ؎

موئے آتش دیدہ تھا حلقہ مری زنجیر کا

یہ کہانی نئی نسلوں کے لئے شاید انوکھی ہو، ان کے دل میں پرانی چیزوں کی طرح

پرانے لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہیں الا ماشااللہ، نوجوان ماضی سے کٹے ہوتے اور ہم انہیں مستقبل سے ہٹے ہوئے نظر آرہے ہیں، ہمارا وجود ان کے لئے متروکاتِ سخن میں سے ہے، ہمارے ساتھ ان کی دلچسپی بس اتنی رہ گئی ہے جتنی تاریخ کے طلبہ کو کھنڈروں سے ہوتی ہے یا تعزیت داروں کو تجہیز و تکفین کے بعد کسی قبر سے رہ جاتی ہے، محفلیں برخاست ہو جائیں تو چراغ صبح تک جلتے ہی رہتے ہیں، یہ کہانی بس ایک ایسے ہی چراغ سحری کی ہے۔

تھوڑا سا تردد ہے کہ بعض چہرے جنہیں تقسیم یہاں سے اٹھا کر ہندوستان لے گئی ان کے ذکر سے ممکن ہے بعض طبائع کھچاؤ محسوس کریں لیکن میرے لئے مشکل تھا کہ ان دوستوں کو بھول جاؤں یا ان ساتھیوں سے بخل کروں جن کے ماتھے پر قشقہ ضرور تھا لیکن جن کے دل آئینہ تھے اس وقت ہمارا سفر ایک تھا اور ہم ایک ہی دھارے پر بہہ رہے تھے، برطانوی استبداد کے خلاف جد و جہد کا دھارا! وہ دوست کیونکر بھلائے جا سکتے ہیں جو اپنے ہی بتکدوں میں اللہ اکبر کی صدا تھے، تاریخ عقیدہ نہیں تجزیہ ہے، کہانی دید و شنید کا تجربہ، شاعری احساس و تخیل کا مشاہدہ پسِ دیوارِ زنداں تجزیہ بھی ہے، تجربہ بھی اور مشاہدہ بھی، اب مطالعہ کے بعد تبصرہ آپ کی ذمہ داری ہے، مؤلف کو ستائش کی تمنا ہے نہ صلے کی پروا، اسد اللہ خاں غالبؔ سے لے کر شورش کاشمیری تک مضمون واحد ہے ع

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

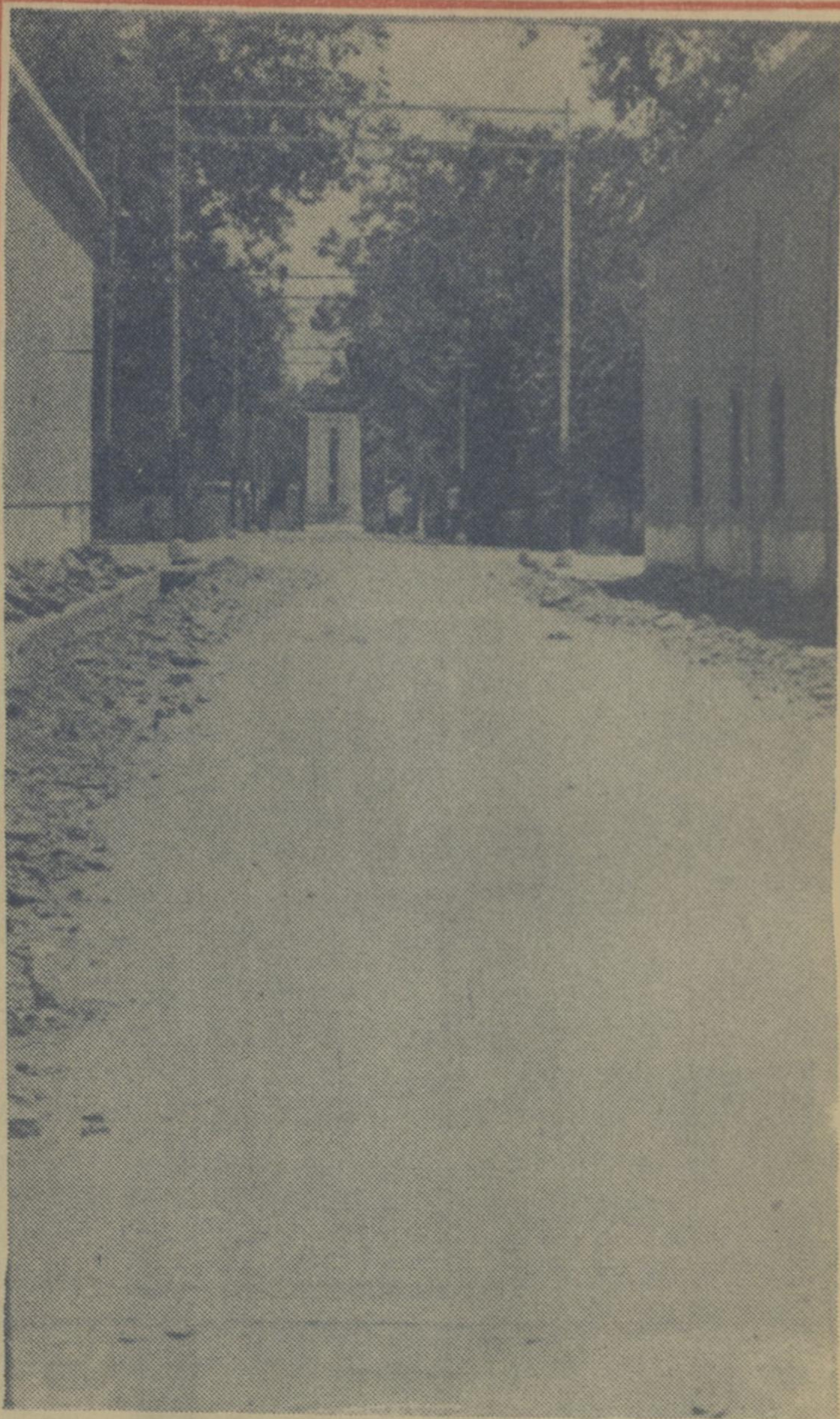
لاہور
یکم فروری ۱۹۷۱ء

شورش کاشمیری

رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْہِ ۚ

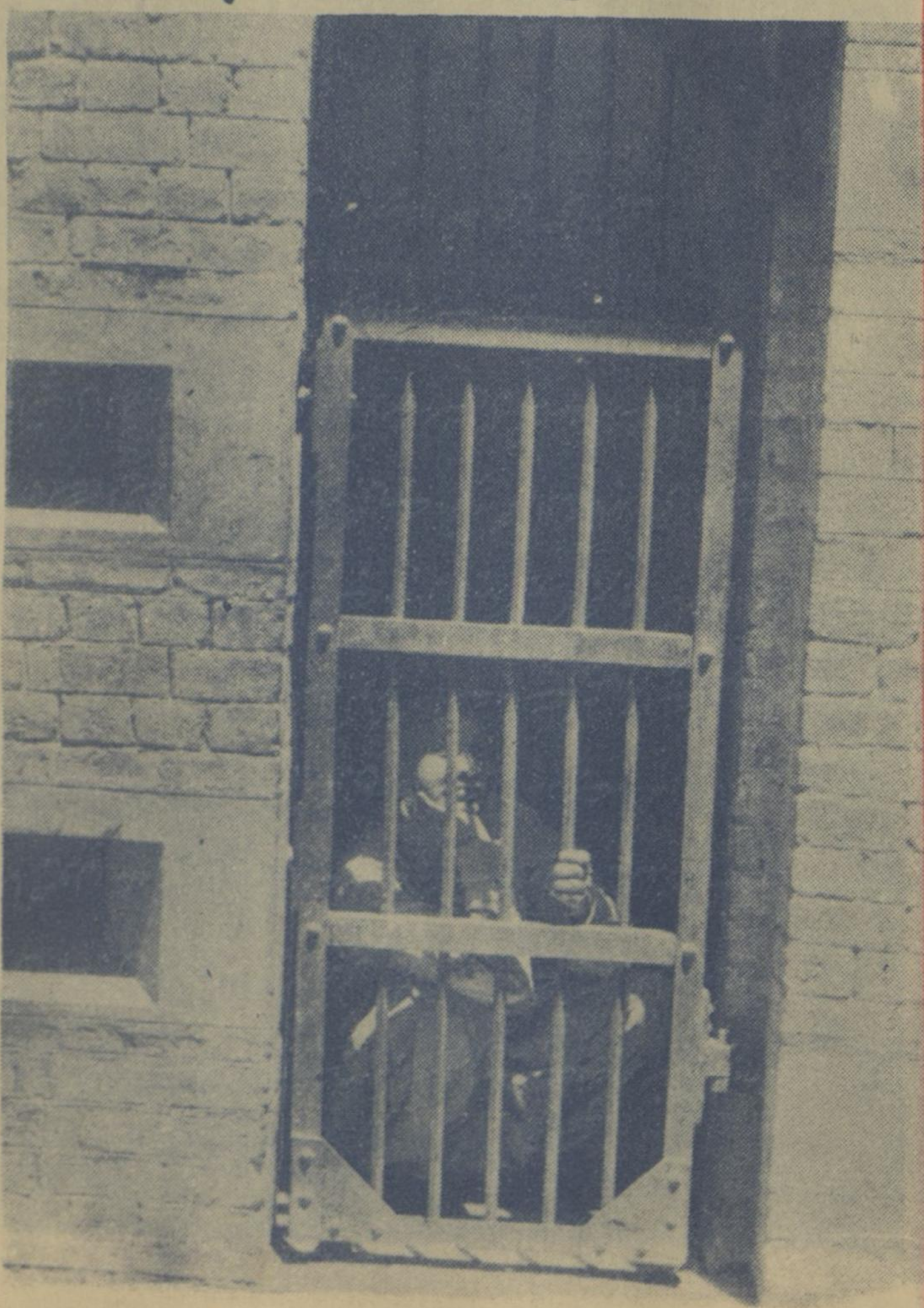
سورہ یوسف پارہ ۱۲ آیت ۳۳

(میرے اللہ! ان کی ترغیبات سے قید خانہ مجھے کہیں زیادہ محبوب ہے)



سنٹرل جیل لاہور

نالہ از بہرِ رہائی نہ کند مُرغِ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود



سنٹرل جیل — مولف — ۱۹۳۷ء

———— جولائی ۱۹۳۵ء کی ایک سہ پہر بورسٹل جیل لاہور کے قدآور سیاہ آہنی پھاٹک کھلے اور بند ہو گئے دونوں پھاٹکوں پر بڑے بڑے تالے دودھیل بھینس کے تھنوں کی طرح لٹک رہے تھے باہر روشنی تھی ڈیوڑھی میں اندھیرا، دربان نے پولیس سے وارنٹ لئے گنتی کی، نام لکھے ایک ایک کو پکارا پھر "چار نفر حوالاتی ازاں ڈسٹرکٹ پولیس لاہور وصول پائے" کی رسید لکھ دی۔

حفیظ اس سے پہلے بھی کانگرس کی سول نافرمانی میں یہاں رہ چکا اور کسی حد تک جیل کے در و دیوار اور قاعدے قانون سے واقف تھا ———— ہم "نووارد" تھے ہمارے لئے سبھی کچھ نیا تھا ———— نرالا سفر انوکھا تجربہ۔

جیلر نے ایک اوچھی سی نگاہ میں چاروں کا جائزہ لیا اور ہم سے کچھ کہے بغیر جمعدار سے کہا انہیں نیو جیل لے جاؤ ———— ٹھگنا دروازہ کھلا جیسے کسی نے کالی کلوٹی عورت کی انگیا اُتار دی ہو سامنے ایک باغیچہ تھا وسط میں ٹکٹکی کھڑی تھی۔ اِدھر اُدھر محافظ آ جا رہے تھے، یہ باقاعدہ ملازم تھے مگر کچھ محافظ قیدی بھی تھے۔

قیدی جب اپنی سزا کا ایک تہائی گزار لیتا ہے تو اُسے بلا مل جاتا اور یہ قیدی چوکیدار کہلاتا ہے پھر جب نصف قید کٹ جاتی ہے تو قیدی اوورسیر بنا دیا جاتا ہے ———— یہ کالی شلوار پہنتا اور کالی پگڑی باندھتا ہے، بعض طویل المیعاد قیدی جو اپنی قید کا اَسّی یا پچاسی فی صد حصہ نیک چلنی سے گزار لیں اُنہیں پیلی پگڑی اور پیلی شلوار مل جاتی

ہے۔ یہ قیدی وارڈر کہلاتے اور وارڈر ہی کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

پیلی وردی کسی قیدی کا آخری عہدہ ہے بہت تھوڑے قیدی اس عہدہ تک پہنچتے ہیں سبھی قیدی اس کے حقدار نہیں ہوتے بعض کڑی دفعات کے قیدی ان رعایات سے محروم ہیں۔ مثلاً ٹھگی، زہر خورانی، خلاف وضع فطری اور زنا کے مرتکبین ان مراعات سے محروم رہتے ہیں۔ قیدی عہدیداروں کا کام اپنے ہی "ساتھیوں" پر حکومت کرنا اور جیل کی چار دیواری میں انتظامیہ کا ہاتھ بٹانا ہے۔ جب انہیں نیلا، کالی اور پیلی مل جاتی ہے تو پھر یہ قیدیوں کے نہیں افسروں کے ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ انہیں ساتھی قیدیوں کی کھال اتارنے سے بھی عار نہیں ہوتی۔ افسروں کے اشارۂ ابرو پر چلتے ہیں۔

حفیظ یہ سب کچھ بیان کر رہا اور ہم بڑی بڑی دیواروں کی ہیبت کو ٹکر ٹکر گھورتے چلے جا رہے تھے بظاہر ان بڑی بڑی دیواروں سے ایک ظالمانہ خوف کا اظہار ہو رہا تھا مگر ہم پر اس خوف کا قطعاً کوئی اثر نہ تھا میں نے حفیظ سے کہا ہمیں مل کر نعرے لگانے چاہئیں حفیظ نے کہا —— یہاں نعرہ لگانے سے کوئی فائدہ نہیں تم اندر کے نظام سے واقف نہیں ہو یہ ہمیں آہنی دیواروں میں بانٹ دیں گے پھر کسی کو خبر نہ ہو گی کہ کون کہاں ہے؟ ہم نے اندر چلتے چلتے کوئی ایک میل لمبا فاصلہ طے کیا تالے کھلتے، بند ہوتے، دیواریں آتیں، نکل جاتیں، احاطوں سے احاطے پیوست، دیواروں سے دیواریں بغل گیر، تالوں کا زنجیروں سے معانقہ، دروازوں کا دیواروں سے مصافحہ، معلوم ہوتا کہ اس دیوار کے پیچھے اب کچھ نہ ہو گا لیکن آہنی دروازے کھلتے ہی دیواروں کا ایک اور سلسلہ موجود ہوتا لاتعداد کوٹھڑیاں، دو منزلہ مذبحے، پانی کے گھاٹ، سپاٹ میدان، سلاخوں کے آغوش میں بیرکیں، بیرکوں کے پہلو میں بان بٹائی، مونج کٹائی، سوت کتائی اور گندم پسائی کے احاطے، بڑ اور پیپل کے درخت ان کے سایہ میں خراس اور کولھوؤں میں جتے ہوئے نو عمر قیدی، وارڈوں کا دھول دھپا، پسینہ میں لُو کی سڑاند —— غرض یہ سارا منظر ایکا ایکی نگاہوں سے نکل گیا —— اپنی جگہ پہنچے تو وہاں بیس ۲۰ پچیس ۲۵ ساتھی پہلے سے موجود تھے جو ایک ہی روز پہلے گرفتار ہوئے تھے۔

ہوا یہ تھا کہ لنڈا بازار میں واقع مسجد شہید گنج کو سکھوں نے گرا دیا جس پر مسلمان قدرتاً بھڑک اُٹھے تھے۔ ایک احتجاجی جلوس شاہی مسجد سے لنڈا بازار کی طرف جا رہا تھا کہ پولیس نے واٹر ورکس کے قریب روکا اور لاٹھی چارج کیا۔ بعض نوجوانوں نے مداخلت کی انہیں پکڑ کر جیل بھجوا دیا۔ حفیظ قندھاری، غازی اسحاق اور میں ہم تینوں تقریر کرنے میں دھر لئے گئے پہلے دن تو میں روپوش رہا دوسرے دن ہاتھ آ گیا۔ مسجد میں جلسہ کیا۔ منبر سے اترا تو سی آئی ڈی کے نرغہ میں آ گیا باہر نکلا تو پولیس نے خیر مقدم کیا۔ پہلے گھیر اڈالا پھر گرفتار کر لیا۔ رات بھر کوتوالی میں رہا صبح وہیں عدالت لگی ہم تینوں کو پیش کیا گیا لیکن مقدمہ آئندہ پیشی پر ملتوی ہو گیا۔ سہ پہر کو پولیس نے جیل میں بھیجدیا۔ ہم آپس میں پہلے ہی سے متعارف بلکہ دوست تھے۔ اب ایک دردِ مشترک نے سب کو ایک دوسرے کا ساتھی بنا دیا۔ کئی ماخوذ نوجوانوں کے سر پھٹے ہوئے تھے۔ قیدی یا حوالاتی کی عمر اٹھارہ سال تک ہو تو انہیں بورسٹل جیل میں رکھا جاتا ہے میں سولھویں سال میں تھا۔ سات یا آٹھ میرے ہم عمر باقی کم عمر تھے تھوڑی دیر بعد کھانا آ گیا ہفتہ وار اخباروں کے عام سائز کی دو بڑی روٹیاں ہتھیلی پر آتے ہی نوالے ہو گئیں ان کے ساتھ دال کا کڑچھا ——— ذائقہ دس گز کے فاصلہ ہی سے بودے رہا تھا۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ املی کی پھانکیں زیادہ تھیں یا دال کے دانے کھیتوں نے بھوکا رہنا پسند کیا میں کوئی سال بھر سے پھٹے حالوں تھا میری طبیعت نے بھی قبول نہ کیا ایک آدھ لقمہ زہر مار کرنا چاہا تو قے ہو گئی اپنی کوٹھڑی میں لیٹ گیا۔ بورسٹل کا نیا حصہ سردار بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کے لئے بنا تھا ——— جتندر ناتھ داس نے باسٹھ روز کی بھوک ہڑتال کے بعد موت کو یہیں لبیک کہا تھا یہ حصہ پرانی بورسٹل جیل کی بہ نسبت بڑا صاف ستھرا اور ہوادار تھا۔ دو منزلہ کوٹھڑیوں کا چہرہ سڑک کی طرف تھا۔ مجھے دوسری منزل میں تیسری کوٹھڑی ملی ——— کچھ دیر لیٹا رہا پھر بالکونی سے سڑک پر آمد و رفت دیکھتا رہا اندر سے باہر کا نظارہ عجیب و غریب ہوتا ہے چونکہ پہلا دن تھا اور میں تھوڑی ہی دیر پہلے یہاں آیا تھا لہٰذا اندر اور باہر میں کوئی خاص فرق محسوس نہ ہوا بلکہ فضا کی یکسانی اور ہم عمروں کی ہم مذاقی سے بورڈنگ ہاؤس کا رنگ پیدا ہو گیا۔

تعلیم کا سلسلہ میٹرک سے منقطع ہو چکا تھا کالج میں داخلے اور ہوسٹل میں قیام کا شوق رہا مگر عسرت کے باعث

حسرت ہی رہی، ساتھ کے پڑھے ہوئے کالجوں میں پڑھتے اور ہوسٹلوں میں رہتے تھے اُن سے ملاقات ہوتی تو گئی رات تک محفلیں جمتیں، خوش گپیاں ہوتیں، شعر و شاعری کا چرچا رہتا، الھڑ پنے کی باتیں چلتیں، لطیفے اُڑتے غرض ایک نشہ سا چھایا رہتا کسی قدر یہی نقشہ اس وقت سامنے تھا۔

مَیں خلقتاً جذباتی تھا والدین کی بے سرو سامانی پر جی میں کڑھتا اور حسرتوں کا ماتم کر کے سوچا کرتا کہ میرے ہم جماعت کتنے خوش قسمت ہیں جنہیں کالج اور ہوسٹل کی زندگی میسر ہے۔ اب یہ گھر ملا تو لحظہ بھر کے لئے دماغ میں خیال سا نقش ہو گیا جیسے کالج میں داخلہ مل گیا ہو اور مَیں ہوسٹل میں چلا آیا ہوں۔

میرے دل پر ایسا کوئی بوجھ نہ تھا کہ جیل میں ہُوں یا میری آزادی سلب ہو گئی ہے —— تمام ساتھی اِدھر اُدھر اُڑے پھر رہے تھے ان میں ایک دھان پان فضل الٰہی اختر بھی تھا جس کے ملیح رنگ پر بعض بے قابو طبیعتیں مٹی جا رہی تھیں، مجھ پر ایسی صورتوں کا ایک ہی اثر ہوتا ہے کہ حافظہ میں غزل کے اشعار کھُلنے اور بکھرنے لگتے ہیں کئی تصویریں گھومتی رہیں۔

جمعدار نے گنتی بند کرنے کا اعلان کیا تو سب اپنی اپنی چکّی ۱۱ x ۷ میں چلے گئے۔ سلاخوں کے دروازے، لوہے کا کھٹکا، دیوار کا آہنی آویزا اور آویزے میں دو تالے —— قبر سے دوگنی کوٹھڑی، پائنتی کی طرف پانی کی جھجر، ایک کونے میں بول براز کا برتن، تھڑے پر مُنج کی چٹائی، ایک کمبل، ایک چادر، ایک پرنا یہی اوڑھنا یہی بچھونا —— جولائی کا مہینہ گرمی کے دن مچھر حاضر ہوا غائب گھپ اندھیرا، باہر اچھرہ روڈ پر تانگوں کے پہیوں کی چیخیں —— گھوڑوں کی ٹاپیں لاریوں کا غُل موٹروں کا شور —— راہگیروں کی اِکا دُکا آوازیں، فلم کے بول، گیتوں کی ٹوٹی ہوئی دُھنیں، اور آوارہ مصرعوں پر لے کا غلاف —— معاً جگنو کی روشنی سے خیالوں کا بتکدہ جگمگا اُٹھا یکایک ماضی کے نگارخانے میں رونق سی پیدا ہو گئی۔ کتنے ہی خوبصورت چہرے، مکروہ صورتیں، خوشنما منظر، بھیانک خواب، دلآویز یادیں اور مہیب محفلیں حافظہ میں اُبھر آئیں اور مَیں اکیلا اکیلا ایک دوسری دنیا میں پہنچ گیا جہاں کوئی سا بندھن نہ تھا

کسی موڑ پر بھی رُکا نہیں، چلتا ہی رہا خیالوں کا سفر' ایک ایک تصویر دیکھتا اور اُس پر کچھ نہ کچھ سوچتا چلا جا رہا تھا کبھی آنکھیں کھول لیتا کبھی بند کر دیتا غرض ایک آدھ گھنٹے میں مرحوم ماضی کا پورا عہد حافظے اور نگاہ سے نکل گیا۔

ہاتھ کی لکیریں

دوسال پہلے میٹرک کے طلبہ رخصت ہو رہے تھے تو السنۂ شرقیہ کے اُستاد مولوی نیاز محمدؒ نے پانچ چھ شاگردوں کا ہاتھ دیکھا جو ذہانت کی وجہ سے انہیں بے حد عزیز تھے۔ میرا ہاتھ دیکھتے ہی کانپ اُٹھے فرمایا دوسروں کے ہاتھ تو صاف ہیں ان کی زندگی میں ایسی کوئی اُفتاد یا الجھاؤ نہیں تمام لکیریں واضح ہیں۔ مگر تم —— (ذرا آزردہ ہوکر) اس کے بعد نہ مزید تعلیم پا سکو گے اور نہ مدۃ العمر سکون حاصل ہوگا۔ تیس بتیس سال کی عمر تک تمہاری زندگی میں قید و بند کے شدائد معلوم ہوتے ہیں۔ تمہارے ہاتھ میں واضح طور پر قید و بند کی لکیریں موجود ہیں باقی اللہ تعالیٰ علاّم الغیوب ہیں جو کچھ مَیں دیکھ رہا ہوں وہ یہی ہے ہاتھ کی لکیریں بدلتی بھی رہتی ہیں۔ ممکن ہے عمر کے کسی حصّے میں بدل جائیں مگر اس وقت جو نشان اُبھر رہے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ بتیس برس سے پہلے تمہیں کسی طرح بھی سکون نہ ملے گا۔ البتّہ اس کے بعد تمہاری زندگی اپنا راستہ پیدا کرلے گی اور تم قومی زندگی کے کسی حصّے میں چمکنے لگو گے۔

میں ایک لحظہ کے لئے اِس "پیش گوئی" سے خوف زدہ ضرور ہوا مگر عام باتوں کی طرح یہ بات بھی ذہن سے نکل گئی مجھے موروثی عقائد کی پختگی پر یقین تھا میں ہاتھ کی لکیروں، نجوم کے معموں، جعفر کی پہیلیوں، تعویذوں کے نخروں اور ستاروں کی گردشوں کا کبھی قائل نہ تھا بلکہ عام اصطلاح کے مطابق "وہابی" تھا۔ مَیں سمجھتا تھا مجھ میں کوئی عیب نہیں اور حیل علیتوں کے لئے ہے۔ مَیں ایک سیدھا سادا نوجوان تھا میں نے کبھی تصویر تک نہ کھنچوائی تھی۔ طلبہ رخصت ہو رہے تھے تو مَیں نے مذہباً گروپ فوٹو میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا عام لڑکوں کی طرح مجھ میں شوخی اور شرارت تھی ہی نہیں، ساتھی طلبہ مجھے کنواری لڑکی کہہ کر چھیڑا کرتے تھے ——

البتّہ تعلیم چھُٹ جانے کے بعد میرا شاعرانہ ذوق تیز ہوتا رہا حالات ناموافق تھے تنگدستی کا زمانہ تھا، آسودگی نے آنکھیں پھیر لی تھیں روزگار کے دروازے پر تالہ لگا ہوا تھا دل آخر دل تھا دفعتہً اس پر ایک

چوٹ پڑی شاعری کے راستے خود بخود صاف ہو گئے جو شعر سمجھ میں نہیں آرہے تھے اب محسوس ہو رہا تھا کہ میرے ہی لئے کہے گئے ہیں اور ان کا جو مطلب مَیں سمجھتا ہوں وہ شاید ہی کوئی دوسرا سمجھتا ہو خود شاعر کو بھی اس کا علم نہ ہوگا—— عمر کا یہی دور تھا۔ جب اختر شیرانی کی شاعری سے میرا لگاؤ بڑھا وہ جو کچھ کہہ چکے یا کہہ رہے تھے معلوم ہوتا تھا کہ میری ہی تصویریں بنا رہے ہیں لیکن نظروں کا یہ رشتہ بعجلت تمام ہو گیا اب جو قید ہوا تو ہاتھ کی لکیریں مولانا نیاز محمدؐ کی پیش گوئی کے مطابق اُبھرنے لگیں گویا ایک اور شورش کاشمیری پیدا ہو رہا تھا۔

اُس رات نے مجھے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا دیا جن چیزوں کا تصور مشکل تھا یا کبھی خواب میں متشکل ہونا محال تھا اب کِر کِر کے سامنے آرہی تھیں —— مَیں واقعتہً ایک نیا سفر اختیار کر چکا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ مَیں والد اور ان کے دو چار دوستوں کی معیت میں جیل روڈ سے گزر رہا تھا تو "بیرونی پنجہ" کے خوفناک قیدیوں کی صورتیں دیکھ کر سہم گیا تھا تب ایک قیدی کا مطلب تھا قاتل۔ ڈاکو۔ خونی اور چور —— اب مَیں خود ایک قیدی تھا اور اس دنیا میں کوئی سا خوف محسوس نہ ہو رہا تھا۔ قیدی پہریدار لالٹین لئے پھیرے لگا رہا تھا۔ وہ دروازے پر رُکا تو مَیں اُٹھ کھڑا ہوا نیند غائب تھی مرحوم دنوں کا تصور بندھا ہوا تھا جو یکایک ٹوٹ گیا اُس نے مسکرا کر پوچھا ——

تام ؟

نام بتایا —— کہنے لگا آج دن بھر شہر میں گولی چلتی رہی ہے ایک بڑا جلوس شہید گنج کی طرف جا رہا تھا حکومت سے تصادم ہو گیا بہت سے لوگ مارے گئے کئیوں کے سر پھٹے پولیس اور فوج کے نوجوان بھی زخمی ہوئے ہیں کئی سو نوجوانوں کو گرفتار کر کے یہاں لایا گیا ہے جو اسی جیل کے پہلے احاطہ میں ہیں اور نصف کے لگ بھگ زخمی ہیں ، سینکڑوں افراد سنٹرل جیل میں بھی بھجوائے گئے ہیں !

"انہیں ہمارے ساتھ کیوں نہیں رکھا گیا"؟ میں نے پوچھا "نوآمد قیدیوں کو ہفتہ عشرہ الگ ہی رکھتے ہیں چونکہ ان کی حالت خراب ہے انہیں اس لئے بھی آپ کے ساتھ نہیں رکھا ہے۔" اُس نے جواب دیا۔

گولی چلنے کی اس خبر سے مجھے سخت صدمہ پہنچا۔ قیدی نمبردار اس سے زیادہ خبر دے سکا نہ رُکا۔ اُدھر سے گھڑی گشت ہیڈ وارڈر آ رہا تھا چونکہ قیدی عہدیداروں کو عام قیدیوں سے گپ لڑانے کی اجازت نہیں ہوتی لہذا اس کو دیکھتے ہی کھسک گیا۔ میں آدھ گھنٹہ تک پریشانی کے عالم میں ٹہلتا رہا پھر لیٹ گیا۔ میرا دماغ صاف طور پر گولیوں کی آوازیں سُن رہا تھا۔ کئی خیالی تصویریں آتی جاتی رہیں پولیس کے بہیمانہ تشدد کا اندازہ مجھے بہت پہلے سے تھا اب گولی چلنے کی خبر نے مجھے اس طرح ہلا ڈالا جیسے بھونچال کے پہلے جھٹکے ہی میں کوئی بڑی عمارت زمین پر آ رہی ہو اور منوں مٹی تلے انسانوں کی چیخیں دب گئی ہوں۔

پار کا میلہ

پولیس کیا ہے؟ اس کے تشدد کا اندازہ یا احساس پہلے پہل مجھے دس گیارہ برس کی عمر میں ہوا تھا لاہور کے مقامی میلوں میں ایک پار کا میلہ ہے جو ہر سال جون میں جہانگیر کے مقبرہ میں لگتا ہے برسوں سے یہ میلہ پُر رونق نہیں رہا اور نہ وہ پرانے لوگ ہی رہ گئے ہیں بیس پچیس سال پہلے یہ میلہ بڑے ٹھاٹھ سے ہوتا تھا امرتسر اور لاہور کبھی ایک دوسرے کے ہم زلف شہر تھے۔ ہزاروں امرتسری شریک ہوتے سپیشل ٹرینیں چلتیں، سالم دو روز ہنگامہ رہتا ہفتہ کی رات لوگ مقبرے میں گزارتے چھولداریاں لگائی جاتیں، احباب کی بیسیوں ٹولیاں رات بھر جشن مناتیں، گانے بجانے کی محفلیں لگتیں، کھانے پکتے، مجرے ہوتے، دور چلتے، غرض خوش نکروں کا ایک نگر آباد ہوتا۔ ۱۹۲۷ء میں والد بھی اپنے دوستوں کے ساتھ اس میلے میں گئے انہوں نے بھی مقبرے کے عقبی حصہ میں ایک کیمپ لگا رکھا تھا۔ صبح "جنگل بیٹھنے" کے لئے نکلے تو دیر تک واپس نہ آئے دوستوں کو تشویش ہوئی تھوڑی دیر بعد والد کے ایک دوست انہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے خبر لائے کہ پولیس نے پکڑ رکھا ہے؛

پتہ چلا کہ پچھلی رات دو لڑکوں کو دو گوروں نے چھیڑا تھا کچھ نوجوانوں نے تاؤ کھا کر "آصف جاہ" کے مقبرہ میں ان گوروں کو پیٹ ڈالا۔ اب جو بھی ادھر سے گزرتا ہے پولیس اُسکی مرمت شروع کر دیتی ہے ـــــ اس زمانے میں کالوں کا گوروں کو پیٹنا سب سے بڑا جرم تھا۔ پولیس کی کئی گاردوں نے مقبرے کے صدر دروازہ کا محاصرہ کر لیا جو شخص نظر پڑا پکڑ لیا جس کی مونچھیں اونچی دیکھیں دھر لیا جس کا بدن کسرتی نظر آیا دبا لیا۔ جس نے آبرو بچا کر نکلنا چاہا اس کو جا لیا۔ جس نے آنکھیں جھکا کر راستہ لیا اس کو بٹھا لیا پولیس کی مار پٹائی کا غوغا مچ گیا بیسیوں کو پکڑ کر حجروں کی چھت پر لے گئے کنسٹیبلوں سے پٹوایا میں نے والد کی گرفتاری کا سُنا تو رونے لگا ہر شخص گرفتاری کے خوف سے ادھر کا رخ کرتے ہوئے گھبراتا اور ڈرتا تھا دو گوروں کی پٹائی نے پورا میلہ برباد کر ڈالا۔ اتنے میں میرے دادا اپنے دوستوں کے ساتھ آنکلے مجھے اس حال میں دیکھا تو پریشان ہوئے ان کے ایک چچیرے بھائی لوہاری دروازہ کی پولیس چوکی میں تھانیدار تھے وہ تگ و دو سے چھڑا لائے۔ والد نے اپنے بدن پر پولیس کے ڈنڈوں کی ضربیں دکھائیں بالخصوص چوتڑوں پر ایک گہرا زخم جس سے خون رس رہا تھا تو دادی اماں نے بددعا کے ہاتھ اٹھائے کوسنے دینے لگیں والد مسکراتے رہے۔ اماں! مجھ سے تو نرم برتاؤ کیا ہے دوسروں کو اس بُری طرح پیٹا ہے کہ ان کے بدن کا ایک ایک ٹانکہ اُدھڑ گیا ہے ـــــ دو گوروں کے لئے کوئی ایک سو آدمیوں کو پیٹا گیا ہے۔

دادی اماں نے پوچھا ـــــ مارنے والے گورے تھے!

• نہیں اماں ـــــ تین تھانیدار تھے ـــــ ایک پنڈت۔ ایک گیانی ایک سیّد اور اُن کے ہمراہ کنسٹیبلوں کا خونخوار دستہ وہ ایک دوسرے سے بازی بدکر پیٹتے تھے ـــــ کئی دنوں تک والد سو نہ سکے۔ وہ بڑے ہی صابر تھے زخموں کے باوجود کراہے نہیں چُپ چاپ پڑے رہتے لیکن اس واقعہ سے گھر بھر میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا ایک شدید جذبہ ہمیشہ کے لئے مستحکم ہو گیا۔

اب کئی سال بعد قید تنہائی میں پڑا پڑا گمشدہ واقعات پر غور کر رہا تھا تو سب سے پہلے یہی واقعہ

حافظہ کی لوح پر اُبھرا۔ اسی واقعہ نے میرے دل میں برطانوی ملوکیت کے خلاف جدوجہد کا بیج بویا تھا جو آب و ہوا کی مختلف ٹھکھیڑیں اُٹھا کر ایک تن آور درخت ہو گیا۔

پہلی جسارت

دوسرا واقعہ طالب علمی کے زمانے کا ہے دادا کچھ دنوں کے لئے مجھے امرتسر سے لاہور لے آئے یہاں مَیں پانچویں یا چھٹی میں پڑھتا تھا کہ تمام ملک میں سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کا چرچا ہو رہا تھا کمیشن لاہور پہنچا تو یہاں بھی زبردست احتجاجی مظاہرہ کیا گیا ریلوے اسٹیشن سے باہر چاروں طرف سڑکوں کے نکڑ پر مسلح پولیس کے دستے کھڑے تھے۔ اِدھر لنڈا بازار، برانڈرتھ روڈ اور میکلوڈ روڈ کے سرے پر تاروں کا باڑھ باندھا گیا۔

لالہ لاجپت رائے مولانا ظفر علی خاںؒ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ چودھری افضل حقؒ ڈاکٹر ستیہ پال وغیرہ کے زیر قیادت ایک عظیم الشان احتجاجی جلوس نکلا جو ریلوے اسٹیشن سے باہر مظاہرہ کرتا رہا جونہی کمیشن کے ارکان پلیٹ فارم سے باہر نکلے مظاہرین بے قابو ہو گئے گھڑسوار پولیس نے مسٹر سکاٹ سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کی معیت میں زبردست لاٹھی چارج کیا لالہ لاجپت رائے کے سینہ پر سخت زخم آئے وہ چوٹ کھا کر گر پڑے —— اسی رات موری دروازہ کے باہر ایک بہت بڑا جلسہ ہوا جس میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے لوگوں پر جادو کر دیا لالہ لاجپت رائے نے بڑے ہی آزردہ لہجہ میں تقریر کی انہوں نے کہا —— "میرے بچو! مَیں اپنی عزت کا بدلہ چاہتا ہوں لاجپت رائے کے سینے پر جو لاٹھیاں پڑی ہیں وہ برطانیہ کے تابوت میں آخری میخ ہو جائیں۔ نوکر شاہی نے لاٹھیاں برسا کر بھارت ماتا کی توہین کی ہے آج کے بعد لاجپت رائے شاید زندہ نہ رہے لیکن بھارت ماتا کی عزت اور میرے بڑھاپے کی ہتک کا بدلہ لینا تمہاری جوان ہمتوں کا فرض ہے جاؤ آج مَیں تمہیں اس انتقام کی دعوت دیتا ہوں۔ میرے بچو! مَیں تمہیں آخری پرنام کرتا ہوں آشیرواد دیتا ہوں ہندوستان تمہارے حوصلوں اور تمہارے ولولوں کا راستہ دیکھ رہا ہے"۔

چند دنوں بعد لاجپت رائے سورگباش ہو گئے ان کی موت سے پورا ملک ہل گیا اس روز لاہور کے تقریباً تمام اسکول کالج اور تعلیمی ادارے بند ہو گئے لیکن دیو سماج کے منتظمین نے اسکول بند کرنے سے انکار کر دیا وجوہ یہ تھے کہ

۱۔ دیو سماج اور آریہ سماج کے مسلک و مشرب میں بعد المشرقین تھا۔ لاجپت رائے آریہ سماج کے لیڈر تھے۔

۲۔ دیو سماجی سیاسیات سے کنارہ کش رہتے اور اپنے اداروں کو "سیاسی آلودگیوں" سے صاف رکھنا چاہتے تھے۔

۳۔ دیو سماج اسکول کے طلبہ میں آریہ سماجی نہ ہونے کے برابر تھے۔ مسلمان طلبہ اکثریت میں تھے۔ مسلمانوں کے بعد دوسرے درجہ پر سناتن دھرمی طلبہ تھے۔

جانکی داس نام کے ایک صاحب دیو سماج کے سیکرٹری تھے ایک پاؤں کٹا ہوا تھا بیساکھی لیکر چلتے آریہ سماج سے انہیں سخت اختلاف تھا انہوں نے ہندو طلبہ کی درخواست کو سختی سے مسترد کر دیا ان طلبہ کا لیڈر رام کشن میرے پاس آیا ہم دو چار مسلمان طالب علم ان دنوں سکول میں نمایاں تھے —— رام کشن نے کہا لاجپت رائے ملک کے بہت بڑے لیڈر تھے برطانی سرکار کے تشدد سے ان کا دیہانت ہوا ہے ملک بھر میں ان کا سوگ منایا جا رہا ہے لاہور کے سبھی سکول بند ہو گئے ہیں لیکن جانکی داس نہیں مانتے۔ آپ ہمارا ساتھ دیں ممکن ہے اس طرح وہ مان جائیں یا پھر ہم احتجاجاً خود بخود چھٹی کر دیں میں تیار ہو گیا چنانچہ ایک وفد بنا کر ہیڈ ماسٹر کی خدمت میں حاضر ہوئے پنڈت رام نارائن ہیڈ ماسٹر تھے بانیٔ دیو سماج کے داماد اور کٹر ناستک لیکن انتہائی شریف نیک اور بے آزار انہوں نے عذر کیا کہ سیکرٹری نہیں مانتا ہم ان سے اجازت لے کر سیکرٹری کے پاس چلے گئے —— جانکی داس ہوا کے گھوڑے پر سوار تھا الٹا ڈانٹنے لگا ٹکا سا جواب پا کر ہم تو کھڑے کھڑے میٹنگ کی اور طے کیا کہ احتجاجاً کلاسوں سے نکل آنا چاہیئے ہیڈ ماسٹر کے نام سے اس مضمون کا ایک نوٹس تمام

کلاسوں میں بھجوادیا کہ ابھی گھنٹی بجنے پر اسکول لالہ لاجپت رائے کی موت کے باعث بند کیا جا رہا ہے جب یہ نوٹس تمام کلاسوں میں پھرایا جاچکا تو میں نے آگے بڑھ کر چھٹی کی لمبی گھنٹی بجادی طلبہ باہر آگئے سیکرٹری اور ہیڈ ماسٹر گھبرا کر اپنے دفتر سے نکل آئے اساتذہ کو طلبہ کے پیچھے بھجوایا پکارتے رہے کہ نوٹس اور گھنٹہ دونو فرضی ہیں مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا البتہ سکول سے نکال دینے کی دھمکی کسی قدر کارگر ہوگئی۔ طلبہ کا بڑا حصہ واپس آگیا خود رام کشن لوٹ آیا مجھے مولوی نیاز محمدؐ نے بہتیرا سمجھایا مگر میں طرح دے کر نکل گیا اگلے روز شامت آگئی تمام طلبا، کو ہال میں اکٹھا کیا گیا لالہ جانکی داس نے سخت ناراضی کا اظہار کیا ہیڈ ماسٹر موجود نہیں تھے۔ سکینڈ ماسٹر نے اس سارے قضیئہ کا سرغنہ مجھے قرار دیا۔ ہاتھ پر دس بید لگائے اور پانچ روپیہ جرمانہ کیا البتہ اسکول سے نہیں نکالا ایک تو میں کلاس میں ذہین طالب علم تھا دوسرے مولوی نیاز محمد مجھ پر بیحد مہربان تھے وہ مجھے عام طلبہ سے کچھ زیادہ ہی عزیز رکھتے تھے۔ جانکی داس کو پتہ چل گیا تھا کہ سٹرائیک کا اصل محرک کون تھا اس نے کس طرح دغا کی ہیں نے تو فی الجملہ اپنے قول کی لاج رکھی تھی اس عمر میں لاجپت رائے کی موت کا مطلب صرف چھٹی تھا۔

تھوڑے دنوں بعد لاجپت رائے کی موت کا بدلہ چکا لیا گیا بھگت سنگھ اور اُن کے انقلابی ساتھی مسٹر سکاٹ کی تلاش میں تھے کہ سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے دفتر کا ایک سارجنٹ سانڈرس ان کی گولیوں کا نشانہ بن گیا بھگت سنگھ اور ساتھی فائر کر کے بھاگم بھاگ ڈی اے وی کالج میں گھس گئے جو سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس کے دفتر کے عین سامنے تھا کمپاؤنڈ سے آیور ویدک کالج کو نکلے اس کے عقبی حصہ سے دیو سماج اسکول کی گراؤنڈ تک پہنچے وہاں سے سیکرٹریٹ کی پُشت کے ساتھ ساتھ چو بُرجی کی طرف نکل گئے بھگت سنگھ بھاگتا دوڑتا سن سے نکل گیا میں اُس وقت سکول کی گراؤنڈ میں کھیل رہا تھا گھر لوٹتے ہوئے اخباری ضمیموں سے پتہ چلا کہ سانڈرس قتل کر دیا گیا اور اِس حلیہ کے نوجوان فائر کر کے غائب ہو گئے ہیں۔

بال بھارت سبھا

۱۹۳۰ء میں مہاتما گاندھی نے نمکین ستیہ گرہ شروع کیا۔ تو ان کے ڈانڈی مارچ نے ہندوستان بھر میں تہلکہ مچا دیا ــــ ان کی گرفتاری سے ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا عام ہڑتال ہو گئی لاہور میں اس روز بڑا معرکہ ہوا، کالج اور اسکول بند ہو گئے طلبہ کی ٹولیوں نے کوچوانوں پر دباؤ ڈال کر تانگے کھلوا دیئے ایک آدھ جگہ مزاحمت ہوئی۔ عام مسلمان کھلے دل سے کانگرس میں شریک نہ تھے لیکن ان کے دل میں کانگرس کے خلاف کوئی جذبہ ناراضی بھی نہ تھا۔ اس ہڑتال میں انہوں نے بھی حصّہ لیا ــــ میں ہڑتال دیکھتا دکھاتا ریلوے اسٹیشن کی طرف آ نکلا۔ میکلوڈ روڈ پر ریلوے پولیس لائن کے عین سامنے بہت سے طلبہ نے ایک تانگہ گھیر رکھا تھا اور کوچوان سے گھوڑا کھول دینے کا تقاضا کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک چھتہ دار ہیڈ کانسٹیبل موٹا سا ڈنڈا لئے بیرک سے نکلا اور ان طلبہ کو بے تحاشا پیٹنے لگا عام طلبہ بھاگ گئے مگر ایک خوش رو لڑکا ڈٹا رہا اُس نے بڑی ہمت سے ڈنڈے کھائے، گرا، اُٹھا، پھر گرا، پھر اُٹھا، حتیٰ کہ اُس کے سر سے خون بہنے لگا میرے اندر ایک تحریک سی پیدا ہو گئی میں نے دوڑ کر ڈنڈا چھین لیا لیکن ظالم نے میرے بائیں گال پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ میں بلبلا اُٹھا، اور پٹائی ہوتی مگر سامنے ہی پولیس کے بنگلے سے ایک گورہ سارجنٹ پھرتی سے نکلا، اور ہیڈ کانسٹیبل سے ڈنڈا چھین لیا اُسے سخت سست کہا اب سڑک پر ہم دو نو رہ گئے لیکن دونو ایک دوسرے سے اجنبی، اس کے بدن پر کافی چوٹیں آئی تھیں اور پیشانی کے بائیں طرف ایک زخم سا بن گیا تھا میرا بایاں گال سوج گیا دانتوں میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا نکسیر پھوٹی اور قمیص پر لہو کی دھاریاں بن گئیں ــــ اس طرح ہم ایک دوسرے سے متعارف ہو گئے۔ اُسے یہ جان کر کسی قدر حیرت ہوئی کہ میں مسلمان ہوں، وہ ڈی اے وی ہائی اسکول لاہور میں نویں جماعت کا طالب علم تھا نام ادم پرکاش تھا اور باپ کا نام دولت رام۔ دولت رام انارکلی میں شراب کا ٹھیکیدار تھا انسان زندگی میں بہت سے خوبصورت چہرے

دیکھتا ہے لیکن ادم واقعی لچھن و رام کا عکس تھا حسنِ اتفاق نے ہمیں اکٹھا کر دیا۔ اُس نے اور میں نے بنگالی محلہ کے باہر تھڑے پر بیٹھ کر بال بھارت سبھا کی بنیاد رکھی تموری دروازے کے باہر باغ میں ایک کیمپ لگایا وہ صدر بنا میں سیکرٹری، آگے چل کر یہ نقشہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔

اُوم خوش آواز تھا عموماً جلسوں میں نظمیں پڑھتا اور سراہا جاتا کبھی کبھار تقریر بھی کر لیتا —— تقریریں رسمی ہوتیں انگریز ظالم ہیں، بدیسی راج ختم کر دو ہم سوراج چاہتے ہیں کھدر پہنو مہاتما گاندھی کی جے وغیرہ اس کی چمڑی میں ذرہ بھر خوف نہ تھا لوگ اس کو آشیرواد دیتے، وہ دنوں ہی میں بچوں کا لیڈر ہو گیا۔

اِدھر دو چار روز میں کانگرس کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا نوجوان بھارت سبھا پر بھی یہی بیتی بڑے بڑے لیڈر ہزارہا بندگان خدا کو ساتھ لے کر جیل چلے گئے، بال بھارت سبھا کا کیمپ ہفتہ عشرہ ہی میں پُر رونق ہو گیا بچوں کی ایک ڈار جمع ہو گئی لنگر کھل گیا لوگوں نے اس خوش دلی سے دان دیا کہ عطیات کا سنبھالنا مشکل ہو گیا، گھی، دودھ، دہی، چاول، آٹا، سبزی، پھل، روپے صبح و شام مِن کی طرح برستے تھے اس مِن ہی سے کئی مہاشے جو بچوں کے کسٹوڈین ہو کر آ براجے تھے خوردہ فروش سے تھوک فروش ہو گئے —— کیمپ وسیع ہوتا گیا مسلمان ہم تین ہی تھے مَیں نذیر اور شہاب دین۔ نذیر کے والد مزاجاً کانگرسی تھے مَیں صورتحال کی بدولت انقلابی ہو گیا، شہاب دین کیمپ سے قریب ہی گنپت روڈ پر رہتا تھا، بے پڑھا ہونے کے باوجود پنجابی میں شعر کہہ لیتا اور خوش آواز تھا اس کا بڑا بھائی چھتیں بنانے کی دکان کرتا، دونو خاکروب سے مسلمان ہوئے تھے پنجاب میں انہیں مُسلّی کہتے ہیں، یہ ایک ایسے صاحب کے کرایہ دار تھے جو ذی حیثیت بھی تھا اور پولیس کا معزز و معتمد بھی، غریبوں کا محلہ تھا اور وہ تمام لوگ اسکی میراث تھے۔ یہ شام ہوتے ہی اپنی چارپائی بازار کے نکڑ پر بچھا کر بیٹھ جاتا دو چار حواری جمع ہوتے گپیں لڑائی جاتیں، جھوٹ چلتا، گالیاں بکتے، اور جو لوگ قید ہو رہے تھے اُن پر تبرّے تولے جاتے، ان صاحب نے شہاب الدین کو چھتوں کی

دوکان سے اُٹھایا اور سرکاری ایما پر بال بھارت سبھا میں بھیج دیا۔ شہاب الدین نے مخبری شروع کی۔ نفس کی غذا چنتا رہا اور کئی بچوں کو آوارہ کیا —— جب بال بھارت سبھا کا شیرازہ بکھر گیا اور شہاب الدین کی قلعی کھل گئی تو اُن "بزرگ" نے اسے سالار بنا کر مسلمان نوجوانوں کا ایک جیش تیار کیا جس میں تقریباً سبھی چنگڑ یا مسلّی تھے اور اس جیش کا یہ کام تھا کہ جہاں ہندو طلبہ یا ہندو لڑکیاں پکٹنگ کریں وہاں یہ لوگ پولیس کے امدادی ہوتے یا پھر شہاب الدین کے ساتھ اس قسم کے ننگے گیت گاتے پھرتے، کہ شریف لوگ کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لیتے، ان گیتوں کا ڈھکا چھپا مطلب یہ تھا کہ حیا فروش لڑکیاں اور خود فروش لڑکے، کھدر پہن کر انقلاب مانگ رہے ہیں —— یہ اُس زمانہ کا ذکر ہے جب مسلمانوں کی اپنی کسی تحریک کا نام و نشان تک نہ تھا اور پشتینی وفادار انہیں اس طرح استعمال کرتے تھے ——

ایک روز پو پھٹنے سے کچھ ہی پہلے اوم اور نذیر میرے ہاں پہنچے، مَیں گھر کے صحن میں سو رہا تھا میرے بالوں کو شانہ کرتے ہوئے نذیر نے جھنجھوڑا۔

اُٹھ جاگ وطن دیا شیرا گھر لُٹیا فرنگیاں تیرا

(وطن کے شیر اُٹھ فرنگیوں نے تیرا گھر لوٹ لیا ہے)

مَیں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا معلوم ہوا کہ رات دو اڑھائی بجے نتھو رام سٹی مجسٹریٹ نے سارا کیمپ اُٹھوا لیا ہے، پولیس ہر چیز اُٹھا کر لے گئی ہے تنبو، قناتیں، چھولداریاں، سامان خور و نوش، جھنڈے وغیرہ غرض ایک سپاٹ میدان رہ گیا ہے رضا کاروں نے مزاحمت کی پولیس نے گرفتار کر لیا ایک روز پہلے کیمپ اُٹھانے کا نوٹس ملا تھا اور مَیں نے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے اس پر دستخط کئے تھے نتیجہ متوقع تھا ——

اِدھر موقع پر سینکڑوں طلبہ جمع تھے، دوبارہ کیمپ لگانے کا اعلان کیا، چھوٹی چھوٹی ٹولیاں بنا دیں جو اِدھر اُدھر نکل گئیں شام تک تین چار ہزار روپیہ جمع ہو گیا ہندو خواتین نے گھی، چاول، آٹا، مٹھائی کے ڈھیر لگا دیئے، سورج غروب ہونے سے پہلے ایک میلہ سا لگ گیا تنبو قناتیں چھولداریاں اُسی طرح نصب ہو گئیں

غرض ایک آشرم سا بن گیا ــــ پہلے کی بہ نسبت رضا کاروں کا پہرہ بھی مضبوط کر دیا گیا۔

نتھو رام کنسٹیبل سے ترقی کر کے سٹی مجسٹریٹ کے عہدہ تک پہنچا تھا شروع شروع میں اُس نے سکھوں کے مورچے پر ستم توڑے تھے۔ وہاں سے اُسکی ترقی کا راستہ کھُلا اور یہاں تک پہنچا اب سٹی مجسٹریٹ کی حیثیت سے اُس نے کانگرس کی مقامی تحریک کو کچلنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ عورتوں بچوں نوجوانوں کے مختلف مظاہروں پر لاٹھی چارج کرانا اُس کا معمول ہو گیا تھا لاہور تھا کہ "نتھو رام ہائے ہائے"، "ٹوڈی بچہ ہائے ہائے" کے نعروں سے گونج رہا تھا اور یہ گویا لاہور والوں کا روزمرہ یا محاورہ ہو گیا تھا جس روز کیمپ لُٹا ہزاروں خواتین نے کچہری کے باہر نتھو رام کا سیاپا کیا لیکن نتھو رام بڑا ہی بُردبار اور وفادار تھا وہ انگریزوں کے لئے جان دے سکتا تھا مگر اُن کے خلاف نعرہ سننے کے لئے تیار نہ تھا اپنے خلاف گالیوں کی بوچھاڑ میں بھی ہنستا رہا لڑکیاں سیاپا کر رہی تھیں لڑکے گالیاں اُڑا رہے تھے، مگر وہ سب کچھ ہضم کرنے کا عادی ہو گیا تھا اگلے روز بھی ٹھیک اپنے وقت پر پولیس کی جمعیت لے کر اُس نے چھاپہ مارا، کیمپ اکھاڑ پھینکا، جن رضا کاروں نے مداخلت کی انہیں بُری طرح پیٹا بلکہ بعض خوش رُو لڑکوں کے گالوں کو سپاہیوں نے اس زور سے کاٹا کہ گڑھے پڑ گئے، چاروں طرف اندھیرا سپاہی لوٹ رہے تھے اور کیمپ لُٹ رہا تھا ــــ اس روز بھی پو پھٹنے سے پہلے پہلے سبھی کچھ لے گئے، بال بھارت سبھا خلاف قانون قرار دے دی گئی صبح ہوئی تو مظاہرے شروع ہو گئے پولیس اوم کے تعاقب میں تھی اُسکو جلوس ہی میں گرفتار کر لیا گیا۔

مَیں کنور سین اور جیا لال کے گھر میں بیٹھے سوچ رہے تھے کہ اب کیا کرنا چاہیئے؟ تجربہ نہ تھا نہیں، نتھو رام کو تہدیدی خط لکھنے شروع کئے اوم پرکاش کے متعلق معلوم نہ ہو سکا کہ پولیس کہاں لے گئی ہے اُس کے والدین بھی سخت پریشان تھے اگلے ہی دن یا ایک دو روز کے وقفہ سے اُوم میرے پاس آیا اور گھر

سے اُٹھا کر مجھے باہر لے گیا اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا گالوں پر دانت کاٹے کے بہت سے نشان تھے ہونٹوں پر بھی بیسیوں زخم تھے۔

اوم پرکاش

ہم دونوں ایس پی ایس کے ہال کے عقبی باغیچہ میں چلے گئے اور وہاں درختوں کے ایک تخلیہ میں ہو گئے اوم نے میرے زانو پر اپنا سر رکھ دیا دل اُس کا نڈھال ہو رہا تھا کہنے لگا معلوم نہ تھا کہ پولیس اتنی ذلیل ہوتی ہے؟ اپنی لرزہ خیز سرگذشت شروع کی تو اُسکی غزالیں آنکھوں سے آنسوؤں کی پھوار بہہ گئی۔ سولہ برس کا ایک خوبصورت کھلونا جس کا شیشہ چکنا چور ہو گیا تھا۔ کرشن کی بانسری کے سُروں سے اُس کا پیکر بنا تھا لیکن آج یہ سُر ٹوٹ گئے تھے اُس نے اپنا پاجامہ دکھایا جو خون سے لتھڑا ہوا تھا پھر اُس نے کہا تم میرے بھائی ہو میں تم سے چھپانا نہیں چاہتا یہ دیکھو مقعد پر زخم ہی زخم ہیں پہلا شکاری کوتوال تھا پھر ایک درجن اوباش جو رات بھر میرے مُنہ اور مقعد کو گرہ لگاتے رہے جب ان کی ہمتیں تھک گئیں تو تر نگا جلا کر اُس کی خاکستر میرے زخموں پر رکھ دی یہ کہہ کر، اُس کی آنکھوں میں بدلیاں سمٹ آئیں وہ ضبط سے باہر ہو گیا۔۔۔۔۔۔ اُس نے کہا۔۔۔۔۔۔

"بھائی ۔۔۔۔۔ میرا جی اُچاٹ ہو گیا ہے اب میں جینا نہیں چاہتا اس سے موت بھلی؟ ۔۔۔۔۔ یہ لو یہ ظلم میری آخری نشانی ہے اس واقعہ کا کسی اور سے ذکر نہیں کیا صرف تمہیں یہ کہانی سنا رہا ہوں پھر اُس نے ایک لمبی سی آہ بھری اور رُک رُک کے بولا مجھے بچہ کافر کہہ کہہ کر انہوں نے اپنے نفس کی غذا بنایا ہے"۔

اوم کی ان باتوں نے مجھے تھرا دیا میں کانپ اُٹھا خود بھی بے اختیار ہو کر رونے لگا اس سناٹے اور تخلیے میں ہم دو اناڑی رو رہے تھے پندرہ سولہ برس کی عمر ہی کیا ہوتی ہے کتنی ہی دیر تک ہم روتے

رہے آخر میں اُسے گھر چھوڑ آیا لیکن وہ ایک مرجھایا ہوا پھول تھا جسکی پنکھڑیوں کے ریشے سوکھ گئے تھے ___!

گھر لوٹا تو دادی اماں نے بتایا کہ نظام (میرے والد) کو پیسہ اخبار چوکی میں تھانیدار نے بلایا ہے میں سہم سا گیا ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ والد آ گئے ان کے ساتھ جلال الدین ملک اور علی حسن سید پولیس کا معتمد اور مخبر دونو تھے ایک ہیڈ کانسٹیبل بھی ہمراہ تھا والد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بے تحاشا پیٹنا شروع کیا۔ جوتے، گھونسے، تھپڑ، ٹھڈے، اینٹیں، روڑے، دھونکنی، چمٹا، دست پناہ، غرض آدھ گھنٹہ تک پٹائی ہوتی رہی سر پھٹ گیا چہرہ پر ضرب آگئی آنکھ زخمی ہو گئی کہنیوں پر خراشوں سے چٹاخ پڑ گئے جوڑ جوڑ دکھنے لگا پولیس کے برخوردار تماشا دیکھتے رہے بہر حال سب کا جی سیر ہو گیا جان نے امان پائی والد نے مجھے امرتسر واپس بھجوانے کا فیصلہ کر دیا۔ میں استعمار دشمنی میں اور پختہ ہو گیا ایک ناپختہ ذہن ہونے کے باوجود اب اس نظام کا ایک پختہ دشمن تھا۔

دوسرے یا تیسرے روز میں ادم کے ہاں گیا تو اس کے پتا نے بتایا کہ وہ سخت بیمار ہے اور گاؤں چلا گیا ہے کوئی ہفتہ بعد دوبارہ گیا تو اُس کی ماتا نے کہا میں گاؤں جا رہی ہوں اُس کی بہن کا خط آیا ہے کہ ادم کی حالت اچھی نہیں، چوتڑوں سے خون آتا اور منہ سے خون تھوکتا ہے، ماں کا چہرہ اشکبار ہو گیا میں امرتسر چلا گیا۔

وہاں کوئی ڈیڑھ مہینہ رہا لیکن ادم مجھے رہ رہ کر یاد آتا، ہم ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو چکے تھے کہ دل کی نظریں اُدھر ہی لگی رہتیں۔ اس پر جو بیتی، محسوس ہوتا تھا کہ مجھ پر بیت چکی ہے۔ اس کے یہ لفظ میرے کانوں میں رہ رہ کر گونج رہے تھے کہ مجھے بچہ کافر کہہ کر اس بہیمانہ سلوک کا مستحق سمجھا گیا۔

بس میں ہوتا تو میں اُڑ کے اُس کے پاس پہنچ جاتا تاہم بندشوں کو نقب لگا کر ایک روز میں لاہور آگیا اس کے پتا کی دوکان پر گیا نوکر نے کہا لالہ جی گھر میں ہیں ادم جی کا انتقال ہو گیا ہے ___ انتقال ہو گیا ہے؟ میرے دل پر جیسے کسی نے منوں مٹی رکھ دی ہو جی کڑا کر کے اس کے گھر پہنچا دیکھا ماں دھاڑیں

مارنے لگی بڑی دیر بعد آئے ہو بیٹا؛ اُوم کی تو چتا بھی ٹھنڈی ہو چکی ہے وہ تمہیں بہت یاد کرتا تھا اُکیس دن ہو گئے ہیں! میں تو گنگا جی پھول لے جا رہی ہوں؟ ساتھ چلو گے؟

آہ! میرا اکلوتا بچہ ——— ستتر دکھا گئے؟

میں اندر ہی اندر ہل گیا میں نے بدیر سویرا اپنے سارے ۔۔۔ زخم بھلا دیئے لیکن یہ زخم ہمیشہ ہی رستا رہا قید کی پہلی رات جب میں سوچ رہا تھا تو اس زخم کا گھاؤ اور بھی گہرا ہو گیا اور آج جب یہ واقعہ لکھ رہا ہوں اوم میرے سامنے کھڑا ہے اس کے زخم پھولوں کی طرح کھلے ہوئے ہیں وہ کہہ رہا ہے۔

اوم پرکاش کی کہانی لکھ کر کیا کرو گے؟ شہاب دین کی کہانی لکھو؟

شقاوت کی انتہا

ہمارے ان ساتھیوں میں ایک اور کم عمر طالب علم "راجپال" تھا صبح بنارس کی تصویر میر تقی میر کے لکھنؤ میں ہوتا تو وہ اپنے حجلۂ خیال میں اُس کی پوجا کرتے؛ پولیس نے دوسری دفعہ چھاپہ مارا تو وہ بال بھارت سبھا کیمپ میں تھا پولیس نے اندھیرے میں رضا کاروں کی کمسنی سے ذائقہ بدلا، راجپال نے ایک روایت کے مطابق سی آئی ڈی یا کار خاص کے کسی گماشتے کو گالی دی اور زناٹے کا ایک طمانچہ مارا تھا اس پر کنسٹیبل راجپال کو اٹھا کر ساتھ لے گئے رات بھر اُس سے تماشا کیا نتیجتہً وہ جان ہار ہو گیا پولیس والے لاری میں لاد کر گوالمنڈی کے پاس رتن چند کے تالاب میں پھینک گئے چوبیں گھنٹے — بعد لاش تیر کر اوپر آگئی پھول سا چہرہ توے کی طرح سیاہ ہو چکا تھا رخساروں پر دانتوں کے نشان تھے جسم اس بُری طرح بدرنگ ہو چکا تھا کہ خوف آتا تھا گلے میں کھدر کا خون آلود کُرتا اور چوتڑوں پر رسی سے ترنگا بندھا ہوا تمام شہر میں شور مچ گیا۔ جگہ جگہ اس اندھے ظلم پر احتجاج ہونے لگا ارتھی کا زبردست جلوس نکلا، پولیس نے لاٹھی چارج کیا، لوگوں سے پرچم چھین لئے پولیس کا شعار ہو گیا تھا کہ ترنگا چھین لیتی دن بھر میں جتنے پرچم جمع ہوتے انہیں اکٹھا کر کے جلایا جاتا انکی راکھ سے چلمیں بھری جاتیں اور اس طرح کوتوالی میں ان نوجوانوں کو چڑایا جاتا جو سول نافرمانی میں پکڑے جاتے۔ یہ واقعات اُس زمانے میں ہر روز ہو رہے تھے جیل خانے بھر چکے تھے کوئی ٹاواں ٹاواں آدمی جیل بھیجا جاتا ورنہ عام مظاہرین کو جلوس یا جلسے سے پکڑ کر پولیس والے کہیں دور ویرانے میں چھوڑ آتے انہیں میلوں پیدل چل کے آنا پڑتا لیکن اس تمام بہیمیت کے باوجود لوگوں کا ولولہ افسردہ نہ ہوا ایک چھوٹی سی چنگاری سے شعلے بھڑک اُٹھتے اور لوگ "انقلاب زندہ باد" "ہندوستان آزاد" اور "مہاتما گاندھی کی جے" کے نعروں سے زمین آسمان ایک کر دیتے تھے۔

شہید گنج کا محاذ

اِس رات یہ تمام تصویریں میری آنکھوں میں پھرتی رہیں میں کسی طرح بھی سو نہ سکا۔ سوچتا ہی رہا شب عروسی نہ تھی شب اسیری تھی نیند نے جیسے قسم کھالی ہو نمبردار نے تالہ کھٹکھٹایا تو میں نے وقت پوچھا۔

"آپ سوئے نہیں؟ نمبردار بولا۔"

نہیں بھائی نیند ہی نہیں آرہی ہے"

"مچھر کاٹتا ہوگا؟ سو جایئے یہاں منہ اندھیرے گنتی ہوتی اور جاگنا پڑتا ہے قید کی پہلی رات وحشت ناک ہوتی ہے گھبرایئے نہیں اچھے بُرے دن سب کٹ جاتے ہیں آپ لوگ تو چند روز کے لئے آئے ہیں نمبردار نے خود ہی سوال بنائے خود ہی جواب دے ڈالے۔

میں نے صرف وقت پوچھا تھا! دوبارہ پوچھا تو کہنے لگا دو بج چکے ہیں گنتی کھلنے میں تین گھنٹے باقی ہیں وہ "گھڑی گشت" جمعدار کے ساتھ چلا گیا معاً آنکھ لگ گئی پھر اُدھوری نیند ہی میں ضابطے نے اُٹھا دیا ——"بول جوان" کی پکار نے جگایا۔ جمعدار ایک ایک کوٹھری کے سامنے "بول جوان" کی صدا دیتا اور "ہوں ہاں" میں جواب لیتا ہوا نکل گیا۔ "سب اچھا" پر تالے کھُل گئے تمام قیدی قطار در قطار بیٹھ گئے جمعدار نے گِنا، درست پایا رجسٹر پہ دستخط کئے اور ڈیوڑھی بھجوا دیا۔ ہم لوگ نہانے دھونے میں لگ گئے اتنے میں سورج نکل آیا کھانا آگیا بھوک تیز تھی سبزی کا حال دال سے بھی پتلا تھا جیسے گھاس اُبال دی ہو تھوڑی ہی دیر میں ڈیوڑھی سے پرچہ آگیا۔ مقدمہ کی پیشی ہے ہم لوگ جو تقریر میں ماخوذ تھے تاریخ پر چلے گئے پولیس کی بند لاری میں کوتوالی پہنچے تو شہر کا حال ہی دگرگوں تھا —— گورہ فوج نے نکی اور دہلی دروازے سے لے کر شاہ محمد غوث تک تمام علاقہ کو گھیرے میں لے رکھا تھا مسلمان فوج غائب تھی سکھ رجمنٹ نے باغ میں ڈیرے ڈال رکھے تھے معلوم ہوا کل سے گولی چل رہی ہے مسلمان نوجوانوں نے مورچہ باندھ رکھا ہے ایک شہید ہوتا

تو دوسرا اُسکی جگہ لے لیتا ہے گورے چُن چُن کر گولی مارتے ہیں ابھی تک کسی شخص نے پیٹھ پر گولی نہیں کھائی سب سینہ ہی پر گولی کھا رہے ہیں چوبیس ۲۴ گھنٹے گزر گئے مگر پولیس اور فوج سے مورچہ نہ ٹوٹا ہم نے قیدی گاڑی سے دیکھا تو بہت سے گوروں کے سر پھٹے ہوئے تھے ہر طرف تصادم اور دہشت کا دور دورہ تھا ہمیں گاڑی سے اُتارا نہ گیا بلکہ پیش کئے بغیر تاریخ دی گئی ہم نے گاڑی ہی میں نعرے لگانے شروع کئے یکی دروازے کے ہجوم نے ہمارے ساتھ اپنی آوازیں ملا دیں۔ اتنے میں وہاں بھی گولی چلنے لگی ہمیں تو فوراً واپس کر دیا گیا مگر یکّی دروازے والوں نے جب دیکھا کہ ان کے دو نوجوان مارے گئے ہیں تو کفن پہن کر ڈٹ گئے دہلی دروازے کے مورچہ پر بھی یہی ہوا اُدھر سکھ اور مسلمان رجمنٹوں میں تصادم کا اندیشہ پیدا ہو گیا گورنر کو کوتوالی آنا پڑا۔ سرکار پرست مسلمان جو کچھ بھی تھے ظاہر تھا ملک فیروز خان نون نے گورنر کی گھُڑکیوں سے زچ ہو کر شہر کے سرکاری مسلمانوں کو جمع کیا میرزا معراج الدین سپرنٹنڈنٹ کی روایتی وفاداری سے فائدہ اُٹھایا گیا ——— مولانا اختر علی خان مجمع کے پاس گئے اور والد کا نام لیکر ہجوم کے سامنے ہاتھ جوڑے کہ یہاں سے چلے جاؤ ——— حرام موت مرنے سے کوئی فائدہ نہیں؛ غرض سر بکف نوجوانوں کو پیچ وخم میں لاکر مورچہ زڑواڈالا اور اس طرح ایک "گمشدہ امن" واپس آگیا

شیر زمان

اُس روز جیل میں بھی بہت سے ساتھیوں کا اضافہ ہوا اکثر زخموں سے چور تھے ان کے سروں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ یہ سب مورچے سے گرفتار کر کے لائے گئے تھے، انہی میں ایک نوجوان شیر زمان بھی تھا ———

شیر زمان میانوالی کا رہنے والا تھا نہایت قبول صورت سترہ اٹھارہ سال کا سِن ہو گا لاہور کی کسی مسجد میں درویش تھا اور شاید کسی عربی مدرسہ کا طالب علم ——— مَیں دوسرے روز جامع مسجد سے

تقریر کر کے باہر نکلا تو پولیس کی گارویں گھٹا کی طرح تُلی کھڑی تھیں میرے ارد گرد سی آئی ڈی والوں نے مسجد ہی میں بظاہر عقیدت کا دائرہ سا بنا لیا تھا اُنہیں پریشانی یہ تھی کہ پہلے روز تقریر کر کے میں روپوش ہو گیا تھا اور وہ رات بھر اِدھر اُدھر تلاش کرتے پھرے تھے کئی دوستوں سے ان کی جھڑپیں ہو چکی تھیں اب وہ مجھے کہاں جانے دیتے، باہر نکلتے ہی ان عقیدت کیشوں کی اصل تدبیریں آشکار ہو گئیں پولیس نے فوراً ہی بڑھ کر مجھے اور میرے ساتھیوں کو گھیرے میں لے لیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے رائفلوں کی باڑھ کھینچ دی کہ اس سے آگے کوئی نہیں آئے گا۔ سی آئی ڈی کے "نمازی گماشتے" جو اندر سے نعرہ ہائے تکبیر بلند کرتے آرہے تھے اب نعرہ بازوں کی نشاندہی کر رہے تھے لوگوں نے جوش میں ہماری طرف بڑھنا شروع کیا پولیس نے لاٹھی چارج کا حکم دے دیا ہجوم بھاگا نہیں، اِدھر اُدھر بکھر گیا پولیس کو غصہ آیا لوگوں نے پتھراؤ کیا حتیٰ کہ مسجد کی دیوار کو کمین گاہ بنا لیا' اتنے میں ایک نوجوان آگے بڑھا اور پیچھے سے سی آئی ڈی کے ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کو چوتڑوں پر ٹھڈا دے مارا اُس کے ٹھڈا کھانے سے ہمارا حلقہ ٹوٹ گیا ہم نے فرو ہونا چاہا مگر پولیس نے فوراً ہی حصار باندھ لیا سپرنٹنڈنٹ پولیس ——— قیدی گاڑی بلانے کے لئے چیختا رہا معلوم ہوا کہ بڑے دروازے پر لوگوں نے گاڑی کو گھیر رکھا ہے ——— جس نوجوان نے ٹھڈا مارا تھا اس کو ایک چھتے دار سب انسپکٹر نے اس بُری طرح پیٹا کہ لہولہان ہو گیا ہجوم اس سے اور بھی بپھرا اور بگڑا۔ حجروں کی چھتوں اور مسجد کے چبوتروں سے خشت باری تیز ہو گئی پولیس نے دوڑنا شروع کیا' اتنے میں بند گاڑی آگئی مجھے اور میرے دونوں ساتھیوں کو فوراً ہی اس میں بٹھا دیا گیا کپتان پولیس نے حکم دیا قلعہ میں لے جاؤ مگر اس سے پہلے کہ گاڑی اسٹارٹ ہو۔ اُس کا پچھلا پہیہ پھٹ چکا تھا ——— شیر زمان نے گاڑی کے پہیہ میں خنجر بھونک دیا، ٹائر کے دو ٹکڑے ہو گئے' وان ناکارہ ہو گئی شیر زمان کے پیچھے دو سپاہی دوڑے مگر وہ اتنی پھرتی سے ٹائر پھاڑ کر مسجد میں گھس گیا کہ پولیس مُنہ تکتی رہ گئی ——— ہمیں اُس گاڑی سے اُتار کر سپرنٹنڈنٹ کی کار میں بٹھایا گیا ——— کار صدر دروازہ کی طرف مڑتے ہی بارہ دری کے پاس کسی فوری خرابی سے رُک

گئی شیر زمان صدر دروازے سے نکلا تحتانی حجروں سے ہوتا ہوا کار تک پہنچا' خنجر نکالا' ابھی ٹائروں پر لپک ہی رہا تھا کہ پولیس سپرنٹنڈنٹ نے دیکھ لیا زمان پر ہاتھ ڈالا' مگر زمان اس وقت اتنا مشتعل اور غضبناک تھا کہ گتھم گتھا ہو گیا اُس نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کو اس زور سے طمانچہ مارا کہ وہ چکرا گیا زمان بل کھا کر مسجد کی طرف بھاگا یہ جا وہ جا اور یہ سب کچھ ڈرامائی انداز میں ہو گیا۔

سزایابی

گولی کا اثر کئی دن تک رہا جن لڑکوں کو فائرنگ کے اس ہنگامہ میں پکڑا گیا وہ ہفتہ عشرہ میں رہا کر دیئے گئے۔ انہی میں زمان بھی تھا ان کے علاوہ جو لوگ آگے پیچھے پکڑے گئے ان میں سے جن کی عمریں اٹھارہ برس سے اوپر تھیں وہ سنٹرل جیل میں رہے ان کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہ تھا ہم لوگ بورسٹل جیل میں تھے۔ کوئی پندرھویں روز سنٹرل جیل کے کورٹ روم میں ہمارا مقدمہ شروع ہوا ایک اینگلو انڈین مجسٹریٹ مسٹر ٹیل نے سماعت کی جن تقریروں کی بنیاد پر ہمیں گرفتار کیا گیا وہ تمام چونکہ شاہی مسجد میں ہوئی تھیں اس لئے استغاثہ کے گواہوں کا مسلمان ہونا ضروری تھا۔ کئی ریشمی داڑھیوں نے سچ یا جھوٹ بولا ایک انسپکٹر پولیس جو ہماری گرفتاری کے وقت سرے سے موجود ہی نہ تھا بلکہ جس رات ہم سٹی کوتوالی کی حوالات میں تھے ہم سے گرفتاری کا حال پوچھتا رہا اور جو کچھ ہم نے بتایا اُس نے وہی عدالت میں بیان کیا کہ میں نے اس طرح پکڑا اتنے بجے پکڑا یہ کیا وہ کیا کہا سچ لیکن یہ اُس کا جھوٹ تھا کہ اُس نے ہمیں خود پکڑا تھا۔

غرض سرسری سماعت کے بعد میرے ساتھیوں کو ایک ایک سال قید سخت اور ڈیڑھ ڈیڑھ سو روپیہ جرمانہ کی سزا دی گئی مجھے دو سال قید سخت اور تین سو روپیہ جرمانہ (بصورت عدم ادائیگی مزید چھ ماہ قید) کا حکم سنایا گیا ——— میں نے حکم سنتے ہی انقلاب زندہ باد۔ اللہ اکبر ——— اور پنجاب پولیس

مُردہ باد کے نعرے لگائے۔ ٹیل پہلے ہی سے مجھے گستاخ سمجھتا اور میرا تحریری بیان گستاخی پر محمول کرکے زمین پر دے مارا تھا اب جو مجھے نعرے لگاتے سنا تو بھڑک اُٹھا سپرنٹنڈنٹ جیل کے نام میرے خلاف عدالتی خط لکھا کہ وہ مجھے سزا دے کیونکہ مَیں نے یہ ہنگامہ جیل کے حدود میں کیا ہے۔ بورسٹل جیل کا سپرنٹنڈنٹ ایک گورہ فوجی تھا ——— کیپٹن گولڈ فیلڈ بٹیس بین ! اُس نے مجھے پندرہ روز قید تنہائی کا حکم سنایا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل خان عبدالحلیم خان خویئداد تھے سپرنٹنڈنٹ انہی کے اشارہ پر چلتا خانصاحب کی وجہ سے قید تنہائی ——— قید تنہائی نہ رہی انہوں نے مجھے ساتھیوں ہی میں بھجوا دیا وہاں بظاہر ایک الگ حصہ میں رہا مگر یہ محض دکھاوا تھا پریڈ کے روز (سپرنٹنڈنٹ کے ہفتہ وار معائنہ کا دن) تھوڑی سی دیر کے لئے بند رہتا پھر ہفتہ بھر کھُلا۔ تنہائی قید والوں کو پسائی کے لئے پندرہ سیر گندم دی جاتی لیکن جہاں ہم تھے وہاں چکیاں بالکل نہ تھیں مجھے سُرخی کوٹنے کے لئے روڑی دی گئی مَیں شوقیہ کوٹتا بھی رہا مگر یہ اپنی مرضی پر تھا۔ نہ کوٹنے پر کوئی بازپُرس نہ تھی۔

ہم جیل کے قواعد سے بالکل ناواقف تھے چاہتے تو مسلمان جیلر کی بدولت کماحقہٗ آرام پا سکتے تھے، مگر ان رعایات کو ہم نے اپنا حق سمجھا اور لحظہ بہ لحظہ خود سر ہوتے گئے۔ نتیجتہً ہمیں مختلف احاطوں میں بانٹ دیا گیا۔ مَیں اور اسحاق ایک ہی احاطے میں ڈالے گئے لیکن ہمارے CELLS فاصلہ پر تھے۔ یہاں پہلی دفعہ قید کا احساس ہونے لگا ایک ہندو اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ لالہ ٹھنداس بتترا احاطہ کا انچارج تھا اپنی نفرت چھُپا نہ سکا مجھے اور اسحاق کو جیلر نے پریس بھجوا دیا یہ سب سے ہلکی مشقت تھی۔ بورسٹل جیل کا پریس لاہور سنٹرل جیل کے پریس کی ایک شاخ تھا ایک بڑی سی بارک میں کچھ ٹریڈل مشینیں لگی ہوئی تھیں جہاں صرف قتل کے مقدموں کی مسلیں کمپوز ہو کر چھپتی تھیں مَیں نے بہت جلد کمپوزنگ کا کام سیکھ لیا لیکن ابھی پُورے طور پر قابو نہ پایا تھا کہ اپنے ہی ہاتھوں ایک اُفتاد آپڑی۔

عبدالوہاب پریس میں ایک نیک دل اور متشرع مسلمان اَفیسر تھے میرا ایک بیرنگ خط سید عنایت شاہ

ایڈیٹر "سیاست" کے نام لے گئے لیکن دستی پہنچانے کی بجائے ڈاک میں ڈال دیا۔ مَیں نے لکھا تھا کہ ہمارے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہو رہا ہمیں الگ کر دیا ہے اگر دس روز تک یکجا نہ کیا گیا تو ہم بھوک ہڑتال کر دیں گے۔ ہمیں قطعاً علم نہ تھا کہ ڈاک سنسر ہوتی ہے اور سنسر ہونے کے بعد اس پر ایکشن بھی لیا جاتا ہے۔ نہ عبدالوہاب کو پہلے سے اس کا اندازہ تھا —— خط پکڑا گیا سی آئی ڈی نے جیل خانوں کے انسپکٹر جنرل کو بھیجا اس نے سپرنٹنڈنٹ جیل کو بھجوا دیا۔ سپرنٹنڈنٹ نے انکوائری شروع کر دی جیلر جو مسلمان ہونے کی وجہ سے ہم پر قدرے مہربان تھا اب پتھر ہو گیا میں نہ سنسر سے واقف تھا نہ اُس کے نتائج سے نہ کبھی یہ پیچ ہی پڑا تھا، سخت پریشان ہوا۔ جیلر کو اصرار تھا کہ جو شخص یہ خط لے کر گیا تھا اس کا نام لُوں مَیں کسی طرح بھی تیار نہ ہوا ایک دو ساتھیوں نے کمزوری دکھائی مگر عبدالوہاب کا راز نہ کھلا دو وارڈ بلا وجہ معطّل کیے گئے ایک کی ترقی روک لی گئی دوسرا برخاست کر دیا گیا مجھے پریس سے قصوری لائن بھیج دیا گیا۔ جہاں چوبیس گھنٹے تنہائی میں بند رہنا پڑتا ہے اور کسی کوّے یا کتے کی آواز بھی نہیں آتی قصوری لائن بورسٹل جیل کا عذاب خانہ ہے وہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے دو پاگلوں سے واسطہ پڑا۔ دو نو قیدی تھے لیکن ماؤف ذہن۔ مشقّت ان کی قیدیوں کی پٹائی تھی جو قیدی بھی یہاں لایا جاتا اُسے شرط باندھ کر پیٹنا ان کا کام تھا۔ مَیں پہنچا تو مجھے دیکھتے ہی غرّانا شروع کیا ان کا شیوہ تھا کہ پہلے اس کے گرد ناچتے، پھر طمانچوں سے شروع ہو کر گھونسوں تک پہنچتے، پھر ٹوٹے ہوئے جوتے اُٹھا لیتے اور کان پکڑوا کر مشق کرتے جمعدار پاس بیٹھا تماشا دیکھتا اور مزے لیتا جب قیدی بے جان ہو جاتا تو پھر اُسے نہلا دھلا کر کوٹھری میں بند کر کے پندرہ سیر گندم کا کھوکھا آگے رکھ دیا جاتا کہ شام تک پیسو، ورنہ پھر پٹائی ہو گی۔ ان پاگلوں نے میرے ساتھ تھوڑی سی رعایت کی یعنی بے جان تو نہ کیا لیکن ہلکان ضرور کیا۔ ظاہر ہے کہ پندرہ سیر گندم تو بڑی چیز ہے مجھ سے پاؤ بھر گندم کا پیسنا بھی محال تھا کہاں قلم کے ہاتھ کہاں چکّی کا متھا؟ بتیری کوشش کی لیکن آدھ پاؤ آٹا پیسنا بھی مشکل ہو گیا۔ کھڑی چکّی نے نہ صرف تھکا دیا بلکہ ہتھیلیوں میں چھالے پڑ گئے —— بس ایک تجربہ ہیں

سے گزر رہا تھا دو ایک ہاتھ ہی میں جی چھوٹ گیا تاہم حوصلہ نہیں ٹوٹا ٹہارونا تو اس سے صرف پتھر ہی انکار کر سکتے ہیں آنکھیں ڈبڈبائیں آنسو پی گیا کسی پر ظاہر نہ کیا کہ اندر کی دنیا ہل گئی ہے قصوری احاطہ جیل کے مجرموں کا قید خانہ ہے، یہاں وہی واڈر اور جمعدار لگائے جاتے ہیں جو رحم و کرم کے اوصاف سے عاری ہوں یا جنہیں اذیت پہنچانے میں لطف آتا ہو ——— اس احاطہ کا انچارج اسسٹنٹ جیلر بھی سخت گیر ہوتا ہے اتفاق سے ہمارا انچارج ایک خوش طبیعت برہمن تھا جو ہم سے انصاف کرنا چاہتا اور اس بربریت کے خلاف تھا، مگر مجبور تھا ——— کیونکہ دو تو جمعدار محمد خان اور غلام حسین فطرتاً بُو چڑ تھے جب تک اذیت نہ پہنچا لیں ان کی طبیعتیں بے مزہ رہتیں ——— میرا جرم یہ تھا کہ میں نے چوری چھپے ایک چٹھی لکھی تھی لیکن جو کچھ اس میں درج تھا وہ غلط نہیں تھا ہم واقعی سختی محسوس کر رہے تھے اور ہمیں چن چن کر ایک دوسرے سے الگ کیا گیا تھا۔ اسکی سزا مل چکی تھی ایک ماہ قید تنہائی اس پر روز کی پٹائی گندم کی پسائی اور کان پکڑوائی مستزاد تھے۔ پھر اندر تو یہ ہو رہا تھا باہر کا علم ہی نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے؟ اس سارے عرصہ میں عزیزوں سے ملاقاتیں بھی بند کر دی گئیں جو کھانا پہلے روز تھے لایا تھا اب ہنسی خوشی کھا لیتا جوں توں کر کے یہ دن بھی کٹ گئے لیکن اپنے پیچھے بعض ایسی تلخیاں چھوڑ گئے جن کے تصور ہی میں وحشت تھی۔ فی الجملہ یہ پہلا تجربہ تھا آخر مجھے قصوری چکیوں سے نکال کر دوسرے احاطہ میں بھیج دیا گیا جہاں ہم دو چار ساتھی رہ گئے اور اکٹھے تھے بان بٹتے یا لفافے بناتے، شہید گنج ڈیفنس کمیٹی نے ہماری اپیلیں دائر کر رکھی تھیں دن اونے پونے گزر ہی رہے تھے ———

ذوق و شوق

میرا دماغ شروع سے سیاسیات کی طرف راجع تھا بلکہ میں چوتھی جماعت ہی سے "زمیندار" پڑھتے پڑھتے ایک سیاسی طالب علم ہو گیا تھا بال بھارت سبھا کے بعد میرا رُخ پلٹ گیا کانگرس کی نمکین ستیہ گرہ ختم ہوئی تو میرے اندر کا ولولہ ماند پڑ گیا تحریکِ کشمیر میرے سامنے اُبھری اور طوفان بن گئی میں نے اُس میں

کوئی دلچسپی نہ لی ایک تو میں ابھی پڑھ رہا تھا دوسرے میں نے اپنی طبیعت کو ادب میں لگا لیا اور شاعری کے کوچہ میں قدم رکھ چکا تھا۔ جولائی ۱۹۳۵ء میں شہید گنج کی اُفتاد آ پڑی۔

بزمِ اردو کے نام سے ہم نے ایک مجلس بنا رکھی تھی جہاں ہر اتوار کو جمع ہوتے اور آپس میں ادبی و شعری مذاکرہ کرتے اس مجلس کا سالانہ انتخاب تھا۔ جنرل سیکرٹری شپ کے لئے مجھ میں اور مرزا ادیب میں مقابلہ تھا۔ میں ہی منتخب ہوا انتخاب سے فارغ ہو کر حسبِ معمول شاہی مسجد کا رُخ کیا۔ میں وہاں منٹو پارک کی سمت کے حجروں میں عموماً پڑھتا پڑھاتا یا شعر کہا کرتا تھا۔ ایک حجرہ میں لیٹا ہوا کچھ پڑھ رہا تھا کہ حافظ معراج دین (سیکرٹری انجمن فرزندانِ توحید) آ گئے کہنے لگے۔

"یہاں پڑے کیا کر رہے ہو چلو جلسے کی صدارت کرو زیادہ سے زیادہ تین ماہ قید ہے خدمتِ اسلام کا وقت ہے لیڈر پکڑے جا چکے ہیں ہمیں کچھ کرنا چاہیئے وہ دیکھو دس بارہ ہزار آدمی مسجد میں جمع ہو چکے ہیں ــــــــ"

گزشتہ رات شہید گنج کی مجلسِ دفاع کے لیڈر مولانا ظفر علی خان سید حبیب ملک لال خان میاں فیروز دین احمد وغیرہ گرفتار ہو چکے اور انہیں صوبہ کے مختلف اضلاع میں نظر بند کر دیا گیا تھا یہ جلسہ اخبار وں کے مخفی اعلان پر ہو رہا تھا کوئی سامنے نہیں آ رہا تھا میں نے حافظ معراج دین سے عُذر کیا نہ مانے، حفیظ قندھاری اور بدر محی الدین اتفاق سے وہاں موجود تھے انہوں نے بھی زور ڈالا اور طوعاً و کرہاً مجھے منبر تک لے گئے۔ نعرۂ تکبیر ــــــ اللہ اکبر۔

پہلی تقریر

حضرات! اس جلسہ کی صدارت اُردو کے مشہور شاعر اور ادیب شورش کاشمیری فرمائیں گے حافظ جی نے تحریک کی چودہری مولا بخش نے تائید اور میں صدارت کی کرسی پر بیٹھ گیا سترہ سال سے کم عمر کا ایک لڑکا گو گو

کی نگاہ میں کیونکر جچتا، منبر کا احترام تھا یا دلوں کا ولولہ ـــــــ تقریر کے لئے کھڑا ہوا تو مجھے مطلق احساس نہ رہا کہ زندگی میں پہلی دفعہ بول رہا ہوں میں جو اسکول کی بزم ادب میں دو لفظ کہتے ہوئے کانپتا تھا یہاں بے روک ہو کر بول رہا تھا جس طرح ایک چھوٹا بچہ اچانک رینگنے لگتا پھر رینگتے رینگتے ایک دن چلنے لگتا ہے اسی طرح میں بولنے لگا اچانک بہرہ کھل گیا۔

کچھ معلوم نہ تھا کیا کہہ رہا ہوں لیکن جو کچھ بھی کہہ رہا تھا اس میں میرا جوش اور جذبہ شامل تھا میں نے جذباتی فضا پیدا کرتے ہوئے کہا

"گوری چمڑی والے گورنر کو راستہ سے ہٹ جانا چاہیئے وہ ایک گندا ناٹک کھیل رہا ہے جو کچھ بھی وہ کر رہا ہے ہم اس سے باخبر ہیں وہ ہمارے صوبہ میں خون خرابہ کرانا چاہتا ہے۔ شہید گنج سکھوں نے نہیں گرائی ۔ گورنر نے گروائی ہے مسجد تو ہم لے کر ہی رہیں گے آج نہیں کل لیکن ہم دلی کے لال قلعہ پر بھی پرچمِ اسلام لہرانے کا تہیّہ کر چکے ہیں ـــــــ" نعرہ ہائے تکبیر سے فضا معمور ہوگئی دیر تک نعرے گونجتے رہے عمر اور خطابت میں بہت دور کا فاصلہ تھا مگر لوگوں کے نعرہ ہائے تحسین نے میرے ارد گرد ہالہ بنا لیا جس سے میرا حوصلہ اور بھی جوان ہو گیا ـــــــ یہ اعلان کر کے کہ دوسرے دن پھر یہیں اور اسی وقت جلسہ ہو گا میں اپنے دوستوں کے ہمراہ غائب ہو گیا پولیس نے اُسی رات ہمارے گھروں میں چھاپہ مارا بعض کو پکڑ لیا حافظ معراج دین نے پولیس کو خاصا پریشان کیا وہ برقعہ پہن کر عورتوں میں گھس گئے لیکن پولیس نے نکال لیا میں اس رات گھر سے باہر رہا لاہور سے چھ میل دور ساندہ میں راوی کے کنارے ایک دوست کے ہاں رات کاٹی پولیس گھر میں اور "سیاست" کے دفتر میں ڈھونڈتی پھری سی آئی ڈی کے سپرنٹنڈنٹ میرزا معراج دین اور سید عنایت شاہ میں تو تکار ہو گئی حتیٰ کہ روزنامہ "سیاست" اور میرزا معراج دین ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے۔

سید عنایت شاہ سیاست مرحوم کے مالک و مدیر مولانا سید حبیب کے چھوٹے بھائی تھے۔ اُن کے

دو بیٹے عطاء اللہ شاہ ہاشمی اور عتیق اللہ شاہ ہاشمی میرے ذاتی دوست تھے انہی کی وجہ سے وہ مجھے عزیز رکھتے بلکہ انہی کی طرح سمجھتے تھے میں ساندے سے علی الصبح چوری چھپے ان کے ہاں پہنچا تو انہوں نے مجھے دفتر کے اوپر کی منزل میں چھپا دیا۔

ہم رات بھر جو کچھ سوچتے رہے ان سے ذکر کیا تو منع کیا فرمایا انفرادی تشدد حکومتوں کے مقابلے میں کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اوّل تو گورنر تک پہنچنا مشکل ہو گا اور پہنچ بھی گئے تو اس کا حاصل کچھ نہ ہو گا میں نے چند سوشلسٹ نوجوانوں کا ذکر کیا ان کا خیال تھا کہ تحریک کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ دونو قوموں میں تصادم ہو جائے گا لیکن مسجد کسی صورت میں بھی مسلمانوں کو نہ ملے گی جس مقصد کے لئے مسجد گرائی گئی ہے اور جو حاکمانہ ہاتھ اُسکے پیچھے کام کر رہا ہے اسکو بے نقاب کرنا چاہیئے۔

شاہ جی نے اتفاق کیا ظہر کے وقت جلسہ تھا حال یہ تھا کہ سی آئی ڈی والوں نے دفتر سیاست کو رات ہی سے نگرانی میں لے رکھا تھا اسکے باوجود میں اور سید عطاء اللہ شاہ ہاشمی دفتر سے کسی نہ کسی طرح نکلنے میں کامیاب ہو گئے شاہ محمد غوث کے عقب سے ہوتے ہواتے دہلی دروازہ کی بدرو پر پہنچے' وہاں سے گلیوں کا راستہ لیا پھر ان پیچ و خم کھاتی ہوئی گلیوں کے اندر سے شاہی مسجد تک جا نکلے چھوٹے دروازوں پر باوردی پولیس اور سی آئی ڈی کے پہرے دار کھڑے تھے۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھی کے رُخ سے بڑے دروازے کی سیڑھیوں پر چڑھ گئے آدھی سیڑھیاں طے کی ہوں گی کہ پیچھے سے کسی نے للکارا وُہ شورش جا رہا ہے پکڑو' ایک باوردی حوالدار لپکا مگر میں نے پلٹا کھا کر اُسے ایسی چنّی دی کہ چوتڑوں کے بل زمین پر آ رہا — اور میں دو چار جستوں ہی میں مسجد کے اندر جا پہنچا۔

بورسٹل جیل

بورسٹل جیل ضابطہ میں انسٹی ٹیوشن کہلاتا ہے اسے اصطلاحاً جیل نہیں کہتے لیکن معناً جیل ہی ہے

جس مخرے نے اسکی بنیاد رکھی تھی وہ اس کے نتائج سے کاملاً بے خبر تھا ورنہ شاید اس کی بنیاد ہی نہ رکھتا۔ یہاں کوئی سا قیدی بھی سُدھر نہیں سکتا میں یہاں کوئی تین سوا تین ماہ رہا لیکن جو کچھ مجھ پر روشن ہوا یا جن باتوں کا میں نے مشاہدہ کیا اسکی بنا۔ پر میری رائے یہی ہے کہ بورسٹل جیل ایک لعنت ہے۔ اٹھارہ سال کی عمر تک کے نوجوان یہاں رکھے جاتے ہیں مگر ان کی طفلانہ طبیعت یہاں سخت مجروح ہوتی ہے مثلاً۔

۱۔ حکام اِن قیدی بچوں کی نفسیات سے بالکل واقف نہیں ہوتے اور نہ ہمدرد ہوتے ہیں۔ نتیجتہً ان بچوں کو جو ماحول کی وجہ سے یا غیر ارادی طور پر کسی جرم کے مرتکب ہوتے ہیں ایک منتقمانہ فضا بگاڑتی چلی جاتی ہے۔ ان میں ایک جرم کے بجائے کئی جرائم نشوونما پا جاتے ہیں۔

۲۔ ان بچوں میں ادنیٰ درجے کے ملازم قیدی نمبردار اور طاقتور ساتھی جنسی میلانات پیدا کر دیتے ہیں جس سے وہ مفعولی زندگی کے عادی ہو جاتے ہیں۔

۳۔ چونکہ ساری فضا خوف پر مبنی ہوتی ہے اس لئے قیدی بچوں سے اس خوف کا شرمناک فائدہ اُٹھایا جاتا ہے۔ جنگلا پریڈ ــــــ جنسی اختلاط کے لئے ایک گھناؤنی اصطلاح جس سے قیدی نمبردار، کالی والے، پیلی والے، بلکہ بعض واڈر بھی متمتع ہوتے ہیں۔

ایسے قیدی جو کمزور ہوں یا مشقت کے ناقابل یا محنت سے جی چراتے ہوں جیل خانے کی سخت، مشقتوں سے عاجز آ کر خود سپردگی اختیار کر لیتے ہیں تمام بورسٹل جیل چونکہ چکیوں پر مشتمل ہے اس لئے رات کے گھُپ اندھیرے میں قیدی نمبردار یا واڈر منتخب لڑکوں کو ردیف کی صورت میں استعمال کرتے ہیں۔

۴۔ وہ قیدی لڑکے جو باہر تمباکو نوشی کے عادی ہوتے یا پھر جنہیں جیل خانے کی خوراک نہیں بھاتی بسا اوقات ایک سگریٹ یا ایک کش کے لئے اپنے آپ کو خرابیٔ جسم کے لئے پیش کر دیتے ہیں۔ ایک گرم روٹی۔ گُڑ کی بھیلی۔ صابن کی ٹکیہ یا ایسی ہی کوئی دوسری شے جیل خانے میں حصولِ جنس کا ذریعہ ہے۔

۵- ایک قلیل تنخواہ کے ملازم سے یہ توقع رکھنا کہ وہ ان بچوں کے لئے مصلح ہو گا محض خام خیال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ادنیٰ تنخواہ کے یہی ملازم ان قیدیوں کو بگاڑنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں وہ تمام چیزیں جو کھانے پینے کے کام آتی ہیں اور جیل کی خوراک کا حصہ نہیں اگر کسی قیدی کی خانہ تلاشی میں نکل آئیں، تو یہ بدمعاشی ہے اور اِس بدمعاشی ہی کے لئے جیل خانے میں بدمعاشی ہوتی ہے ——

۶- جو بچے قیدی ہو کر آتے ہیں انہیں بورسٹل جیل کی فضا چوبچہ کر دیتی ہے۔ (الا ماشاءاللہ) پھر باہر آکر یہی عادتیں ان کی فطرتیں بن جاتی ہیں۔

غرض ان قباحتوں کے برگ و بار بورسٹل جیل میں عام تھے نظر بظاہر وہاں اسکول بھی تھا کھیلیں بھی تھیں اور مراعات بھی مگر وہ نفسیات قطعاً ناپید تھیں جن سے ایک قیدی کی اصلاح ہو یا ایک کم سن مجرم راہ راست پر آسکے۔ قیدی کام سیکھتے یا مشقت کرتے ہیں تو ہنر آموزی کے لئے نہیں بلکہ قید میں کٹوتی کے لئے، جسے جیل کی اصطلاح میں معافی کہتے ہیں —— نتیجتہً بورسٹل جیل کا سارا مواد خام رہتا بلکہ بگڑ کر بدبودار ہو جاتا ہے ——

رہائی

ایک دن بیٹھے بٹھائے اطلاع ملی کہ اپیلیں منظور ہو گئی ہیں تب کارنیلس سیشن جج تھے انہوں نے جرمانہ اڑا دیا اور قید سال سے گھٹا کر تین ماہ کر دی۔ ساتھیوں میں لازماً خوشی کی لہر دوڑ گئی چونکہ مجھے دو تقریروں میں دگنی قید اور دگنا جرمانہ ہوا تھا اس لئے ایک اپیل رہ گئی۔ رہائی میں دو ہفتے باقی تھے۔ مسٹر کارنیلس کا تبادلہ ہو گیا اُن کی جگہ ایک کشمیری پنڈت اونکار ناتھ زتشی آگئے انہوں نے رہائی سے پہلے دوسری اپیل سُن لی اور بالکل ہی چھوڑ دیا۔

غالباً اس فیصلے کے اگلے ہی دن ہماری رہائی ہو گئی۔ جیلر اپنی سختیوں پر نادم تھا۔ ہمیں مُنہ اندھیرے

رہا کر دیا گھر سے کوئی موجود نہ تھا ہم بمشکل وارث روڈ تک پہنچے ہوں گے کہ اقربا آگئے، ہمیں ہاروں سے لاد دیا اور ساتھ لے گئے، مجھے یاد ہے جب مَیں ہمشیرہ کے مکان پر پہنچا تو میرے دادا نے بچوں کی طرح روتے بسورتے مجھے گلے سے لگا لیا کہنے لگے ہمارے ہاں کبھی کسی کو ہتھکڑی نہیں لگی تھی تم نے ہتھکڑی بھی لگوالی ——؟ گویا میں اس معمر ترین انسان کے نزدیک جو شرافت کا ایک پیکر متحرک تھا کسی ایسے جرم کا مرتکب ہوا تھا جو خاندانی شرافتوں کی روایت کے خلاف تھا۔

سی آئی ڈی کے مسلمان اہلکار

باہر آکر دیکھا تو شہید گنج کا شعلہ کجلا چکا تھا بعض عناصر نے حصولِ مسجد کے نام پر مجلس اتحاد ملت قائم کی لیکن ان کا مقصد تحریک کو ٹھنڈا کرنا تھا نوجوانوں کا جوش آندھی کی طرح اُٹھ کر غبار کی طرح بیٹھ گیا۔ اب جو لوگ "راہنما" تھے ان میں مجلس اتحادِ ملت کے صدر پروفیسر ملک عنایت اللہ تھے جو کبھی ایف سی کالج میں فارسی کے پروفیسر رہے تھے ان کے ساتھیوں میں زیادہ تر سرکاری شاخوں کے پھل پھول تھے، یا پھر سی آئی ڈی کے گماشتے۔

یہاں اشارۃً یہ ذکر کر نا بے جا نہ ہوگا کہ انگریزی عہد میں پنجاب سی آئی ڈی کے مسلمان افسروں کا رول کیا رہا، انہوں نے کس قسم کے کارنامے انجام دیئے یہ تمام چیزیں ایک طاقتور قلم کی منتظر ہیں —— "بوئے گُل نالہ دل دودِ چراغ محفل" میں اس حکایت کا ایک حصہ آچکا ہے۔ ممکن ہے شہید گنج کے انہدام میں ان افسروں کا حصہ نہ ہو لیکن اس سے جو تحریک پیدا ہوئی یا پیدا کی گئی اس کے انتصال و زوال میں ان کا ہاتھ ضرور تھا اور یہ تمام راز رفتہ رفتہ کھلتے گئے۔ پیر جماعت علی شاہ پنجاب کے نامور پیر تھے بعض اضلاع میں ان کا اثر بھی تھا۔ کئی مصلحتوں نے اکٹھا ہو کر راولپنڈی میں شہید گنج کانفرنس کی وہاں انہیں امیر ملّت نامزد کیا گیا۔ پیر صاحب انتہائی سادہ نیک دل اور آخری حد تک غیر سیاسی آدمی تھے۔ اُن کے

گردو پیش عموماً سرکاری لوگ رہتے جو انہیں اِدھر اُدھر نہ ہونے دیتے تھے۔

پیر صاحب نے راولپنڈی کے اجتماع عام میں اعلان فرمادیا کہ مسجد شہید گنج مسلمانوں کو نہ ملی تو میں شاہی مسجد کے مینار پر چڑھ کر چھلانگ لگادوں گا۔ اِس اعلان سے خوش ہو کر لاہور کے مسلمانوں نے پیر صاحب کا تاریخی جلوس نکالا لیکن یہ اعلان —— اعلان ہی رہا چنانچہ یہ ایک المیہ ہے کہ شہید گنج کا یہ دور سی آئی ڈی کے سپرنٹنڈنٹ میرزا معراج دین کے ہاتھ میں تھا انہوں نے امیر ملت سمیت یکسر اتحاد ملت تک سب کو بالواسطہ و بلاواسطہ اپنی جیب میں ڈال رکھا تھا۔

پیر صاحب کے گردو پیش اس قسم کے لوگ جمع کر دیئے گئے تھے جو انہیں سرکاری منشاء کے تابع رکھتے۔ عام لوگ نہ صرف ان کے فرار سے بدظن ہو رہے تھے بلکہ مطالبہ کرنے لگے تھے کہ شہید گنج کی بازیابی کے سلسلہ میں پیر صاحب اپنا وعدہ پورا کریں لیکن اُن کے کانوں تک کوئی لفظ ہی پہنچنے ہی نہ پاتا وہ مریدوں کے نرغہ میں تھے۔ میر مقبول محمود اور کرم الٰہی وکیل عموماً ان کے گردو پیش رہتے یہ دونو سرکاری طرف سے مامور تھے ایک روز میں حاضر ہوا تو یہ دونو بزرگ دوسرے حواریوں کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ حتیٰ کہ ڈاکٹر شیخ محمد عالم بھی دوزانو بیٹھے تھے۔ ہر کوئی اپنے داؤں پر تھا میں نے چاہا کہ پیر صاحب کو لوگوں کے جذبات سے مطلع کروں مگر کرم الٰہی وکیل نے روک دیا "حضور کے سامنے کوئی ایسی بات نہ کرو جو ان کی طبیعت کے لئے بوجھ ہو"۔ پیر صاحب فرما رہے تھے کہ جہاد فرض ہے میر مقبول زور دے رہے تھے کہ حضور حج پر تشریف لے جائیں۔ شہید گنج کا قضیہ تو ہر حال میں طے ہو جائے گا حضور نے آج تک حج سے ناغہ نہیں کیا۔

عجیب کشمکش

اچانک ہی حکومت نے سید حبیب اور میاں فیروز الدین احمد کو رہا کر دیا وہ لاہور پہنچے تو معاملہ

ڈانواں ڈول تھا۔ پیر صاحب کھسک رہے تھے سید حبیب نے پیر صاحب کو ڈھب پر لانے کی بہتیری کوشش کی، لیکن بے سود آخر سالہا سال کے تعلقات توڑ لئے۔ پیر صاحب یہ کہہ کر حج کے لئے روانہ ہو گئے کہ جہاد ملتوی کیا جا سکتا ہے لیکن حج ساقط نہیں ہوتا جب اُن سے کسی نے کہا کہ اس طرح مسلمان انہیں امیر ملت تسلیم کرنے سے انکار کر دیں گے، تو غصہ سے کانپنے لگے فرمایا مجھے ایسی قوم کا امیر بننا منظور نہیں یہ لوگ مانیں یا نہ مانیں مجھے خدا نے امیر ملت بنایا ہے مَیں سید ہوں اور سید تمام مسلمانوں کا سردار ہوتا ہے۔ لوگوں کے دیے ہوئے لقب کی مجھے پروا نہیں —— تمام ارادت مندوں نے (جو اُس وقت حلقہ میں موجود تھے) صاد کیا۔ غرض پیر صاحب "عقیدتمندوں" کے "نذرانے" لے کر حج کو چلے گئے۔ میدان خالی رہ گیا سید حبیب اپنی جزوی رہائی کو حکومت کی چال قرار دیتے اور کوشاں تھے کہ تحریک دوبارہ زندہ ہو۔ لیکن ان کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں وہ تمام خاندانی اُمرا اور سرکاری فُضلا۔ جو ابتدا میں شہید گنج کے مجاہد بن کر نکلے اور تحریک میں مختلف کمیٹیوں کے کرتا دھرتا بن گئے تھے اب فائرنگ کے دن سے غائب تھے۔ گورنر کی ایک ہی گھرکی نے انہیں گھروں میں بٹھا دیا تھا وہ سید حبیب سے مصافحہ کرتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔

اُدھر مرکزی حکومت اس ٹوہ میں تھی کہ یہ تحریک دوبارہ اُٹھے گی یا نہیں؟ گورنر مرکز کا معتوب ہو چکا تھا اور یقین سے کہہ نہیں سکتا تھا کہ آئندہ کیا ہوگا۔ ڈپٹی کمشنر مسٹر ایس پرتاپ (جو سکھ خاندان سے عیسائی ہوا تھا) گورنر کو یقین دلاتا تھا کہ تحریک میں اب کوئی جان نہیں اگر تمام نظربندوں کو رہا کر دیا جائے تو کوئی سا اندیشہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس میرزا معراج دین سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی اپنی کارگزاری دکھانے کی فکر میں تھا وہ لکھ چکا تھا کہ تحریک میں جاگ اُٹھنے کی علامتیں موجود ہیں اور کسی ایک وقت خاکستر سے چنگاریاں اُٹھ کر شعلۂ جوالہ بن سکتی ہیں۔ دونوں کے اپنے اپنے ذرائع اور اپنے اپنے مواقع تھے۔ دونوں گورنر کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ میرزا معراج دین یہ تاثر دے رہا تھا کہ صورتحال میں اشتعال موجود

ہے مگر وہ اپنے خاص ذرائع سے اِسس پر قابو پا سکتا ہے اور یہی اِس زمانے کی سی آئی ڈی کے افسروں کا کمال تھا کہ اپنی ترقی و اعزاز کے لئے وہ سب کچھ کر گذرتے تھے۔

پیر صاحب کا حج کو جانا معمّا نہیں رہا تھا عوام ناخوش تھے میں نے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے نہ صرف احتجاج کیا بلکہ یہاں تک کہہ ڈالا کہ

"جو لوگ ڈائر اور اوڈوائر کو سپاسنامہ دے چکے ہوں جنہوں نے پہلی جنگ عظیم میں انگریزی فوج کو تعویذ دیے ہوں کہ ترکوں کی گولیاں اُن پر اثر انداز نہ ہوں گی اُن سے یہ توقع رکھنا کہ وہ شہید گنج کی بازیابی کے لئے اوڈوائر کے کسی جانشین سے آنکھیں چار کریں گے ایک احمقانہ خواب ہے —— یہ گدیاں انگریزوں نے ہمارے لئے نہیں اپنے لئے قائم کی ہوئی ہیں" ——

میرزا معراجدین

اس تقریر کی رپورٹ میرزا معراجدین کے پاس پہنچی تو یاد فرمایا ایمپرس روڈ پر ان کا بنگلہ تھا بڑے تپاک سے ملے، کچھ دیر انداز تقریر کی تعریف فرماتے رہے پھر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے —— آخر میں فرمایا کہ آپ لوگوں کو تحریک اٹھانی چاہیئے مسجد نہ ملی تو یہ مسلمانوں ہی کی نہیں اسلام کی بے عزتی ہو گی۔ اللہ کا نام لے کر شاہی مسجد میں مورچہ لگا دو میں پچاس روپے ماہانہ پیش کرتا رہوں گا یہ میری طرف سے عام اخراجات کے لئے ایک حقیر سی امداد ہو گی۔ میرزا صاحب پچاس روپے کے نوٹ نکال رہے تھے میں نے روک دیا عرض کی آج رات مجھے سوچنے کی مہلت دیجئے، کل شام کچھ عرض کر سکوں گا کہ تحریک چلا سکتا ہوں یا نہیں، کیونکہ جو کچھ میں نے محسوس کیا یا دیکھا ہے اس کے مطابق اب تحریک میں کوئی جان نہیں رہی اس قسم کے عناصر جمع ہو گئے ہیں جو میرے نزدیک مشکوک ہی نہیں بلکہ حصول مسجد

کے بجائے اپنے خاص مقاصد رکھتے ہیں میرزا صاحب نے بہر حال اپنا نقش جمانا چاہا اور اس خوش اسلوبی سے گفتگو کی جیسے اُن سے بڑھ کر اسلام کا کوئی خیر خواہ نہیں اور اگر ان کے "نسخہ کیمیا" پر عمل کیا جائے تو مسجد کا حصول آسان ہو جائے گا بلکہ یقینی ——

اُن کے بنگلے سے نکل کر مَیں سیدھا سید عنایت شاہ کے پاس پہنچا۔ مَیں اس قسم کے مواقع اور موانع میں ہمیشہ انہی سے مشورہ لیتا تھا انہوں نے یہ ساری کتھا سُنی تو مسکرائے فرمایا

"شاہ صاحب (سید حبیب) کی پہلی کوشش یہ ہے کہ مولانا ظفر علی خان اور دوسرے تمام نظر بند رہا ہو جائیں انہی کی رہائی پر آئندہ کے پروگرام کا انحصار ہے۔ ایس پر تاپ' شاہ جی سے بات چیت کر رہا ہے۔ میرزا معراج دین کو پسند نہیں وہ اپنی چودھراہٹ چاہتا ہے۔ خود تمہارے معاملہ میں مجھ سے اُلجھ چکا ہے اُس نے گورنر سے کہا ہے کہ تحریک اندر ہی اندر سُلگ رہی ہے اور سید حبیب ہوا دے رہا ہے۔ اب چونکہ اُسے ہمارے تعلقات کا علم ہے اس لئے اپنا دعویٰ ثابت کرنے کے لئے اس نے تمہیں پھانسا اور پھسلانا چاہا ہے۔ اس طرح وہ گورنر سے کہہ سکے گا کہ اُسکی اطلاعات درست تھیں؟ شورش سید حبیب کا آدمی ہے وہ جانتا ہے کہ تحریک فی الحال بے جان ہو چکی ہے۔ شاہ صاحب اور تمہیں گرفتار کرنے کے بعد وہ یہ کریڈٹ بھی حاصل کرنے کی کوشش کرے گا کہ تحریک اس کی کوششوں سے فرو ہوئی ہے"۔

شاہ صاحب نے بعض ایسے نظر بندوں کا ذکر کیا جو بالواسطہ یا بلا واسطہ اس کے ہاتھوں میں تھے اور وہی کچھ کہتے یا کرتے جو وہ چاہتا تھا ——

اگلے روز مَیں نے نہ صرف اُسے ملنے سے انکار کیا بلکہ کہلا بھیجا کہ آپ اِس مقصد کے لئے کسی اور کو منتخب کر لیں مَیں خود فروشی کے کاروبار سے قطعاً نابلد ہوں

سید حبیب نے یہ سارا واقعہ الیس پرتاپ کو سنایا اس نے گورنر سے کہا۔ گورنر نے میرزا معراجدین کو طلب کیا۔ میرزا معراج دین نے گورنر سے کیا کہا ؟ خدا بہتر جانتا ہے مگر سید حبیب سے اُس کی لڑائی تیز اور مستقل ہوگئی۔ ادھر میرزا صاحب مجھے فنا کرنے پر تُل گئے۔

چودھری مولا بخش

ایک نوجوان مولا بخش گجر ہمارے ساتھ ہی قید ہوا اور ساتھ ہی رہا ہوا تھا وہ میرے پاس آیا اور زور دیا کہ تحریک شروع کرنی چاہیئے۔ مَیں نے اس سے بھی یہی کہا کہ لوگوں میں ہمت نہیں موقع نکل چکا ہے قومی جہاد تو کیا ہوگا فرقہ دارانہ فساد ہو جائے گا مولا بخش نہ مانا امین الدین صحرائی کے پاس پہنچا وہاں سے ملک عنایت اللہ کے ہاں گیا ملک صاحب نے اُٹھ کر ملک محبوب احمد کو ساتھ لیا اور میرزا ظہور الدین کے گھر پہنچے صلاح مشورہ کیا طے پایا کہ امرتسر چلیں وہاں سے پوسٹر چھپوائیں اور آئندہ جمعہ کو سول نافرمانی شروع کر دیں ـــــ امرتسر میں شیخ غلام محی الدین اتحاد ملت کے معتمد تھے انہوں نے ہمت کر کے اشتہار چھپوا دیا۔ یہ لوگ اشتہار لے کر لاہور واپس آ گئے لیکن یہ راز بھی قبل از وقت افشا ہو گیا اشتہارات چسپاں ہونے سے پہلے ہی پولیس کے ہاتھ آ گئے۔

چودھری مولا بخش جمعہ کے روز شاہی مسجد پہنچ گیا اور لوگوں سے سارا قصہ کہہ ڈالا ہر ایک کا نام لیا کہ فلاں فلاں مشورہ میں شریک تھا مگر اس وقت سب غائب ہیں لہذا اب وہ اکیلا ہی شہید گنج کو جا رہا ہے باہر نکلا تو پولیس نے گرفتار کر لیا اُسی دن ضمانت ہو گئی لیکن یہ ایک دلچسپ ناٹک تھا جس کے ہدایت کار میرزا معراجدین تھے اُن کی چال کامیاب رہی چودھری مولا بخش نے اگلے روز شاہی مسجد میں ڈیرہ ڈال کر تحریک چلا دی۔ مولا بخش نے باقاعدہ محاذ باندھا ہر روز چار آدمیوں کا ایک قافلہ شہید گنج کی طرف جاتا کبھی اُسے دروازے پر پکڑ لیا جاتا کبھی شاہی محلہ کے آس پاس کبھی نوگزے کی قبر کے

اردگرد کبھی پانی والے تالاب کے چوک میں ۔ مولا بخش اس دوران معراج دین سے باقاعدہ ہدایات لیتا اور اُسی کی بولی بولتا رہا ایک دن اُس نے ہم سب کے خلاف جو مُنہ میں آیا کہہ ڈالا جس سے ہمارا یقین پختہ ہو گیا کہ اس ڈرامے کا پروڈیوسر میرزا معراج دین ہے ۔ ہم نے لاکھ چاہا کہ اس کا توڑ کریں لیکن سمجھ ہی میں نہیں آتا تھا کیا کریں ——

انہی دنوں مسٹر السیر اے ڈی ایم لاہور کی عدالت میں پنجاب سوشلسٹ پارٹی کے دو نوجوانوں کامریڈ مبارک ساغر اور کامریڈ موہن لال کے خلاف مقدمہ چل رہا تھا کہ انہوں نے اپنی تقریروں میں شہید گنج کے انہدام کو نہ صرف انگریزی حکومت کی سازش قرار دیا بلکہ گورنر پر مسجد ڈھوانے کا الزام لگایا ہے ۔ اُن کا بیان تھا کہ آئندہ انتخابات میں فرقہ واریت کو پروان چڑھانے کے لئے مسجد گروائی گئی ہے ۔ میری ان نوجوانوں سے علیک سلیک تھی ہم کبھی کبھار تحریک کا رُخ سنوارنے کے لئے آپس میں صلاح مشورہ کر لیتے تھے ۔ میرے قبضے میں کچھ کاغذات تھے جن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ مسجد شہید گنج پر جس شخص نے سب سے پہلے گینتی چلائی وہ ایک سکھ سب انسپکٹر بنتا سنگھ ہے ۔ اسی طرح کی بعض اور معلومات بھی تھیں ۔ ان نوجوانوں نے صفائی کے گواہوں میں میرا نام بھی لکھوا دیا میں نے عدالت میں پیش ہو کر سب سے پہلے اپنی حفاظت کا تیقین چاہا میں نے کہا اگر عدالت مجھے یقین دلادے کہ میرے انکشافات پر میرے خلاف کوئی مقدمہ نہیں چلایا جائے گا تو میں بہت سے واقعات عدالت کے نوٹس میں لانے کو تیار ہوں ۔ عدالت نے آدھ گھنٹہ تک اجلاس ملتوی کر دیا ۔ آدھ گھنٹہ بعد عدالت نے ضمانت دینے سے انکار کر دیا مسٹر السیر نے کہا جو کچھ کہنا چاہو اپنی ذمہ داری پر کہہ سکتے ہو ملزموں نے احتجاجاً صفائی ترک کر دی —— شام کو میرزا صاحب کا ایک سب انسپکٹر میرے ہاں آیا ڈراتا دھمکاتا رہا میں نے ٹکا سا جواب دے کر چلتا کیا

یعسوب الحسن

یعسوب الحسن ہمارے ساتھ تھا ہم نے اُسے مولابخش اور معراج دین کو بے نقاب کرنے کے لئے آمادہ کیا وہ مان گیا سی آئی ڈی کو ہر بات پہنچ جاتی ہے یہ بات بھی پہنچ گئی۔ اب یہ کہنا مشکل ہے ہوا کیا؟ ــ

ــــــــــ آدھی رات گزری ہوگی کہ پولیس نے مولابخش کو مسجد سے گرفتار کر لیا گیا۔ صبح شہر میں ہڑتال ہوگئی۔

ہم نے فوراً ہی یعسوب الحسن کو شاہی مسجد بھجوادیا اُس نے پہلے ہی دن تحریک کا لب ولہجہ بدل ڈالا سی آئی ڈی کی در پردہ سازشوں کو بے نقاب کیا ایک ایک افسر کا نام لے کر اُس کے کارناموں پر روشنی ڈالی۔ اُس نے کہا ــــــ "یہ خانۂ خدا ہے یہاں انگریزوں کا کوئی خانہ زاد نہیں رہ سکتا۔ مَیں سی آئی ڈی کے کارندوں سے کہتا ہوں کہ وہ فوراً ہی مسجد خالی کر دیں اور آئندہ سے مسجد میں داخل نہ ہوں آج کے بعد انہوں نے مسجد میں قدم رکھا تو مجھے ان کی نشان دہی کرنی ہوگی ــــ پھر مَیں ذمہ دار نہ ہوں گا کہ ان کے ساتھ کیا برتاؤ ہوتا ہے اس اعلان کے ساتھ ہی مامورین اُٹھ کر چلے گئے ــــ" یعسوب کی ان دھمکیوں سے سی آئی ڈی میں خاصی ہلچل مچ گئی، دوسرے دن نماز ظہر کے بعد لوگ جلسہ کی تیاری کر رہے تھے کہ ایکا ایکی چودھری مولابخش آٹپکے اور یعسوب کے برابر بلکہ منبر کی بالائی نشست پر فروکش ہو گئے۔ پرسوں گرفتاری، آج رہائی، ہمارے لئے کوئی معمّا نہ تھا۔ ہم خوب سمجھتے تھے کہ میرزا صاحب گھبرا گئے ہیں اور تحریک پر ہمارے قبضہ کو اپنے لئے خطرناک سمجھتے ہیں۔ مولابخش یہ دُوسری دفعہ رہا ہوا تھا کسی نے اُس سے یہ سوال نہ کیا کہ یہ ڈرامہ کیا ہے؟

جس شخص کو پولیس راتوں رات چھاپہ مار کر لے گئی ہو اُس کا دوسرے ہی روز چھوٹ جانا اور

بضد ہونا کہ تحریک کی باگ ڈور اُسی کے ہاتھ میں رہے پہیلی ضرور تھا مگر واقفانِ حال کے لئے پہیلی نہ تھا۔ لوگ جذبات کی رو میں بہہ رہے اور اس قسم کے سوال کرنے سے عادتاً عاری تھے۔ مولا بخش نے پہلا وار یہ کیا کہ یعسوب کو تقریر کرنے سے روک دیا خود اول جلول بکتا رہا ——— یعسوب کا خیال تھا کہ راولپنڈی کی جامع مسجد سے وہ تحریک شروع کرے اور وہاں سے ہر روز چار چار آدمیوں کا جتھا بھیجتا رہے مگر مولا بخش مانع ہو گیا بات سی آئی ڈی تک پہنچ گئی ———

ایک رات جب بہت سے لوگ سو رہے اور کچھ جاگتے تھے یعسوب چپ چاپ فرار ہو گیا۔ سی آئی ڈی نے بہتیرا ڈھونڈا شکار ہاتھ سے نکل چکا تھا اب پولیس نے یعسوب کے والد اور رشتہ داروں کو تنگ کرنا شروع کیا تحریک کے ایک ایک کارکن کو پکڑ کر یعسوب کی بُرائیاں کرتے رہے آخری حربہ بھی استعمال کیا کہ یعسوب نوجوان بھارت سبھا کے زمانہ میں ہمارا مخبر رہا ہے کامریڈ احسان الٰہی اسی کی مخبری پر گرفتار ہوا تھا مجھ سے بھی یہی قصے بیان کئے گئے۔ مَیں نے عرض کیا ہو سکتا ہے آپ کی باتیں دُرست ہوں مگر اب تو ایسا نہیں ؛ اور اگر اب آپ کی مرضی کے موافق ہوتا تو آپ یہ راز کبھی افشا نہ کرتے ؛ عوام بھی سی آئی ڈی کے اس پروپاگنڈا سے متاثر نہ ہوئے۔ یعسوب اس الزام سے داغدار ضرور تھا مگر اب مخلص تھا اور اپنی انہی لغزشوں کا انتقام لینے کے لئے سی آئی ڈی کے معاملہ میں منتقم ہو گیا تھا۔ قصہ کوتاہ سی آئی ڈی نے یعسوب کے بوڑھے باپ، ایک بھائی، کئی دوستوں اور بعض ملاقاتیوں کو از حد تنگ کیا مگر یعسوب کا پتہ نہ چل سکا کہ ہے کہاں ؟ ——— وہ دراصل ایک طوائف کے مکان میں چھپا ہوا آئندہ کی سوچ رہا تھا۔ اس طوائف نے بڑی ہمت کا ثبوت دیا۔ اُسے خطرے کی سنگینی سے مطلع کیا گیا تو اُس نے کہا کوئی بات نہیں آپ میری فکر نہ کریں نامۂ اعمال کی سیاہیوں میں کوئی نیکی ضرور ہونی چاہیئے۔

یہاں بھی مولا بخش ہی معراج دین کے کام آیا اس نے اعلان کیا کہ وہ تحریک میں کسی انڈر گراونڈ

سرگرمی کا حامی نہیں۔ یعسوب کو مسجد میں واپس آجانا چاہیئے۔ ورنہ مجھے اس سے لاتعلقی کا اعلان کرنا پڑے گا۔ طوعاً وکرہاً یعسوب اُسی شام واپس آگیا۔ مولا بخش نہیں چاہتا تھا کہ یعسوب اُس کے ساتھ رہے اور خطابت و قیادت تقسیم ہو اس کے لئے جائے رفتن نہ پائے ماندن کا مرحلہ تھا وہ مجبور تھا یعسوب نے آتے ہی تحریک کو پھر سے تیز کرنا شروع کیا وہ تمام چالیں جو سی آئی ڈی چل رہی تھی اُس نے بے نقاب کر دیں مولا بخش بہتیرا سٹپٹایا لیکن بے سود۔ یعسوب نے لوگوں سے کہا کہ رات بھر مسجد میں رہا کریں چنانچہ ہر روز کوئی چار اور پانچ سو کے درمیان لوگ مسجد ہی میں رہنے لگے۔

سی آئی ڈی نے یعسوب کے بارے میں گفتنی و ناگفتنی باتوں کو عام کیا جب اس میں ناکامی ہوئی تو پھر ایک گماشتہ کو مقرر کیا کہ مسجد میں ہر رات چائے کی جو دیگ پکتی ہے اس میں کوئی خواب آور چیز ڈال دی جائے لوگ سو جائیں گے تو پولیس کو چھاپہ مارنے اور یعسوب کو پکڑنے میں آسانی ہو گی، یہی ہوا لوگوں نے چائے پی اور لاشوں کی طرح لیٹ گئے۔ مولا بخش یعسوب کو حجرہ میں لے گیا رات ڈو بجے کا وقت تھا سی آئی ڈی کے اہلکار سہمے ہوئے سائیوں کی طرح صحن میں پھر رہے تھے جب ہر چیز اُن کے نقطہ نگاہ سے ٹھیک ہو گئی تو پولیس کی ایک بھاری جمعیت نے مسجد میں داخل ہو کر یعسوب کو گرفتار کر لیا۔ مولا بخش بھی پکڑا گیا یعسوب کو مسجد ہی میں سی آئی ڈی کے حکام نے بُری طرح پیٹا پھر چھاؤنی کے پولیس اسٹیشن میں لے گئے میرزا معراج الدین نے چودھری مولا بخش کی تو خوب آؤ بھگت کی، کرسی پر ساتھ بٹھایا مگر یعسوب کو نہ صرف یہ کہ مرصع گالیاں دیں بلکہ طمانچے اور گھونسے مار مار کر اَلّو کر دیا جہاں تک بن پڑا ذلیل کیا۔

مولا بخش معمولی لکھا پڑھا آدمی تھا کوئی کاروبار نہ تھا پیسہ اخبار میں چار روپے ماہوار پر ایک رہائشی کوارٹر لے رکھا تھا یہیں اس کا بھائی دودھ دہی کی دوکان کرتا تھا —— اُسے چھ ماہ کی سزا اور بی کلاس دی گئی یعسوب جو بی اے تک پڑھا اور ایک کھاتے پیتے گھرانے کا نوجوان تھا

سی کلاس میں رہا۔ اُسے نہ صرف مختلف مقدموں میں پھنسا دیا گیا بلکہ جیل کے حکام کو اس پر سختی کرنے کی تاکید کی گئی۔ اٹھارہ سیر گندم کی پسائی اور قید تنہائی ـــــــــ

قائداعظم کی آمد

اس اثنا میں قائداعظم لاہور تشریف لائے انہوں نے تحریک کا جائزہ لیا پھر مختلف لوگوں سے مل کر صورت حال معلوم کی آخر گورنر سے مل کر تمام نظر بندوں اور قیدیوں کو رہا کرا دیا قائداعظم دہلی میں وائسرائے سے مل کر آئے تھے اور یہاں اس طرح کی بدامنی کے خلاف تھے۔ انہوں نے مسلمانوں اور سکھوں کے اکابر پر مشتمل ایک بورڈ بنا دیا کہ وہ مل ملا کر شہید گنج کے قضیہ کا حل نکال لیں۔ ہم نے قائداعظم سے کہا کہ مولا بخش اور باقی گرفتار شدگان رہا ہو گئے ہیں مگر یعسوب الحسن سی آئی ڈی کے عتاب کی وجہ سے رہا نہیں ہوا اُسے بھی رہا کرانا چاہیئے اور اس کے ساتھ دو سوشلسٹ نوجوانوں کامریڈ موہن لال اور کامریڈ مبارک ساغر کو بھی اُنہیں بھی شہید گنج ہی کے ضمن میں قید ہوئی ہے۔ قائداعظم نے ان کے مقدمے کی نوعیت پوچھی ہم نے واقعات بیان کئے کہ انہوں نے حکومت پر الزام دھرا تھا کہ شہید گنج کے انہدام کی وہ ذمہ دار ہے اور آئندہ انتخابات کو اپنی مرضی کے مطابق لڑنے کے لئے اُس نے یہ ناٹک رچایا ہے۔ قائداعظم نے ان نوجوانوں کے بیانات کی نقلیں منگوائیں مقدمہ کے دوسرے کاغذات دیکھے پھر حامی بھر لی۔ چنانچہ یعسوب کے ساتھ ان کی رہائی کے احکام بھی اسی روز جاری ہو گئے۔

مولانا ظفر علی خان احکام نظر بندی کی تنسیخ کے کوئی چار روز بعد لاہور پہنچے باقی تمام نظر بند رہا ہو کر فوراً ہی لاہور چلے آئے کچھ دنوں کے لئے چہل پہل ہو گئی۔ "زمیندار" اس وقت بند پڑا تھا جاری ہو گیا۔ دفتر زمیندار میں اتحاد ملت کی تشکیل نو کی گئی۔ مولانا ظفر علی خان صدر منتخب ہوئے حاضرین نے اتفاق رائے سے سید حبیب کو جنرل سیکرٹری منتخب کیا۔ مولانا ظفر علی خان راضی نہ ہوتے انہوں نے شاہ صاحب

کی جگہ ملک لال خان کو جنرل سیکرٹری بنوایا۔ شاہ صاحب ناراض ہو کر چلے گئے اور حسبِ سابق مولانا ظفر علی خان کے خلاف لکھنے لگے۔ مولانا "سیاست" کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ سید حبیب نے الزام لگایا کہ موجودہ انتخاب میرزا معراج الدین کے ایما سے ہوا ہے اور مولانا ظفر علی خان کے گرد وہ لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ جن میں سے اکثر معراج الدین سے ہدایات حاصل کرتے ہیں ——— مولانا کے لئے کوئی سا الزام بھی قابل اعتنا نہ تھا انھوں نے ایک ورکنگ کمیٹی بنائی جس میں مولانا عبد القادر قصوری اور ڈاکٹر شیخ محمد عالم بھی شامل تھے لیکن دونو کا ذہن کانگرسی تھا میاں فیروز الدین احمد مسلم لیگ کے تھے۔ ملک لال خان کا اپنا کوئی ذہن نہ تھا مولانا محمد اسحاق مانسہروی کو احرار سے سخت عناد تھا۔ خدا بخش اظہر، ابو سعید انور اور مصطفیٰ شاہ گیلانی کا اور چھور یہ تھا کہ مولانا ظفر علی خان کے عقیدت مند تھے میں بھی تھا اور یعسوب بھی ظاہر ہے کہ ہم دونو مولانا ظفر علی خان سے انتہائی عقیدت رکھتے تھے ہمارا ذہن اصلاً انقلابی تھا۔ ہمارے علاوہ ورکنگ کمیٹی میں مولانا کے بھائی چودھری غلام حیدر ان کے بیٹے مولانا اختر علی خان بھی شامل تھے ——— اس مجموعہ اضداد نے جو کارنامے سر انجام دئے اُن کا ذکر اس کتاب کا حصّہ نہیں جو کچھ ہوا ایک طربیہ افسانے اور خزینہ ناول سے کم نہیں میں نے اپنی سرگذشت بوئے گل نالہ دل دُودِ چراغ محفل میں اسکی تفصیلات قلم بند کی ہیں ———

احرار نے جو شہید گنج کے ہاتھوں پٹ گئے تھے مولانا ظفر علی خان اور اُن کے رفقاء کو ہدف مطاعن بنانا شروع کیا جلال دین نام کا ایک درزی انار کلی میں بمبئی کلاتھ ہاؤس کی پشت پر خیاطی کی دوکان کرتا تھا۔ اُس نے خاصا روپیہ کمایا اور اب "نیرنگ" نام کا ایک روزنامہ نکال رہا تھا۔ ادارہ "زمیندار" کے کچھ سابقہ ارکان بھی اُس کے عملہ میں تھے۔ ان لوگوں نے مولانا ظفر علی خان اتحاد ملّت اور ہم ایسے نوجوانوں کو جو تقریر کے میدان میں بڑھ رہے تھے قلم سے زخم پہنچانا شروع کئے۔

پولیس میں خاروخس

میں جو اس تحریک میں اچانک آ شامل ہوا تھا عجیب و غریب چیزیں دیکھ رہا تھا۔ کئی چہروں سے نقابیں اُتر رہی تھیں انگریزوں کے پروردہ سرکاری مسلمان جو آزادی آگئی تو آزادی کے علمبردار بن گئے۔ ہمیشہ ہی سے مسلمانوں کی عزتِ نفس کے بیوپاری تھے۔ انگریزوں کے ادنےٰ اشارے پر مسلمانوں کے بڑے سے بڑے مؤقف کو چھوڑ جاتے، ملازمین کا معاملہ ان سے بھی گیا گزرا تھا اُن میں کچھ سچے دل کے بھی تھے مگر جب انگریز کا سوال آتا تو اُس کے کسی اشارے سے سرتابی کا سوچ ہی نہ سکتے تھے۔ پولیس میں خاروخس عام تھے اور سی آئی ڈی کے خطاب یافتہ افسر تو اِلّا ماشاء اللہ اپنی ذاتی اور خاندانی ترقی کے لئے ہر معرکہ سرانجام دینے پر تیار رہتے۔ پنجاب میں احرارؔ انگریز دشمن طاقتوں کا ایک فعال گروہ تھے مگر شہید گنج میں مار کھا گئے اب جو عناصر اتحاد ملت میں جمع تھے ان میں کانگرسی ذہن رکھنے والے بھی حصولِ مسجد کی بجائے رسوائی احرار کے لئے کوشاں تھے۔ اتحاد ملت کا پورا کنبہ سرکاری افسروں کی جیب میں تھا اور مولانا ظفر علی خان بالواسطہ انہی کے ہاتھوں میں تھے۔ میں جو اس کوچہ میں بالکل ہی نووارد تھا اور محض جذبے کی بنا پر چلا آیا تھا یہ سارا تماشا دیکھ کر حیران ہو رہا تھا ——— ذہناً دور رہا پر تھا فائدہ یہ پہنچا کہ میرا ملکۂ خطابت منجھ گیا۔ ایک روز میاں فیروزدین نے مجھ سے کہا آج رات میرے ساتھ میرزا معراج دین کے ہاں چلنا وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔ مَیں نے انکار کر دیا میاں صاحب نے کہا دشمنی مول لینے سے کوئی فائدہ نہیں وہ اچھا آدمی ہے ذرا مل لینا اور مل لینے میں کیا حرج ہے۔ غرض مَیں ان کے ہاں میاں صاحب کی معیت میں حاضر ہو گیا ——— لیکن ان کی باتوں سے متفق نہ ہو سکا مَیں تنگی ترشی کے دن گزار رہا تھا۔ مگر کسی کی پھوٹی کوڑی کا روادار نہ تھا۔ جماعتی فنڈ سے امداد لینا گناہ کبیرہ سمجھتا میرزا معراج دین کا آلہ کار بنا یا اس کی اِسلام دوستی کے آگے جُھکنا میرے نزدیک کنچن بن

جانے سے بھی فروتر تھا۔ میرزا صاحب نے ڈرایا بھی اور دھمکایا بھی مگر لاحاصل مَیں اپنی رعونت لے کر واپس آگیا۔ کوئی ہفتہ بعد مَیں نے راولپنڈی سے انبالے تک دورہ کیا ہر جگہ جلسے ہوئے میرزا صاحب کا نام لے کر اُنہیں آڑے ہاتھوں لیا لیکن وہ ہضم کر گئے۔ وہ منتقم، ہوشیار، مستعد اور جاں نثار افسر تھے ——— اُن کی انگریزوں سے وفاداری کا یہ حال تھا کہ ترکی میں خصوصی خدمات انجام دے آئے تھے مثلاً مصطفیٰ اکمال کو قتل کرنے کی برطانوی سازش میں مصطفیٰ صغیر کے مشیر رہ چکے تھے انہی خدمات کے صلے میں حکومت نے اُنہیں او بی ای کا خطاب دیا تھا ———

جلال الدین درزی

میرزا صاحب نے روزنامہ نیرنگ کے مالک جلال الدین درزی کو تھپکی دی۔ وہ میرے خلاف جو کچھ بھی لکھ سکتا تھا لکھتا رہا مَیں نے لاہور کے ایک جلسہ عام میں اس کا ذکر کرتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ بچپن کا جوش تھا کچھ سخت سست کلمات بھی نکل گئے میرزا صاحب نے جلال دین کو تیار کیا اس تقریر کی بناء پر میرے خلاف ۳۰۲/۷، ۱۱ کا مقدمہ قائم ہو گیا برطانوی عہد میں حکومت کا یہ حربہ رہا کہ کسی نوجوان کو سیاسی زندگی میں اُبھرنے نہ دو اُبھرنے لگے تو صرفِ نظر سے کام لو جب اس سے بھی بات نکل جائے تو خریدنے کی کوشش کرو خریدنے میں ناکامی ہو تو بدنام کرو بدنامی کارگر نہ ہو تو پھر عذاب و ابتلا میں مبتلا کر دو۔ سرکاری گماشتے کسی شخص کو بھی آسانی سے پولیٹیکل فیگر POLITICAL FIGURE سیاسی آدمی بننے نہ دیتے تھے۔ ان حربوں کے بعد سیاسی مقدمے چلائے جاتے اور تعزیرات کی اُن دفعات کو استعمال کیا جاتا جو ایک شخص کے اعتراف وجود کی دلیل سمجھی جاتی تھیں۔ پنجاب کی سیاسی زندگی میں اکثر یہی ہوتا رہا یہاں مسلمانوں میں کوئی سی انقلابی تحریک نہ چل سکی۔ سی آئی ڈی کے مسلمان افسروں کی اکثریت کا یہ چلن رہا کہ وہ اُبھرتے ہوئے مسلمان نوجوانوں کو روکیں، نہ رکیں تو لالچ دیں، لالچ سے نہ مانیں، تو ذلیل

کریں یہ حربہ فائدہ مند نہ ہو تو مسلمان عوام کی نگاہوں سے گرادیں، تاکہ ان کی ہمدردیوں سے محروم ہوجائیں۔ ان افسروں کا سارا ریکارڈ یہ رہا ہے کہ انہوں نے بے شمار مسلمان نوجوانوں کو بھگا دیا یا پھر انہیں مخبر بنا کر ہم چشموں میں ان کے اعتماد کو آگ لگادی۔ اس طرح یہ لوگ خود ترقیاں کرتے رہے مگر مسلمانوں کی قومی سیرت کا اجتماعی جوُ زخمی ہوتا رہا۔ وہ نوجوان جو کسی کمزوری کے باعث مخبر ہوجاتے مطلب نکل جاتا تو اُن سے یہ افسر اسی طرح آنکھیں پھیر لیتے جس طرح شب کے سوداگر دن چڑھے بیسوا کے بستر کو چھوڑ جاتے ہیں۔

دوبارہ گرفتاری

یہ ۱۹۳۶ء کے کسی مہینے کا ذکر ہے کہ مجھے دوبارہ گرفتار کیا گیا رات بھر حوالات میں رکھا دوسرے دن بورسٹل جیل بھجوا دیا۔ مَیں نے اپنی عمر زائد بتائی تو اگلے ہی روز سنٹرل جیل منتقل ہوگیا ـــــــ یہ میرے لئے ایک نئے باب کا آغاز تھا مَیں بورسٹل جیل میں اس لئے رہنا نہیں چاہتا تھا کہ تجربہ کی بنا پر مجھے اس سے گھن آتی تھی۔ جو دوست سنٹرل جیل میں رہ آئے تھے وہ اسکی مردانہ فضا کے معترف تھے۔ مجھے خود پہلے دن ہی اس کا احساس ہوگیا یہاں سی آئی ڈی کی دال ہی نہ گلتی تھی وجہ یہ تھی کہ سپرنٹنڈنٹ کرنل ایس ڈی سوندھی آئی ایم ایس تھا اس کے والد رائے زادہ ہنسراج سوندھی کانگریس کے مشہور لیڈر تھے وہ ضابطہ میں ڈھل کر ضابطہ کے لئے بنا تھا مجھے احاطہ اوّل کے عام حوالاتیوں میں رکھا گیا وہاں مختلف مقدموں میں ماخوذ لاہور کے کچھ اور شناسا چہرے بھی مل گئے۔ ان لوگوں نے میرے آرام میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ دیوان برہم ناتھ مجسٹریٹ درجہ اوّل کی عدالت میں مقدمہ تھا ضمانت کا سوال اُٹھایا گیا تو پولیس نے مخالفت کی، سنگین دفعہ تھی مجسٹریٹ نے درخواست مسترد کردی' بہتر کلاس کے لئے کہا گیا تو سی آئی ڈی کے سب انسپکٹر نے سختی سے مخالفت کی، اسکی اوچھی باتوں پر حقارت سے مسکراتے ہوئے دیوان صاحب نے کہا ـــــــ "اچھا جانے دیجیے یہ بہتر کلاس کا مُطالبہ

نہیں کریں گے"

میری طرف سے خلیفہ شجاع الدین (بار ایٹ لا) اور مسٹر اے حمید بیرسٹر پیروکار تھے۔ استغاثہ کی کہانی یہ تھی کہ مَیں نے اپنی تقریر میں لوگوں کو جلال دین درزی مالک روزنامہ "نیرنگ" کے قتل پر اُبھارا ہے یعنی حاضرین سے کہا ہے کہ وہ اس کو جاکر مار دیں ——— سب سے پہلے سی آئی ڈی کے مختصر نویس آغا رشید احمد سب انسپکٹر نے تقریر کا متن پڑھ کر سنایا۔ دیوان صاحب نے کہا تقریر تو مرتکبہ ۱۲۴/الف کی زد میں آتی ہے لیکن حیرت ہے کہ حکومت نے اس پر اعتراض نہیں کیا مگر ایک ایسے فقرے کو پکڑ لیا ہے جو ایک شہری کے متعلق ہے۔ استغاثہ نے جو گواہ پیش کئے ان میں جلال دین درزی تو ابتدائی جرح ہی میں رہ گیا۔ اُس نے اپنے بیان کے مضمرات میں تسلیم کیا کہ اس سے یہ مقدمہ بنوایا گیا ہے۔ ایک زمانہ میں دادا مرحوم کے ہاں ایک نوکر تھا ہدایت شاہ، وہ جتنا جھوٹ بول سکتا تھا بول گیا، ایک دو اور گواہ پیش ہوئے۔ سب نے قسمیں کھا کھا کر جھوٹ بولا۔ واقعہ یہ ہے کہ مَیں نے جلال دین کا ذکر تو کیا تھا لیکن اُسے قتل کر دینے یا مار دینے کا نہیں کہا تھا۔ کئی سال بعد جب آغا رشید ریٹائر ہو گئے تو انہوں نے تسلیم کیا کہ ان الفاظ کا اضافہ انہوں نے معراج دین کے ایماء پر کیا تھا۔ کیونکہ میرزا صاحب خواہاں تھے۔ منشی محمد ابراہیم پیسہ اخبار میں نگینہ ہوٹل کرتے تھے ان کے صاحبزادے غازی محمد اسحاق خاکسار تحریک کے سالار رہے اور ہمارے ساتھ شہید گنج میں قید ہوئے تھے۔ بڑے ہی زندہ دل اور بہادر نوجوان تھے۔ ان منشی محمد ابراہیم کو پولیس نے محلہ کا چودھری بنا رکھا تھا بڑے بڑے مقدموں کی تفتیش میں پولیس کے مددگار ہوتے۔ انہیں بے شمار سارٹیفکیٹ ملے ہوئے تھے پولیس کو یقین تھا کہ جو چاہے گی ان سے کہلوا لے گی۔ جب انہیں میرے خلاف شہادت دینے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے عذر کیا کہ

اولاً وہ اس جلسے میں شریک نہیں تھے۔

ثانیاً ایک بچہ جو اُن کے بیٹے کا ہم عمر اور دوست ہے اُس کے خلاف شہادت دینے سے نہ صرف

ان کی رسوائی ہوگی بلکہ ضمیر بھی ملامت کرتا رہے گا ـــــــ

یہ انکار منشی جی کے لئے عذاب ہوگیا اُن سے تمام سرٹیفکیٹ چھین لئے گئے پولیس نے اُن سے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔ دیر تک ڈراتے دھمکاتے رہے لیکن انہوں نے اپنا فیصلہ منسوخ نہ کیا یہی کہتے رہے کہ اپنے ہی بچے کے خلاف وہ جھوٹی شہادت کیونکر دے سکتے ہیں۔ اس کے بعد پولیس نے کبھی ان سے رابطہ پیدا نہ کیا بلکہ منتقم ہوگئی۔ حتیٰ کہ ان کا وسیع ہوٹل برباد کر دیا۔ انہوں نے یہ سب کچھ صبر و شکر سے برداشت کیا لیکن کیا وہی جس کا فیصلہ اُن کے ضمیر نے کیا تھا ـــــــ

عدالت میں

دیوان برہم ناتھ نے ایک دن عدالت کو پولیس افسروں سے خالی پایا تو مجھ سے مقدمہ کا پس منظر پوچھا مَیں نے تمام قصہ بیان کر ڈالا بڑا متاثر ہوا بلکہ دکھ محسوس کیا کہ کوئی نوجوان ہتھے نہ چڑھے تو سی آئی ڈی والے اس حد تک منتقم ہو جاتے ہیں ـــــــ اُس نے کہا گھبراؤ نہیں معاملہ کی تہہ تک پہنچ گیا ہوں تم سے انصاف ہوگا ـــــــ اور ضرور ہوگا۔ خلیفہ شجاع الدین کی بحث کے بعد عدالت نے ۱۱/۷/۳۰۲ کو توڑ دیا کوئی ہلکی سی دفعہ لگا دی اور دو ہزار کی حاضر ضمانت پر تا سماعت مقدمہ مجھے رہا کر دیا۔ آغا بیدار بخت خان نے ضمانت دی آغا صاحب ہر پیشی پر موجود ہوتے دیوان برہم ناتھ استغاثہ کی زنجیریں توڑنے کے لئے انہیں صفائی کی راہیں بتاتے۔ سی آئی ڈی کے عمر و عیار بھی سمجھ گئے تھے کہ ان کا وار خالی جا رہا ہے انہوں نے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے مگر تیر ان کے ترکش میں نہیں تھا ڈپٹی کمشنر نے مجسٹریٹ کو اشارہ کیا مگر چونکہ انگریز تھا لہٰذا جوڈیشری میں واضح مداخلت کو عیب سمجھتا جب سی آئی ڈی کو یقین ہوگیا کہ مجسٹریٹ کا ذہن میری طرف راجع ہے تو میرزا صاحب نے فیروز الدین احمد کو بلایا اور کہا کہ وہ شورش کے معاملہ میں منتقم نہیں۔ اس سے کہو آئندہ زبان قابو میں رکھے وعدہ کرلے تو ہم اس مقدمہ میں اُسے چھڑا دینے کے لیے

تیار ہیں ؛ میاں صاحب پیغام لائے تو میں نے ہر چہ بادا باد کہہ کر ٹال دیا ان سے کہا کہ اس قسم کے سمجھوتوں سے نہ تو اپنی سیاسی زندگی مجروح کرنا چاہتا ہوں اور نہ مجھے میرزا صاحب سے دوستی پیدا کرنے کی خواہش ہے ———

میاں صاحب میرے معاملہ میں غالباً مخلص تھے اور سمجھتے تھے کہ جب کوئی پولیس افسر ضدی ہو جاتا ہے تو معتوب نوجوان کی زندگی کیونکر ضائع ہوتی ہے۔ وہ اپنی سی کوشش کرتے رہے مگر میں ان ناصحوں کی دسترس سے باہر تھا۔ آخر فیصلے کی تاریخ آگئی۔ سب انسپکٹر جو اس مقدمہ میں سی آئی ڈی کی طرف سے نگران تھا شرط باندھتا رہا کہ چھ ماہ قید ہوگی اور ضرور ہوگی ہم کچھ نہ کہنے کی پوزیشن میں تھے ——— زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے تھے کہ دیوان برہم ناتھ پر پولیس کا کوئی اثر نہیں وہ جو فیصلہ کرے گا اس کا اپنا فیصلہ ہوگا یوں بھی وہ اعلیٰ خون کا خاندانی انسان تھا۔ غالباً راجہ نریندر ناتھ کا بھانجا یا بھتیجا تھا۔ اس کے بہت سے رشتہ دار اعلیٰ عہدوں پر مامور تھے۔ وہ نوکری کو نوکری کے لئے نہیں کر رہا تھا بلکہ اپنے لئے ایک مصروفیت پیدا کرلی تھی۔ فیصلہ لکھنے یا حکم سنانے سے پہلے وہ دو دفعہ ڈپٹی کمشنر کے پاس گیا کچہری بند ہونے کے وقت، کوئی چار بجے کے لگ بھگ، اُس نے فیصلہ سنایا کہ

"ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۵۶۲ کے تحت ایک سال کے لئے دو ہزار روپے کی ضمانت پر آپ کو رہا کیا جاتا ہے ———"

قدرتاً ہم سب دوستوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اندازاً ہم یہی سمجھتے تھے۔

تجربہ کی خشتِ اوّل

ان دِنوں تمام ملک میں صوبجاتی خود مختاری کے تحت جنرل انتخابات (۱۹۳۷ء) کی تیاری کا چرچا ہو رہا تھا۔ کانگرس نے بھی لنگوٹ کس رکھا تھا۔ لیگ کو بھی قائداعظمؒ زندہ کر رہے تھے۔ پنجاب میں

یونی نسٹ پارٹی کا بول بالا تھا میں نے محسوس کیا کہ شہید گنج کی اینٹیں ووٹوں کے حصول میں استعمال ہو رہی ہیں۔ مولانا ظفر علی خانؒ کے قلم اور زبان پر تو شہید گنج ہی کا نام تھا مگر اُن کے ساتھ جو لوگ تھے وہ اپنے ہی مقاصد کی راہ پر تھے۔ محسوس ہوتا تھا جیسے ان کا مشن احرار کو گالی دینا رہ گیا ہے یا پھر وہ اسمبلی میں ممبر منتخب ہونے کے لئے جوڑ توڑ کر رہے ہیں۔ کسی امیدوار کے سامنے اصلاً شہید گنج کی بازیابی کا مطالبہ نہ تھا (الا ماشاء اللہ) ہو سکتا ہے کسی کو اس خیال سے اختلاف ہو لیکن مَیں کم از کم یہی محسوس کر رہا تھا۔ نتیجہ بھی یہی نکلا مَیں عمر کی اس منزل میں تھا کہ اس وقت لیڈروں کے ان ہتھکنڈوں یا مصلحتوں سے بالکل ہی ناواقف تھا۔

ناگفتنی و گفتنی

جوں جوں حالات کرِ کرِ کر سامنے آتے گئے توں توں میرا استعجاب بڑھتا گیا اور مَیں سوچ کے دائرے بناتا رہا۔ مولانا ظفر علی خان گھومتے پھرتے رنگون چلے گئے لوٹے' تو انتخابی معرکوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ جو روپیہ اکٹھا کر کے لائے جنرل سکریٹری نے سنبھال لیا۔ اِدھر ہم شہید گنج کانفرنس کی تیاریاں کر چکے تھے۔ طے پایا کہ مولانا حسرت موہانی کو صدارت کے لئے آمادہ کریں۔ وہ کسی وجہ سے راضی نہ ہوئے اُن کی جگہ مولانا شوکت علی کو صدر بنایا گیا۔ لاہور میں ان کا تاریخی جلوس نکلا۔ کانفرنس اس ٹھاٹھ سے ہوئی کہ ٹکٹ لگا کر بھی ہزارہا انسانوں کا مجمع ہو گیا۔ نتائج نے ہمیں سخت مایوس کیا —— مجھے ایک روز پہلے بعض سربستہ راز معلوم ہو چکے تھے یہاں تک کہ کانفرنس میں پیش ہونے والی قرار دادوں کے متن سے بھی آگاہ تھا۔ میرے علم میں تھا کہ فلاں فلاں قرارداد کا مسودہ فلاں سپرنٹنڈنٹ پولیس نے تیار کیا ہے اور اتنی رقم کانفرنس کے نام پر فلاں راہنما نے حاصل کی ہے۔ اب جو کانفرنس میں یہی نقشہ جمنے لگا تو آنکھیں کھُلیں۔ اتحاد ملت کا نوجوان گروپ سول نافرمانی کا تہیہ کئے بیٹھا اور حکومت سے ٹکر لینے پر تیار تھا۔ گورنر کا

خیال تھا کہ پنجابی مسلمانوں کو اپنے پشتینی وفاداروں کی معرفت رام کرے گا اور معاملہ صرف احرار کی بربادی تک رہے گا جو سرکار و استعمار کے دل کا کانٹا بنے ہوتے تھے مگر مسلمان عوام اور مسلمان خواص میں فرق تھا۔ شہید گنج نے احرار کو واقعی برباد کر دیا لیکن یہ سانحہ سرکار کے لئے بھی دردِ سر ہو گیا۔ اب صوبائی حکومت کے اعضاء و جوارح اس فکر میں تھے کہ انتخاب میں شہید گنج کا انہدام احرار کے خلاف استعمال ہو۔ مگر اس طرح کہ حکومت کے لئے پریشانی نہ ہو۔ سی آئی ڈی کو ہم نوجوانوں کے ارادوں کا علم تھا۔ اس کا مفروضہ تھا کہ ہم نے اتحادِ ملت کی لیڈر شپ کے خلاف ہنگامہ کیا تو جو نقصان ہو گا اس کا فائدہ احرار کو پہنچے گا۔ سی آئی ڈی کے حکام نے اپنے طور پر اتحادِ ملت کے بزرگوں کو بھی مطلع کر دیا وہ ہمیں راضی کرنے کی فکر میں تھے چنانچہ کانفرنس کے شروع میں یہ تمام راہنما ہمارے ٹینٹ میں تشریف لائے اور زور دیتے رہے کہ ہم سول نافرمانی کا خیال چھوڑ دیں۔ ایک بزرگ نے کہا حکومت سے ٹکر لینے میں کوئی فائدہ نہیں اُلٹا نقصان ہے۔ پولیس تیار بیٹھی ہے جونہی اس قسم کا کوئی فیصلہ کیا گیا تو ہم سب فوراً ہی گرفتار کر لئے جائیں گے پھر جو تباہی ہو گی اس کا آپ کو اندازہ نہیں وغیرہ۔

مَیں نے عرض کیا کہ یہ کوئی جواں مردی نہیں کہ مسجد کے نام پر بے گناہ مسلمانوں کو مروا کر اُنکے لہو کی اساس پر انتخاب لڑا جائے اور شہید گنج کو یکسر بھول جائیں —— ڈاکٹر عالم نے وکیلانہ موشگافیوں سے کام لینا شروع کیا فرمایا جب تک مقدمہ عدالت میں ہے سول نافرمانی نقصان دہ ہے بلکہ فیصلہ کے راستہ میں مانع ہو گی۔ انتخاب میں حصّہ لینے کا مطلب ہے کہ ہم اسمبلی میں جا کر اپنے ہمنوا پیدا کریں اور مسجد کی بازیابی کے لئے قانون بنوائیں۔ ان باتوں کا ہم پر کیا اثر ہوتا؟ ہمیں پس منظر ہی معلوم تھا۔ یہی مناسب سمجھا کہ ڈاکٹر صاحب کو مخاطب نہ کریں مولانا سے مخاطب ہو کر عرض کیا کہ یہ لوگ شہید گنج کے دوست نہیں، اپنی ذات کے دوست ہیں۔ مَیں یہ عرض ہی کر رہا تھا کہ مولانا اختر علی خان نے چونک کر فرمایا اس کا مطلب ہے کہ مولانا ظفر علی خان اس بڑھاپے میں جیل چلے جائیں اور وہاں مر جائیں۔ "زمیندار" بند ہو جائے

ان کی اولاد وزیر آباد جاکر کوئلہ کی دوکان کھول لے۔ گدائی کرتی پھرے ——— یہ کوئی دلیل نہ تھی اور نہ اختر علی خان کی اس جذباتی شعبدہ بازی کا کوئی جواب تھا اور نہ ہم اس بحث ہی کو جاری رکھ سکتے تھے۔ ہم نے مولانا ظفر علی خان سے عرض کیا ہم نوجوان آپ کو اپنے خون سے لکھ کر دے رہے ہیں کہ حصولِ مسجد کے لئے ہماری جانیں بھی حاضر ہیں۔ بازیابی کے سلسلہ کو کھٹائی میں ڈالنا نامناسب ہوگا اور یہ گناہ کبیرہ ہے کہ ہم شہید گنج کی اینٹوں کو انتخاب کے لئے استعمال کریں

دل کے داغ

محفل بے نتیجہ برخاست ہوگئی ایک ایک راز کھل کر سامنے آرہا قرار دادوں کا وہی متن تھا جو ہمارے علم میں تھا۔ محرک اور موید بھی وہی تھے جو سرکار نے مقرر کئے تھے۔ دوغلہ پن کے عجیب نظارے تھے بعض ارکان ہمیں دیکھتے تو ہمارے ساتھ ہو جاتے۔ مولانا ظفر علی خان سامنے آتے تو انکے اشارۂ ابرو پر قربان ہوتے آخری اجلاس میں ڈاکٹر عالم نے اپنی قرارداد پیش کرتے ہوئے دھواں دار تقریر کی، مقرر وہ بہت اچھے تھے لوگوں کو شیشے میں اُتارنا انہیں خوب آتا تھا۔

قرار داد میں درج تھا کہ مجلس اتحاد ملت شہید گنج کے حصول کی خاطر انتخاب میں حصہ لینے کا فیصلہ کرتی اور اس وقت تک راست اقدام کی ہر تجویز کو ملتوی رکھتی ہے جب تک انتخابات نہیں ہو جاتے یا عدالتی کارروائی کا فیصلہ نہیں ہوتا۔

اس قرار داد سے لوگوں میں زبردست مایوسی پیدا ہوئی ہم نے یعسوب کو آگے کیا اُس نے قرارداد کی مخالفت میں ایک زوردار تقریر کی تو مجمع اس کے ساتھ ہو گیا اس نے کہا ہم شہید گنج کی اینٹوں اور شہیدوں کے خون کو انتخاب میں ہرگز ہرگز استعمال نہ ہونے دیں گے یعسوب کے بعد ابوسعید انور اور آخر میں ——— مَیں نے تقریر کی۔ لوگوں میں ایک آگ سی لگ گئی عجب نہ تھا کہ پنڈال ہی اُلٹا دیا جاتا

مگر مولانا ظفر علی خان کی ایک انتہائی خوبصورت، ادبی، جذباتی اور اسلامی تقریر نے ہمارے احتجاج پر پانی پھیر دیا حاضرین تقسیم ہو کر رہ گئے۔ ملک لال خان نے کرائے کے دس بارہ رضا کار ہمیں مطعون کرنے کے لئے کھڑے کر دیئے۔ ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کانفرنس دوسرے دن پر ملتوی ہو گئی۔ ہم نے آپس میں فیصلہ کیا کہ سبھی لیڈر باران دیدہ ہیں اور جو حالات انہوں نے پیدا کئے ہیں ان پر قابو پانا ہمارے بس میں نہیں، بہتر ہو گا کہ احتجاجاً کانفرنس کے سارے نگر ہی کو آگ لگا دیں۔ موچی دروازے سے لے کر اکبری دروازہ تک ایک پورا شہر آباد تھا۔ باغ کے دو رویہ کیمپ ہی کیمپ گڑے تھے ——— تمام دوست میری اس تجویز سے متفق ہو گئے اور ہم نے دو بجے رات یہ تماشا رچا دینے کا فیصلہ کر لیا لیکن ہمارے ہی ایک ساتھی نے جو ملتان سے مندوب تھا مولانا ظفر علی خان کو مطلع کر دیا جس سے بڑے لیڈر چوکنا ہو گئے کوئی ڈیڑھ بجے شب ملک لال خان میاں فیروز الدین احمد اور بعض دوسرے لوگ اجنبی چہروں کی ایک کھیپ لے کر پنڈال پر قابض ہو گئے ان میں بہت سے پولیس کنسٹیبل بھی تھے جو سفید لباس میں رضاکاروں کی حیثیت سے آئے تھے میاں فیروز الدین خاکسار دوستوں کا ایک دستہ لیکر ہمارے کیمپ میں آ بیٹھے دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے فرمایا کہ آپ لوگ غلط باتیں سوچ رہے ہیں مولانا ظفر علی خان کو پنڈال میں آگ لگا دینے کی تجویز کا علم ہو چکا ہے اور یہ سب جوابی انتظامات آپ لوگوں کے خطرے کی وجہ سے کیئے گئے ہیں غرض اس طرح ہماری یہ اسکیم پروان نہ چڑھی اور کانفرنس طے شدہ قرار دادوں کے مطابق "بخیر و خوبی" ختم ہو گئی۔ میرا دل اس کے بعد اُچاٹ ہو گیا میں نے خانہ نشینی اختیار کر لی۔ میرے سامنے مطالعہ کا وسیع میدان تھا کتابوں میں ڈوب گیا خیالات شروع ہی سے قومی تحریک کی طرف تھے۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ کے "الہلال" سے بُری طرح متاثر تھا۔ علامہ اقبالؒ کے کلام کا بھی طبیعت پر اثر تھا۔ خود مولانا ظفر علی خان شہید گنج کی ہنگامہ آرائی کے باوجود ابھی تک کانگرسی ذہن رکھتے تھے اور "زمیندار" متواتر کانگرس کی حمایت کر رہا تھا۔ ملک نصر اللہ خاں عزیز "مدینہ" کی ادارت سے سبکدوش ہو کر

"زمیندار" کے چیف ایڈیٹر ہو گئے اور کانگرس کی حمایت میں پیش پیش تھے ـــــــــــ

مَیں کچھ زیادہ عرصہ خانہ نشین نہ رہ سکا مولانا ظفر علی خاں باہر نکال لائے اِدھر مولانا عبدالقادر قصوری اور ڈاکٹر محمد عالم گردہو رہے تھے ان کا تقاضا تھا کہ الیکشن کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں قومی سیاسیات کا انحصار انتخاب کے نتائج پر ہے دونو ذہنًا کانگرسی تھے مَیں ان تجربوں کے باوجود نو عمر تھا سپر انداز ہو گیا پھر جہاں تہاں بن پڑا انتخاب میں حصّہ لیا مگر دل کھٹا ہوتا رہا کیونکہ ہر شخص قوم کے بجائے اپنی ذات سے متعلق سوچ رہا تھا ـــــــــــ

انتخابات ہو چکے تو نقشہ ہی بدل گیا احرار پٹ گئے جن امیدواروں نے شہید گنج کے حصول کا یقین دلایا تھا وہ کامیاب ہونے کے بعد طوطا چشم ہو گئے ۔ ان کے وعدے دوشیزہ کی کہہ مکرنیاں نکلے لیگ کے صرف دو امیدوار کامیاب ہوئے راجہ غضنفر علی خان اور ملک برکت علی، راجہ نے فورًا ہی یونی نسٹ پارٹی میں شرکت کر لی ۔ البتّہ ملک برکت علی نے مرتے دم تک لیگ کا پنڈ نہ چھوڑا ۔ ڈاکٹر عالم شہید گنج کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر کانگرس میں چلے گئے جب لوگوں نے راولپنڈی کے جلسہ عام میں ان پر اعتراض کیا تو فرمایا کہ کانگرس نے انہیں اپنا کر گویا شہید گنج کی بازیابی کا اصول مان لیا ہے انہوں نے لوگوں کو مغالطہ دیتے ہوئے کہا بے شک مَیں شہید گنج کے ٹکٹ پر منتخب ہوا ہوں لیکن کانگرس نے مجھے اپنا رکن بنا کر یہ تسلیم کر لیا ہے کہ میرے چناؤ کی بنیاد درست ہے ۔

تیسری گرفتاری

الیکشن گزرا تو کوئی لیڈر اتحادِ ملّت کا رخ نہ کرتا مولانا ظفر علی خان اکیلے رہ گئے سردار سکندر حیات نے ان کے بڑھاپے سے فائدہ اُٹھا کر زمیندار کی طغیانی کو روکا ۔ ملک برکت علی نے شہید گنج کی بازیابی کے لئے پنجاب اسمبلی میں قرار داد پیش کرنا چاہی تو سکندر حیات گھبرا گئے ۔ گورنر آڑے آ گیا اچانک ایک

ایسا پیچ پڑا کہ بل ہی رہ گیا تاہم کچھ دیر کے لئے شہید گنج سکندر حیات کے حلق کا کانٹا بن گئی۔ احرار نے شہید گنج ہی کی آڑ میں جوابی حملہ کیا سکندر حیات میری تقریروں سے ناخوش تھے انہوں نے مولانا ظفر علیخان سے شکایت کی۔ مولانا کچھ کرنے سے قاصر تھے میں نہ مانا سرکار نے جنڈیالہ گورو کی ایک تقریر کو لیکر میرے خلاف ۱۲۴/الف کا مقدمہ چلوا دیا۔ ضمانت ہونے تک میں دس بارہ روز امرتسر سب جیل میں رہا الزام تھا کہ میں نے ملک معظم کی حکومت کے خلاف لوگوں کو تشدد پر اُبھارا اور مسلمان نوجوانوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ بھگت سنگھ اور دت کی طرح بم بنائیں، پستول چلائیں کیونکہ جب تک وہ ٹیررسٹ نہیں بنیں گے اس وقت تک ان کی تقدیر نہیں بدلے گی انگریزی حکومت ہی کے خاتمہ پر اُن کی قومی زندگی کے احیاء کا انحصار ہے میں نے سکندر وزارت کو آڑے ہاتھوں لیا۔ کہ شہید گنج کی اینٹوں پر اپنی عمارت کھڑی کر کے یہ لوگ اس سانحہ ہی کو بھول گئے ہیں۔ میرا جی کڑھتا تھا کہ مسلمان نوجوانوں میں ایک ——— بھی انقلابی نہیں ——— اور جسارت و حرارت کے سارے ولولے ہندو نوجوانوں میں پائے جاتے ہیں چونکہ میں نومشق تھا اس لئے خطابت میں اگر مگر اور لیکن ولیکن کے پیوند لگانے سے بالکل ناواقف تھا۔ جو الفاظ میری تقریر میں موجود تھے وہ میں نے نہیں کہے تھے تاہم میرا جذبہ یہی تھا۔ مقدمے کا بننا تھا کہ اتحاد ملت کے سبھی راہنماؤں نے آنکھیں پھیر لیں وہ لوگ جو الیکشن میں بچھے جاتے تھے اب اُن کا سایہ بھی نہیں مل رہا تھا ———

ڈاکٹر عالم جو منت سماجت کر کے مجھے الیکشن میں ساتھ لئے پھرے تھے ایک دفعہ بھی مقدمہ میں پیش ہونے کے لئے تیار نہ ہوئے ضمانت اس طرح ہو گئی کہ پہلے دن جب مجھے گرفتار کر کے پنڈت وشنو بھگوان اے ڈی ایم کی عدالت میں پیش کیا گیا تو ڈاکٹر عالم کسی دوسرے مقدمہ میں وہاں موجود تھے میری طرف سے پیش ہو کر ضمانت کرا گئے لیکن ضمانت کا یہ حال تھا کہ اتحاد ملت کے کارکن نزدیک نہیں آتے تھے کوئی دو ہزار کی ضمانت دینے والا نہ تھا آخر شیخ غلام محی الدین جو

مقامی اتحادِ ملت کے کرتا دھرتا مجھے کسی طرح راضی ہو گئے اور میں دس بارہ روز اندر رہ کر باہر آگیا۔ یہ اس شہر کا حال تھا جو آئے دن میری تقریروں کا مشتاق رہا جہاں میرا اپنا گھر تھا میرا خاندان آباد تھا میرے دوستوں کا ہجوم تھا ــــــ والد اس لئے ناراض تھے کہ میں نے غلط راہ اختیار کی ہے اور اتحادِ ملت کے کارکن ضمانت دینے سے اس لئے رک گئے تھے کہ لاہور کے بڑے راہنماؤں کا اشارہ میرے خلاف تھا۔ وہ سردار سکندر حیات اور میرزا معراج دین کی خوشنودی کے تابع تھے۔

میں نے اس تنگدستی بلکہ فاقہ مستی کے زمانے میں بھی اپنا ہاتھ کسی شخص، ادارے یا فرد کے سامنے نہ پھیلایا اور آج جب اُن دنوں کی غیرت مندی کا خیال آتا ہے تو جی خوش ہوتا ہے کہ قدرت کاملہ انسان کو کیسی کیسی مشکلوں سے نکال کرلے جاتی ہے ــــــ

گزر بسر کا یہ حال تھا کہ روٹی گھر سے کھاتا کپڑا موٹا جھوٹا مل جاتا، جیب خرچ تھا نہیں، کچھ لوگ اشتہاروں کے مضمون لکھوا لیتے جس سے سفید پوشی کا بھرم قائم تھا۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو

امرتسر میں پیشی تھی میں لاہور میں تھا دفتر "زمیندار" میں پہنچا صبح کا وقت تھا اختر علی خان سے پانچ آنے کرایہ مانگا قرضِ حسنہ! ان دنوں بس کا یہی کرایہ تھا مگر ٹکا سا جواب ملا جی میں آزردہ بھی تھا اور شرمندہ بھی، ریلوے پولیس لائنز کے پاس کھڑا سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہو؟ عدالت سے غیر حاضر ہونے کا مطلب تھا ضمانت کی ضبطی یا منسوخی اور جیل میں واپسی، حسنِ اتفاق کہ ڈاکٹر سیف الدین کچلو اپنی کار میں جا رہے تھے مجھے دیکھا تو موٹر روک لی پوچھا یہاں کھڑے ہو؟ عرض کیا امرتسر مقدمہ کی پیشی ہے بس کا راستہ دیکھ رہا ہوں۔ بے بسی کا اظہار پھر بھی نہ کیا ڈاکٹر صاحب نے موٹر کا دروازہ کھول دیا ــــــ "آؤ میں بھی امرتسر جا رہا ہوں"۔ اندھے کو کیا چاہیئے دو آنکھیں، سوار ہو گیا ــــــ پوچھنے لگے پیروی کون کر رہا ہے

کوئی ہوتا تو کسی کا نام لیتا چپ ہو رہا آنکھیں ڈبڈبا گئیں فرمایا کن احمقوں میں پھنس گئے ہو؟ اچھا! تو میں پیش ہوں گا میں نے ڈاکٹر صاحب سے سارا قصہ کہہ ڈالا انہیں بہت دکھ ہوا انتخاب میں وہ بھی کامیاب ہوئے تھے مگر الیکشن ٹریبونل کی "مہربانی" سے نشست کھو بیٹھے تھے۔ میں نے ان کی حمایت و رفاقت میں کبھی کوئی کام نہ کیا تھا لیکن ان کے ادب و احترام کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ کبھی نہ چاہا کہ میرا نام ان کے خلاف استعمال ہو یا میرے قلم و زبان سے کوئی ایسی بات نکل جائے جو گستاخی میں شمار ہو۔

میں ان کے کیمپ میں نہیں تھا لیکن انہوں نے میرے ساتھ جو سلوک کیا میرے دل پر آج بھی نقش ہے عدالت میں بہ التزام تشریف لاتے، مقدمہ کی پیروی کرتے ساتھ لے جاتے، مدارات فرماتے، لاہور ہوتا تو امرتسر لے جاتے، امرتسر ہوتا تو لاہور لے آتے، اس معمول میں کبھی ناغہ نہ کیا۔ ایک روز کہیں باہر جا رہے تھے شیخ مسعود صادق کے والد شیخ محمد صادق کے ہاں لے گئے ان سے کہا کہ کل اسکی پیشی ہے میں ایک دن کے لئے باہر جا رہا ہوں ــــ تم پیش ہو جانا۔ شیخ صاحب بڑے ہی زندہ دل بزرگ تھے مجھے ساتھ لیکر عدالت میں پہنچے کسی گواہ پر جرح ہونی تھی کوئی غیر متعلق سوال کر دیا عدالت نے کہا شیخ صاحب معلوم ہوتا ہے آپ نے مقدمہ کا فائل ہی نہیں دیکھا؟ فائل دیکھا ہوتا تو مقدمہ کی روئیداد آپکے ذہن میں ہوتی آپ اس سے مختلف سوال کرتے؟ آپ کے سوالات کا نفس مقدمہ سے کوئی تعلق نہیں ہے ــــــــ شیخ صاحب نے فرمایا اس مقدمہ میں وکیل تو ڈاکٹر کچلو ہیں وہ کسی کام سے آج باہر گئے ہیں مجھے کہہ گئے تھے اس لئے چلا آیا ہوں وہ بھی کشمیری، ملزم بھی کشمیری، میں بھی کشمیری، اور آپ بھی کشمیری۔ نفس مقدمہ غیر کشمیری ہے لہذا اسے دیکھنے کا سوال ہی بے معنی تھا۔ وشنو بھگوان شیخ صاحب کے اس لطیفۂ شعری پر ہنس دیا اور جرح آئندہ پیشی پر اٹھا دی ــــــــ

ڈاکٹر کچلو نے ایک دن موقع پاکر وشنو بھگوان سے کہا کہ ملزم نوعمر ہے چھوڑ دو۔ مقدمہ کو طول دینے سے فائدہ؟ وشنو بھگوان کے دل میں ڈاکٹر صاحب کا بے حد احترام تھا کہنے لگا مسٹر

میکڈانلڈ (ڈپٹی کمشنر) مجھ سے دو دفعہ پوچھ چکے ہیں۔ صوبائی حکومت خاص دلچسپی لے رہی ہے وزارت رام ہو جائے تو مجھے آسانی ہو جائے گی یا پھر اس قسم کی شہادت ریکارڈ پر آنی چاہیئے جس سے یہ تردید ہوتی ہو کہ ملزم نے تشدد کی ترغیب دی ہے جو سرکاری گواہ پیش ہوتے ان میں سے ایک ہندو گواہ ہی راستی پر رہا اسکی شہادت کا نمایاں حصہ میرے حق میں تھا وشنو بھگوان نے مشورہ دیا کہ مولانا ظفر علی خان بحیثیت صدر شہادت دیں کہ ان کی جماعت مسلمانوں کی جماعت ہے جو حصولِ مسجد کے لئے بنائی گئی ہے اس کی جدوجہد عدم تشدد پر ہے شورش اس جماعت کا ذمہ دار رکن ہے۔ اس سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی اور نہ عقل سلیم مانتی ہے کہ ایک ایسی جماعت کے پلیٹ فارم سے اس نے مسلمان نوجوانوں کو یہ تلقین کی ہو کہ وہ حصول مسجد کے لئے بھگت سنگھ یا دت بن جائیں یہ لفظاً و معناً غلط ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے لاہور پہنچ کر مولانا سے ذکر کیا وہ راضی ہو گئے مگر شہادت کے روز انہوں نے کمال کیا عدالت نے سوال کیا کہ آپ عدم تشدد کے حامی ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا ———

"بالکل نہیں اگر مجھے حصولِ مسجد کے لئے تلوار اُٹھانی پڑے تو میں اس سے بھی گریز نہیں کروں گا۔"

عدالت نے پوچھا آپ کی جماعت اپنی جدوجہد میں عدم تشدد کی پابند ہے؟ انہوں نے اس کی بھی تردید کر دی۔ فرمایا ہم عدم تشدد کو اختیار کر کے مسلمانوں کو بزدل بنانے کے حامی نہیں ہیں ———

مجسٹریٹ خندہ لبی کے ساتھ سُنتا رہا ڈاکٹر صاحب نے شہادت ختم کر دی ——— مجسٹریٹ نے کہا آپ مقدمہ ہار گئے ہیں اس پر بھی ڈاکٹر صاحب نے مجسٹریٹ کو کسی نہ کسی طرح راضی کر لیا چونکہ مقدمہ کافی خراب ہو چکا تھا لہذا پانچسو جرمانہ اور تا اجلاس عدالت قید کی سزا کا طے ہو گیا۔ جس روز حکم سنانا تھا ڈاکٹر صاحب نے مجھے بُلوایا اور فیصلے سے مطلع کیا میں نے کہا ڈاکٹر صاحب

میرے پاس روپیہ کہاں؟ مسکرائے کہا جاؤ اندر والدہ سے لے لو۔ مَیں جھینپا خود اُٹھے اور پانچسو روپیہ لاکر میرے حوالے کیا فرمایا عدالت میں ادا کر دینا مَیں روپیہ لیکر کچہری چلا گیا ——— عدالت نے متبسّم لہجہ میں پوچھا تیار ہو؟ مَیں نے کہا کس لئے؟ جیل کے لئے؟ جس فیصلہ کا ڈاکٹر صاحب نے ذکر کیا تھا وہ میز پر لکھا پڑا تھا مَیں نے یہ خیال کئے بغیر کہ کورٹ انسپکٹر بھی موجود ہے جھٹ سے کہدیا مجھے تو ڈاکٹر صاحب نے پانچ سو روپے دیئے ہیں کہ جرمانہ ادا کر کے چلے آنا مجسٹریٹ پہلے تو سنجیدہ ہو گیا پھر ذرا رک کر مصنوعی طور پر ہنستے ہوئے بولا چار بجے شام فیصلہ سنایا جائے گا۔

ایک سال قید

اس نے اِفشائے راز کے فوراً بعد پہلا فیصلہ پھاڑ دیا دوسرا لکھا پھر چار بجے شام عدالت میں بلا کر ایک سال بامشقت قید کا حکم سنا دیا۔ مَیں نے پانچ سو روپے ڈاکٹر صاحب کو واپس بھجوا دیئے اور ہتھکڑیوں سے کھیلتا ہوا جیل چلا گیا امرتسر سب جیل محض ایک بندی خانہ تھا۔ اگلے روز مجھے لاہور سنٹرل جیل بھیج دیا گیا مَیں گاڑی سے اُترتے ہی دفتر "زمیندار" پہنچا جو راستہ میں پڑتا اور اسٹیشن سے نزدیک تھا۔ پاؤں میں بیڑیاں تھیں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں، مولانا ظفر علی خان اور مولانا اختر علی خان بڑے تپاک سے ملے مولانا نے فرمایا سکندر نے مقدمہ واپس لینے کا وعدہ کیا تھا افسوس ایفا نہیں کیا۔ خیر تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے مَیں نے کہا دن تھوڑے ہوں یا بہت ——— گزر ہی جائیں گے خدارا کسی کے سامنے مری رہائی کے لئے کشکول لے کر نہ جایئے" یہ آپ کی عظمت کے بھی خلاف ہے مُبادا کوئی یہ سمجھے کہ مَیں جیل سے گھبرا رہا ہوں مَیں سکون چاہتا ہوں اور قید ہی کے یہ دن میرا خیال ہے مجھے سکون دے سکیں گے غرض جو دوست وہاں موجود تھے ان سب سے ملا مولانا نے معانقہ فرمایا پھر بیڑیاں کھڑکھڑاتا اور ہتھکڑیاں جھنجھناتا سنٹرل جیل روانہ ہو گیا۔ مولانا نے

اگلے روز "زمیندار" میں ذیل کی نظم شائع کی، عنوان تھا ——— شورش کاشمیری کے نام ——— اس نظم نے میرا حوصلہ جوان کر دیا پھر جب مولانا کا دیوان چھپ کر سامنے آیا تو مرتب نے ان بوجھی مصلحتوں کے تحت نظم کا عنوان ہی بدل ڈالا ———

شورش کاشمیری کے نام

کیا حکومت نے چند دن کے لئے جو زنداں میں بند تجھ کو
تو شکر حق کر کہ راہِ حق میں پہنچ رہا ہے گزند تجھ کو

جس آزمائش میں پڑنے والے حیات جاوید پا چکے ہیں
اس امتحان کے لئے کیا ہے ترے خدا نے پسند تجھ کو

جو تجھ کو صیاد چھوڑ دیتا سمجھ کے صید زبوں تو کیا تھا
کشاں کشاں لے گئی چمن سے قفس تک اسکی کمند تجھ کو

وہی ہو انداز بسملی کا جو شیوہ ترک نیم جاں تھا
اگر کٹانا پڑے محمدؐ کے نام پر بند بند تجھ کو

زمیں کو لرزا فلک کو جکڑا عرب کو گرما عجم کو تڑپا
ملا ہے فطرت کی ارجمندی سے دل اگر دردمند تجھ کو

حسینؑ کا سر ہے آسماں پر کہ رہ چکا تھا کبھی سناں پر
تو کم سے کم سر بکف تو ہو جا جو سر ہے کرنا بلند تجھ کو

بھرا ہوا زہر کا پیالہ جو آگے آئے تو اِس طرح پی
کہ گھول کر گویا دے رہا ہے حریف ساغر میں قند تجھ کو'

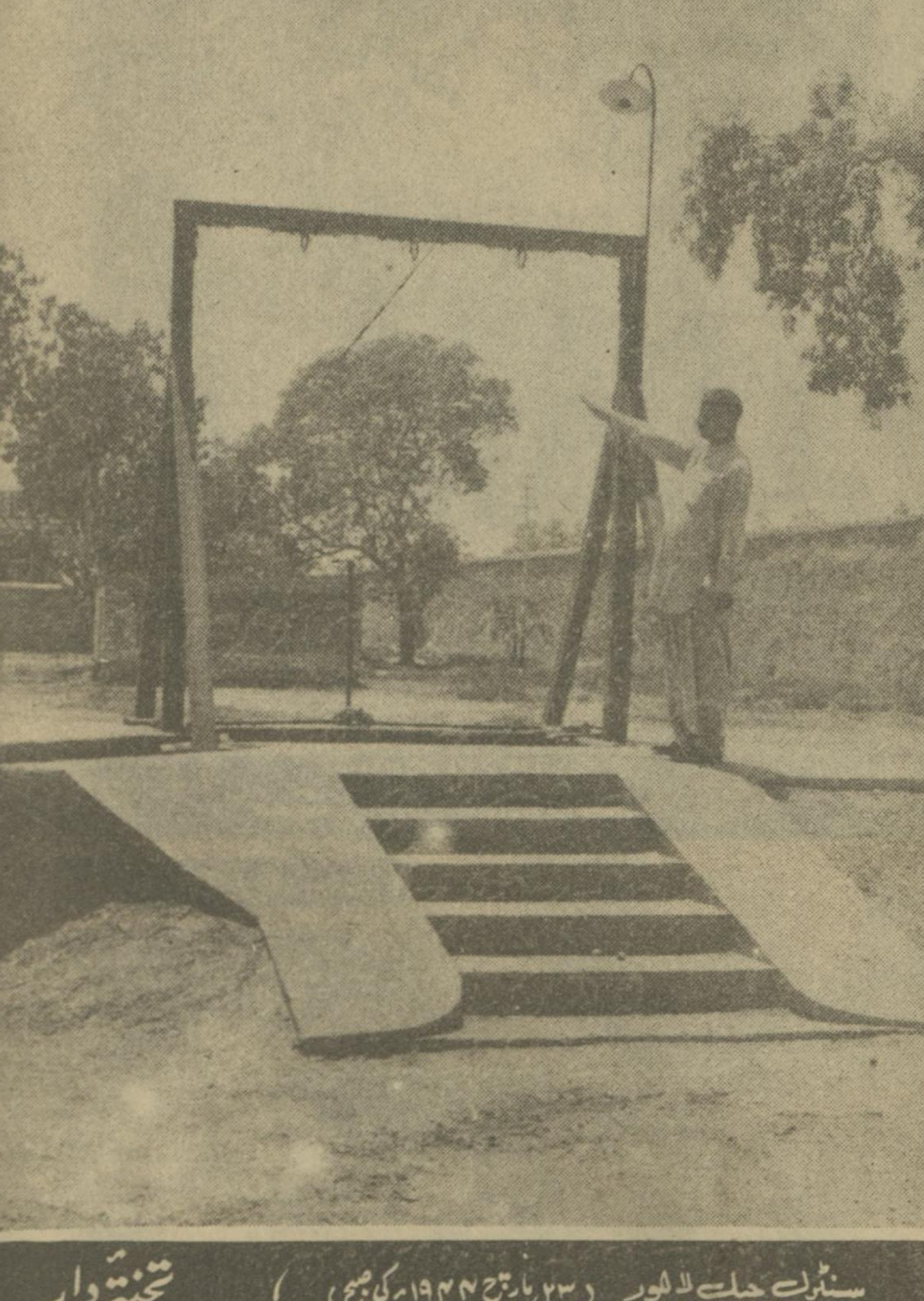




عشرتِ قتل گہ اہلِ تمنا



حسرتوں کے کتبے یادوں کے مزار



تختۂ دار / سنٹرل جیل لاہور (۲۳ مارچ ۱۹۴۴ء کی صبح)

وہ دوست جو تختۂ دار پر لٹک گئے مولف ان

کی یاد میں ہدیہ سلام پیش کر رہا ہے

بخش پرمانند نام کا ایک قد آور شخص جیلر تھا اور سپرنٹنڈنٹ وہی کرنل سوندھی۔ جو اُن دنوں دو ماہ کی چھٹی پر تھا۔ قائم مقام سپرنٹنڈنٹ پنڈت من موہن ناتھ ایک خوش باش، خوش گفتار اور خوش طبیعت انسان تھا۔ بخشی نے پُرانے چودہ نمبر میں بھجوا دیا جہاں مجھے عقبی چھ چکیوں میں رکھا گیا جو کئی تالوں اور دیواروں میں گھری ہوئی تھیں —— اس وحشتناک تنہائی کا نقشہ کھینچنا مشکل ہے، پہلے اس احاطہ میں سزائے موت کے قیدی رکھے جاتے تھے۔ پھر نیا چودہ نمبر بنا تو اس احاطہ کے پہلے حصے کی چکیاں تو انہی کے لئے مخصوص رہیں مگر باقی دو حصوں میں جیل کے بدمعاش یا خطرناک قیدی رکھے جانے لگے۔ جس قیدی نمبر دار کا مجھ پر پہرہ تھا اسے مجھ سے بات کرنے یا میرے نزدیک آنے کی اجازت نہ تھی۔ میں کوئی گھنٹہ بھر ٹہلنے کے بعد بند ہوتا تو نمبر دار پہلے حصہ میں چلا جاتا شدید تنہائی تھی۔ میں نے سوچا پھر ارادہ کیا کہ مجھے کچھ نہ کچھ پڑھنا چاہیئے۔ اس تنہائی کو ضائع کرنا نقصان دہ ہوگا۔ سوال یہ تھا کہ کتابیں کہاں سے آئیں؟ باہر سے کتابیں منگوانے کی مجھ میں استطاعت نہ تھی اخبار سی کلاس کیلئے شجر ممنوعہ تھا اور میں سی کلاس کا قیدی تھا۔

جیلر سے درخواست کی کہ مجھے جیل کی لائبریری سے حسب منشا استفادہ کرنے کا موقع دیا جائے

وہ مان گیا۔ لائبریری میں سو سے کچھ کم انگریزی اور اتنی ہی اردو کتابیں تھیں۔ سو پچاس اردو کے ماہنامے بھی تھے لیکن وقیع "ادبی دنیا" ہی تھا۔ اس کے پرچے بھی پرانے تھے۔ میں نے کوئی دو ماہ میں یہ سارا سٹاک ختم کر ڈالا جو شخص شورش ہو اور شورش رہا ہو اس کے لئے اس قسم کی تنہائی ضرور اذیت ناک ہوتی ہے مگر کتابوں کے استغراق نے احساس ہی نہ ہونے دیا۔ ٹیگ بنانا میری مشقت تھی۔ لیکن کوئی پوچھتا نہ پچھواتا درجن دو درجن ٹیگ بنا کر پڑا رہتا سوچتا اور لیٹ رہتا۔ لے دے کے ماحول کی تکلیف تھی بازو اور عقب کی چکیوں میں بدمعاش قیدی رہ رہے تھے جو اس جہنم میں بھی بیہودہ گفتار اور مکروہ افعال سے نہ چوکتے تھے۔ خدا کو یاد کرنے کے بجائے آپس میں بے دھڑک باتیں کرتے یا پھر کم عمر نوجوانوں کے جسمانی نقب لگانے کی سوچتے۔ اس احاطہ کی بیرونی دیوار کے بائیں پہلو میں نیا چودہ نمبر تھا جہاں سزائے موت کے قیدی پڑے تھے میرے کمرے کی پشت پر انہی قیدیوں کا بلاک تھا جب "سب اچھا" کا بگل بجتا اور مختلف احاطوں کے نمبردار گنتی کے صحیح ہونے کی صدا کر چکتے تو پھانسی کی کوٹھڑیوں سے قرآن مجید کی آیتیں، جپ جی کا پاٹھ، اور ویدوں کے اشلوک سنائی دیتے۔ قرآن پاک اور جپ جی کا ورد گونجدار ہوتا کیونکہ مسلمانوں اور سکھوں کا تناسب بہت زیادہ تھا۔ ہندو کوئی ٹاواں ٹاواں ہی قید ہوتا سکھ ست سری اکال کا نعرہ بلند کر کے اپنی عبادت ختم کر دیتے۔ مسلمان نعرہ تو کوئی بلند نہ کرتے البتہ تلاوت کلام پاک اور نعت خوانی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ جاری رکھتے۔ سب اپنے خدا سے گڑگڑا کر معافی مانگتے۔ ایک دوسرے کا حال پوچھتے تاریخ کب ہے؛ وکیل کون ہے؟ آپس میں دعائیں دینے فقرات مستعمل و مخصوص ہوتے۔ اللہ معافیاں دے گا۔ واہگورو کرپا کرے گا۔ پرماتما بھلی کریں گے —— آپس میں پوچھتے پچھواتے مثلاً

کس کو مارا تھا؟

جی بڑا خنزیر مارا ہے۔

"مارا تو نہیں مر گیا ہے"

"بے گناہ ہوں پولیس نے پھنسا دیا ہے"

"گاؤں بھر کا ناک میں دم کر رکھا تھا کرپان کے ایک ہی وار سے ٹھنڈا ہو گیا"

"اجی مَیں کیا مارتا کُتا میرے ذمے لگ گیا ہے"

"مقابلہ میں ڈھیر ہو گیا ہے"

"...... میری بہن کو چھیڑا تھا میں نے ڈھیر کر دیا"

"تقدیر نے گھیر لیا ہے ورنہ میں تو بدمعاش کو جہنم رسید کر کے بھاگ نکلا تھا"

"پولیس کا کرشمہ ہے قاتلوں سے رشوت کھالی مجھ غریب کو پھنسوا دیا ہے"

"کئی پشتوں سے لڑائی چلی آتی ہے ...... نہ اِس طرف سے کبھی کسی کو سزا ہوئی نہ اُس طرف سے کوئی پکڑا گیا اب قسمت کے پھیر نے مجھے پھنسا دیا ہے"

"اجی کافر کو مارا ہے سالا بد زبانی کرتا تھا"

"اپیل کی ہوئی ہے تاریخ نہیں نکلی وہی ہو گا جو خدا کو منظور ہے"۔

مسلمانوں کے مقابلہ میں سکھ قیدی زیادہ ہوتے شاذ ہی کوئی بے گناہ ہوتا۔ کئی دہریہ ہو جاتے انہیں آخر وقت تک خدا یاد نہ آتا بلکہ اس حال میں بھی خدا کی نفی پر چھپاتے۔ کئی ردِّعمل کے طور پر خدا کو نہ مانتے خدا ہوتا تو ہم پھانسی کیوں لگتے؟ لیکن اس قسم کے قیدی سو میں سے ایک یا دو ہوتے ــــــ بہرحال پھانسی کی ان کوٹھڑیوں میں خدا۔ رسول۔ بھگوان۔ پرماتما۔ واہگورو کا ذکر و اذکار غالب رہتا ــــــ میں اپنے بلاک میں اکیلا تھا دن تو کسی نہ کسی طرح گزر جاتا کبھی پڑھ کر، کبھی ٹیگ بنا کر، کبھی کوٹھڑی میں ٹہل کر لیکن دوپہر کا سائیں سائیں کرتا ہوا وقت تھوڑا سا اُداس ہوتا۔ رات چھبتی ضرور مگر کٹ جاتی۔ کوٹھڑیوں میں روشنی کا انتظام تھا نہیں، گھُپ اندھیرے میں سو رہتا پڑھنا لکھنا ناممکن،

راتیں ضائع ہو رہی تھیں، رات کا آغاز پھانسی کے قیدیوں کی غمناک آوازوں سے ہو تو ظاہر ہے کہ دل پہ کیا گزرتی ہے قرآن مجید ایک زندگی بخش کتاب ہے لیکن جب موت کا مسافر پڑھ رہا ہو یا مرنے والے کے سرہانے پڑھی جائے تو محسوسات کا عالم ہی دوسرا ہوتا ہے ۔

شاعرانہ واردات

مَیں طبعاً شاعر تھا جمالیات اور ادبیات سے مجھے ہمیشہ ہی ایک فطری اُنس رہا۔ میرے تاثرات اور احساسات اس فضا میں آزردہ ہو ہو جاتے۔ ہر رات سونے سے قبل مغموم ہو جاتا اور زندگی کے نشیب و فراز پر سوچا کرتا، جس صبح کسی کو پھانسی لگنا ہو وہ رات بے حد مغموم ہوتی۔ اس رات تمام عبادتیں اور آوازیں خود بخود منسوخ و معدوم ہو جاتیں محسوس ہوتا جیسے آنے والی موت نے سب کے لب سی دیے اور وہ یارائے گفت گو سے محروم ہو گئے ہیں۔ ہر روز سونے سے پہلے یہ دو چار گھنٹے میرے لئے بڑی کشمکش کے ہوتے۔ کبھی ققنس کی طرح جی اُٹھتا کبھی محسوس ہوتا کہ میرے جذبات نزع کے عالم میں ہیں ۔

رفتہ رفتہ مَیں اِن آوازوں اِن صداؤں اور اِن چیخوں کا عادی ہو گیا۔ میرے لئے یہ سب چیزیں روزمرّہ ہو گئیں ۔ جمعدار کبھی دروازہ کھول دیتے تو مَیں چوری چُھپے ان قیدیوں سے مل لیتا قصوری قیدیوں اور موت کے مجرموں سے میل ملاقات بھی ایک تجربہ ہی تھا۔

مذبح

میرے عقب میں دس چکیاں تھیں ان میں بڑے ہی خطرناک قیدی بند تھے۔ پانچ سکھ پانچ مسلمان۔ یہ دسوں جیل میں بھی دس نمبریے سمجھے جاتے اور ان سے ہر کوئی ڈرتا تھا۔ صرف سپرنٹنڈنٹ کے ظاہری رکھ رکھاؤ کا احترام کرتے۔ سپرنٹنڈنٹ بھی سمجھتا تھا کہ خوف یا احترام مصنوعی ہے ۔ یہ تمام

چوبیس گھنٹے بند رہتے آدھ گھنٹہ صبح اور آدھ گھنٹہ شام اپنی اپنی چکی میں ٹہلائی کے لئے کھلتے۔ دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی، دروازہ پر دو جمعدار اور دو نمبردار ہر وقت موجود رہتے لیکن ان سے پھر بھی خطرہ ہی محسوس کیا جاتا۔ یہ قتلوں اور ڈاکوں میں لمبی لمبی سزائیں بھگت رہے تھے۔ ان کی چمڑی میں خوف نہ تھا ہی نہیں۔ یہ غایت درجہ بہادر انسان تھے۔ ان لوگوں میں قول کا سچاپن اور ساتھیوں پر قربان ہو جانے کا جذبہ وافر تھا۔ انہیں زیادہ دن تک ایک جیل میں نہ رکھا جاتا۔ بلکہ صوبہ کی مختلف جیلوں میں پھرایا جاتا۔ ایک دن فیروزپور سے دو قیدی اور آ گئے ایک سکھ ایک مسلمان لیکن دونو ظالم قسم کے قیدی تھے سکھ قیدی سے جمعدار کی جھڑپ ہو گئی ایسے قیدیوں کی عادت ہوتی ہے کہ جس جیل میں جائیں وہاں اپنا نقش جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادھر جیل والے بھی اپنا دبدبہ بٹھانے میں کسر نہیں اُٹھا رکھتے آخر دونوں میں سمجھوتہ ہو جاتا ہے اس سکھ کا نام غالباً موہن سنگھ تھا۔ موہن سنگھ نے جمعدار کو گالیاں دیں جمعدار نے ڈپٹی جیلر سے کہا۔ ڈپٹی جیلر بھی گالی کھا گیا، جیلر تک معاملہ پہنچا اُس نے موہن سنگھ کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا سپرنٹنڈنٹ راؤنڈ پر آیا تو موہن سنگھ اپنی کھڈی پر لیٹا رہا، اُٹھا نہیں سپرنٹنڈنٹ ڈنڈا بیڑی کی سزا دے گیا موہن سنگھ نے ڈنڈا بیڑی لگوانے سے انکار کر دیا۔ کرنل سوندھی سخت طبیعت کا آدمی تھا اُس نے بید لگانے کا حکم دے دیا۔ موہن سنگھ پہلے کئی دفعہ بید کھا چکا تھا اب کے بھی کھا گیا اور بڑی بہادری سے جب تک بید لگتے رہے ست سری اکال پکارتا رہا۔ کسی موڑ اور کسی مرحلہ میں بھی جھکا نہیں، ڈٹا رہا۔ ایک دن اس نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا اس کے کمرے کی صفائی ٹھیک نہیں ہوتی خاکروب بول و براز اُٹھانے میں سستی کرتا ہے۔ سوندھی یہ کہہ کر نکل گیا کہ خود صاف کر لیا کرو۔ موہن سنگھ پی گیا اگلے ہفتے سپرنٹنڈنٹ آیا تو اُس نے بول و براز کا بھرا ہوا پیالہ اُسکے منہ پر دے مارا جس سے اس کا سارا سوٹ لتھڑ گیا جیل میں سپرنٹنڈنٹ پر حملہ قتل سے بھی بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔ چاروں طرف ہنگامہ مچ گیا۔ ان موقعوں پر جیل کے ملازم اور نمبردار ایسے قیدی کو ادھ موا کر دیتے ہیں مگر سوندھی نے سب کو روک دیا فوراً گھر چلا گیا تھوڑی

سی دیر میں کپڑے بدل کر لوٹا موہن سنگھ کو الٹی ہتھکڑی لگوائی جس چوبچہ میں جیل بھر کا فضلہ جمع ہوتا تھا وہاں لے چلنے کا حکم دیا۔ وہاں پہنچ کر عملہ سے کہا اسے جوڑے سے پکڑ کر پیشاب کے حوض میں مسلسل غوطے دو۔ اُس نے مزاحمت کی، گالی گلوچ کیا لیکن بیسیوں میں اکیلا تھا غوطے کھاتا رہا گالی بکتا رہا جب نڈھال ہو گیا تو واپس کر دیا۔ کئی ماہ پھوڑوں پھنسیوں اور زخموں سے لاچار رہا مگر اس کے باوجود اس نے نہ کبھی سپرنٹنڈنٹ کا احترام کیا نہ عملہ کے احکام کو مانا۔ وہ جیل والوں کے لئے پرابلم بنا رہا اور جیل والے اپنی خداوندی کے باوجود اس سے خائف ہی رہے ——

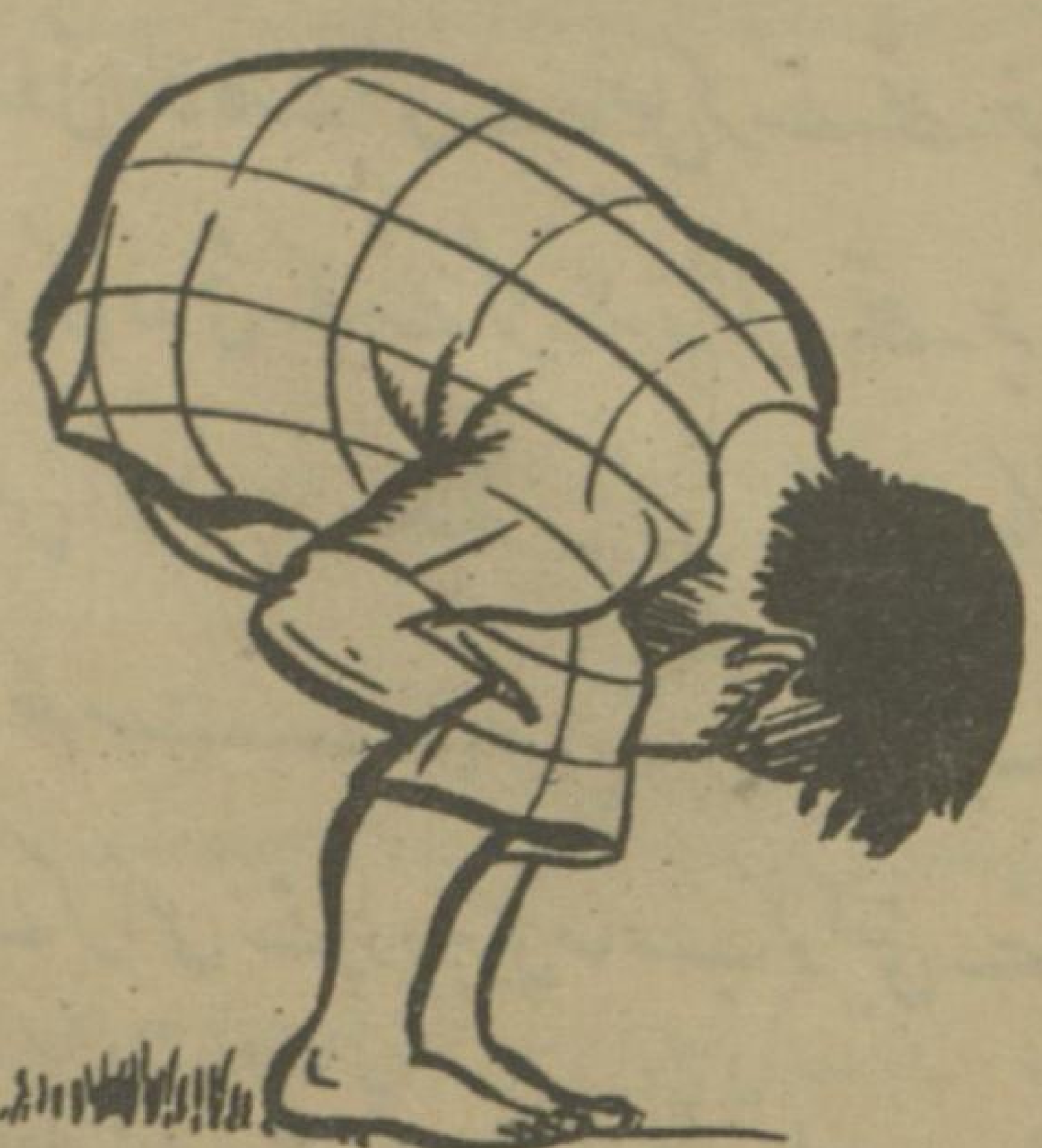
جیل ایک ایسی جگہ ہے جس کے بارے میں بہت کم سوچا گیا بلکہ سوچا ہی نہیں گیا انگریزوں نے جیل خانے نہیں، بوچڑ خانے بنائے تھے یا قصاص خانے' اصلاح کے عنوان سے' بہت کچھ کہا گیا لیکن اصلاح مفقود ہی رہی۔ جیل خانوں کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ یہاں شریف علیٰ' عیبی مجرم' اور مجرم عادی ہو جاتا ہے جیل خانے اصلاح کرنے' عبرت دلانے' یا سبق سکھانے کے لئے نہیں بلکہ عملاً جرائم کے تربیت خانے معلوم ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کو پولیس آوارہ گردی کے الزام میں پکڑتی ہے یا جو لوگ جرائم کی پاداش میں قید ہوتے ہیں وہ ایک تربیت یافتہ مجرم کی حیثیت سے رہا ہوتے ہیں پھر ان کے دل سے جیل کا خوف ہمیشہ کے لئے نکل جاتا ہے اور وہ جرم کرنے ہی میں لذّت محسوس کرتے ہیں۔

جاں ہار کوشش

جیل اُس وقت تک جیل ہے جب تک آدمی قید نہ ہو جب ایک دفعہ جیل سے ہو آئے تو پھر قید کا خوف باقی نہیں رہتا۔ پنجاب کی جیلوں میں جتنی اصلاحات بھی انگریزی عہد میں ہوتی رہیں ان کا کریڈٹ زیادہ تر سکھوں کو جاتا ہے۔ سکھوں نے اخلاقی اور سیاسی دو نو طرح

جیل کو جیل نہیں رہنے دیا۔ حکام کا مزاج بدلا، بید کھاتے، چکیاں پیسیں، کولھو چلاتے، خراس میں جُتتے، ہتھکڑیاں لگوائیں، بیڑیاں پہنیں، بھوک ہڑتالیں کیں، جانیں دیں، جو بن پڑا کیا مگر یہ منوا کے دم لیا کہ قیدی بھی انسان ہیں۔

سردار بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی بھوک ہڑتال نے جیل خانے کے نظام کو بڑی حد تک بدل ڈالا صوبائی حکومت نے اُن کی بھوک ہڑتال سے متاثر ہو کر سرکاری و غیر سرکاری ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جس کا کام صوبہ بھر کی جیلوں کا معائنہ کر کے اصلاحی تجویزیں پیش کرنا تھا۔ چودھری افضل حق بھی پنجاب لیجسلیٹو کونسل کی طرف سے اس کمیٹی کے ممبر تھے۔ انہوں نے جیل خانے کے حکام کی خداوندی کو ہلا دیا۔ بورسٹل جیل کا داروغہ خیر دین اپنے وقت کا ظالم ترین جیلر تھا۔ سارا جیل اُس سے تھر تھر کانپتا۔ کرنل چوپڑہ سپرنٹنڈنٹ ہونے کے باوجود اُس سے دبتا تھا۔ وہ چیف سیکرٹری، ہوم سیکرٹری، ڈی آئی جی، سی آئی ڈی، حتّٰی کہ گورنر سے براہ راست مل لیتا تھا۔ بھگت سنگھ اور اُس کے ساتھی اُسی کی نگرانی میں رہے۔ کرنل چوپڑہ پر ہندو ہونے کی وجہ سے حکومت کو شاید بھروسہ نہ تھا اعلیٰ حکام خیر الدین سے فائدہ اُٹھاتے اور تمام اندرونی اطلاعات اُس سے حاصل کرتے تھے۔ خیر الدین کو چودھری افضل حق نے خاصا پریشان کیا وہ اس کی خدائی کے لئے گرز البرز شکن تھے۔ خیر الدین نے رپورٹ کی کہ چودھری افضل حق جیل میں آ کر نہ صرف عام قیدیوں کو اُکساتے بلکہ بھگت سنگھ اور اُن کے ساتھیوں کو بھی انگیختے ہیں۔ حکومت کے دل میں چودھری صاحب کے لئے پہلے سے کھوٹ تھا اِس رپورٹ کی آڑ لے کر اُس نے چودھری صاحب کو کمیٹی سے الگ کر دیا مگر اب تک وہ جیل خانہ میں بہت سی اصلاحات لوا چکے تھے۔ انتہائی منکسر المزاج ہونے کے باوجود انہیں اپنے اس کارنامے پر بڑا فخر تھا۔





جہاں کبھی

اک قافلۂ

علم و سیاست

پابہ زنجیر رہا



صبح کے اُجالے
رات کے اندھیرے

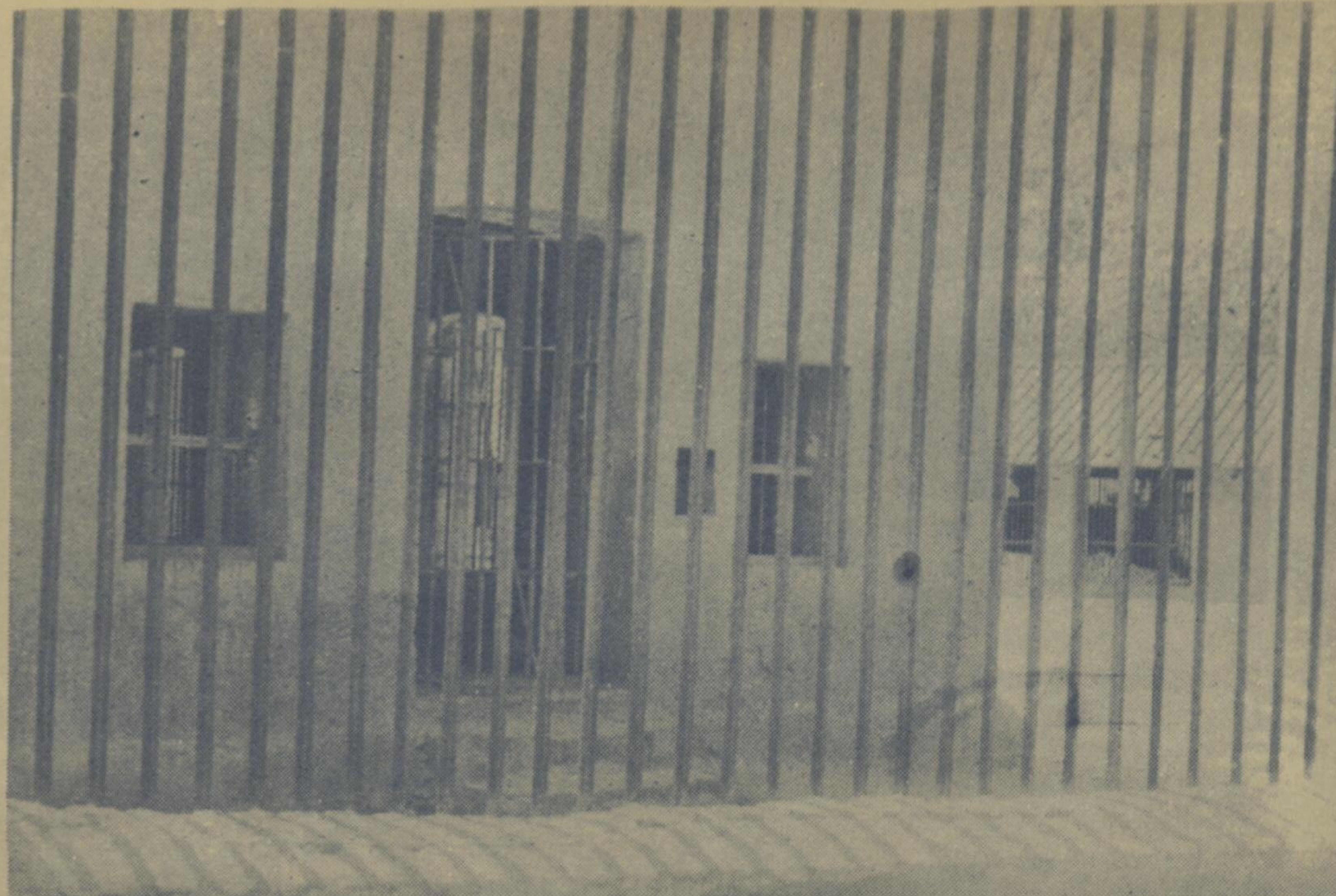
سیاست خانہ
کی جھلکیاں



مولف
حوالات
میں



گاہے ماہے سنٹرل جیل کی برجیوں سے ہم لاہور کو ٹکر ٹکر دیکھا کرتے



لاہور سنٹرل جیل
کی وہ بارک
جہاں پہلی دفعہ
مولف نے سال بھر قید
کے شب و روز
بسر کیے



بڑی دیواروں کے
پیچھے لاہور سنٹرل جیل
کا
پہلا احاطہ



اداس سائے

کھچی ہوئی دیوار کے اندر



درخت اور دیوار
دونو اجڑ گئے

لاہور سنٹرل جیل
کی سب سے
پہلی عمارت

ہائیکورٹ میں اپیل

ڈاکٹر کچلو کو میری سزا یابی کا دلی افسوس ہوا کچھ دنوں تکتے رہے کہ اتحاد ملتی کیا کرتے ہیں؟ جب انہیں پتہ چلا کہ ان لوگوں نے میری اپیل کے کاغذات بھی گم کر دیئے ہیں تو ڈاکٹر صاحب نے مولانا ظفر علی خان سے شکایتاً کہا آپ کن لوگوں کے نرغے میں ہیں؟ یہ لوگ تو آپ کو بھی زیچ کھائیں گے؟ مولانا اپنے ماحول سے متاثر ہونے والے انسان تھے اور ہر شخص انہیں متاثر کر سکتا تھا ان کا ایک ہی بیٹا تھا جدھر چاہتا موڑ لیتا۔ لیکن دو جذبوں میں وہ انتہائی صادق تھے۔ ایک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ عشق دوسرا برطانوی سامراج سے دشمنی؛ یار لوگوں نے آخر عمر میں انہیں اس دوسرے جذبے سے عملاً سبکدوش کر دیا مگر قلم کو مرتے دم تک استعمار کی حمایت سے آلودہ نہ کیا۔ یہ جذبہ آخر تک اُن کا رفیق رہا گو میرا سیاسی راستہ جلد ہی اُن سے مختلف ہو گیا لیکن میرے اس جذبے کی ہمیشہ قدر کرتے رہے۔ فرماتے بہادر وہی ہو سکتا ہے جس میں جیل کاٹنے کی ہمت ہو۔ جو انگریزی حکومت سے نہیں لڑا وہ انقلابی نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر کچلو سے مرافعہ کے کاغذات کی گمشدگی کا سُنا تو افسوس کرنے لگے اور وہ افسوس ہی کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ضلعی عدالت سے نقلیں لے کر ہائی کورٹ میں اپیل کر دی میں اس وقت تک چار ماہ کے لگ بھگ قید کاٹ چکا تھا جسٹس سکیمپ نے اپیل سُنی ڈاکٹر صاحب انگلستان میں ان کے ہم جماعت رہے تھے جسٹس سکیمپ نے کیس دیکھا تو ڈاکٹر صاحب سے کہا اس میں تو کوئی گنجائش نہیں۔ ملزم سے پہلے ہی رعایت کی گئی ہے سزا کے مقابلے میں جرم سخت ہے ساری تقریریں تشدد ہی تشدد ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ تقریر بنائی گئی ہے ملزم نے یہ نہیں کہا وہ عدم تشدد پر یقین رکھتا ہے ـــــ جسٹس سکیمپ نہ مانے، ڈاکٹر صاحب نے زور دیا کہ مرافعی نوعمر ہے انیس برس کے لگ بھگ، آپ دیکھ لیں آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔ جسٹس سکیمپ نے مجھے ہائی کورٹ میں طلب کیا میری کم عمری سے متاثر ہوئے سوال کیا

"آپ نے یہ باتیں کہی ہیں"

"میری تقریر میں حک و اضافہ کیا گیا ہے"

"آپ تشدد پر یقین رکھتے ہیں"

"بالکل نہیں، میں عدم تشدد کا حامی ہوں"

"تو پھر یہ الفاظ کیسے آ گئے"

"میں نے یہ الفاظ نہیں کہے۔ میں نہیں کہہ سکتا رپورٹر نے کوتاہی کی ہے یا قلم لگایا ہے"

"تو کیا آپ تشدد کے ان الفاظ پر معذرت کرتے ہیں"

"جو لفظ میں نے کہے ہی نہیں ان پر افسوس کرنا عجیب سی بات ہے"

ڈاکٹر صاحب نے کہا اگر عدالت یہ سمجھتی ہے کہ ملزم نے یہ لفظ کہے ہیں تو ہمیں ترغیب تشدد اور تلقین قتل کے فقرات پر افسوس کرنے میں کوئی عذر نہیں ——————

جٹس سکیمپ نے اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل سے کہا ایک نوعمر کو برباد کرنے سے کوئی فائدہ نہیں آپ صوبائی گورنمنٹ سے پوچھیں وہ کیا چاہتی ہے؟ اسسٹنٹ ایڈووکیٹ جنرل نے ایک گھنٹہ بعد جواب دیا۔

گورنمنٹ ملزم کی قید گھٹا کر چھ ماہ کر دینے کے حق میں ہے

جٹس سکیمپ مسکراتے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا

"کتنی قید کاٹی ہے"؟

"ہفتہ کم چار ماہ"

تو اچھا جتنی کاٹی ہے اتنی ہی کافی ہے۔ ہم آپ کو رہا کرتے ہیں جٹس سکیمپ نے قلم کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔



شاہی قلعہ لاہور

اس کی دیواروں کے پیچھے سینکڑوں مارے گئے



اب تک مَیں اپنے ہی تخلص کا عکس تھا محض جوش، محض جذبہ، محض شورش یعنی مواد خام ——— قید تنہائی نے مطالعہ کی عادت کو پختہ کر دیا اسکول سے نکل کر بھی پڑھنا چاہتا تھا لیکن حالات ناموافق تھے۔ حالات کی اس بے چارگی کا احساس میرے اندر ہمیشہ سلگتا رہا مَیں چھٹپنے سے "زمیندار" پڑھنے کا عادی تھا اس کے مطالعہ سے مَیں نے بہت کچھ حاصل کیا۔ اُس زمانے کا "زمیندار" گویا سیاسی مدرسہ تھا۔ "الہلال" ہاتھ لگا تو کایا ہی پلٹ گئی۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ کا رنگ مجھ پر تیز ہونے لگا، کلامِ اقبالؒ کا مطالعہ اس سونے پر سہاگہ ہو گیا۔ مَیں اپنی ابتدائی عمر میں ایک ایسا مقرر بن گیا جو لوگوں کی طلب و خواہش کا مرکز ہو۔ مجھ میں نوجوان عمر کے باعث، حالات کا ردّعمل یہ تھا کہ مَیں انقلابی نوجوانوں کے ساتھ مل کر انقلابی بننا چاہتا تھا اور مجھے تشدد کی راہ اختیار کرنے سے بھی انکار نہ تھا لیکن ولولے اُٹھتے اور ختم ہو جاتے، مسلمانوں میں اس قسم کے ساتھی نہ تھے۔ ہندوؤں سے اُس زمانے میں رسم و راہ نہ تھی ——— ملک میں جن راہنماؤں کا چرچا تھا گاندھی جی سر فہرست تھے بلکہ لیڈروں کے لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ مَیں نے عدم تشدد کے فلسفہ پر اُن کی تحریریں پڑھیں تو مجھ پر خاصا اثر ہؤا۔ اُن کے فلسفہ کا خلاصہ یہ تھا کہ عدم تشدد مظلوموں کا موثر ہتھیار ہے۔ اس سے ایک تو خون خرابہ نہیں ہوتا دوسرے

عدم تشدد میں ہار ہو تو نقصان انہی کا ہونا ہے جو اس میں حصہ لیتے ہیں، یہی سچی قربانی ہے اور اگر عدم تشدد جیتے تو اس کا فائدہ سب کو پہنچتا ہے یعنی پورا ملک اور پوری قوم اس سے مستفید ہوتے ہیں تشدد میں دوسروں کو نقصان پہنچا کر اپنا فائدہ ڈھونڈا جاتا ہے۔ عدم تشدد میں خود نقصان اُٹھا کر سب کا فائدہ حاصل کیا جاتا ہے۔

گاندھی جی نے تشدد کی ترغیب دینے یا متشددانہ اقدام کرنے والوں کے متعلق اعلان کیا تھا کہ وہ ان کے متبع یا ہمخیال ہی نہیں ہیں اور اگر کوئی شخص کانگرس کے پلیٹ فارم سے تشدد کی تلقین کرتا ہے یا اپنی تقریر میں متشددانہ الفاظ لاتا ہے تو وہ سچا ستیہ آگرہی نہیں اُسے کانگرس سے مستعفی ہو جانا چاہیئے یا اپنے ان الفاظ کی عدالتوں سے معافی مانگ لینی چاہیئے ——— عدم تشدد کامل قربانی کا نام ہے جس میں انتقام، قصاص، بدلے، یا جوابی حملے کی کوئی گنجائش نہیں ہے ——— جونہی میرے خیالات میں پختگی پیدا ہوئی میں عدم تشدد کی خوبیوں کا دل سے قائل ہو گیا۔ شروع شروع میں میرا رجحان ٹیررسٹوں کی طرف تھا، اور میں انقلابیوں سے راہ و رسم بڑھانے کی فکر میں رہا بعض سرفروشوں سے کچھ سیکھا بھی، میرزا معراج دین سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی میرے تعاقب میں تھا۔

شاہی قلعہ

ایک روز میں منٹو پارک گراؤنڈ سے قلعہ کی طرف آ رہا تھا کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سمادھی کے پاس ایک سب انسپکٹر نے مجھے گرفتار کیا اور قلعہ میں لے گیا ——— دو راتیں اور دو روز وہاں رہا۔ جرم کیا تھا؟ نہ مجھے معلوم تھا نہ بتایا گیا آخر وقت یہ جاننے کی فکر میں رہا کہ میرا قصور کیا ہے؟ جس طرح اچانک پکڑ کر لے گئے تھے اُسی طرح اچانک چھوڑ دیا ——— مگر یہ چھیانوے گھنٹے کئی قباحتوں کا مجموعہ و مرقع تھے۔ پہلی رات تو یہ کیا گیا کہ مجھے مرغن غذائیں کھلائی گئیں جب مجھے نیند نے گھیرا تو کھڑی ہتھکڑی لگا کر لٹکا دیا گیا۔ دو چھتے دار کنسٹیبلوں نے گھونسے مار مار کر میرا منہ سوجا دیا کوئی وجہ بتائی

ہوتی؟ کوئی سوال کیا ہوتا؛ معلوم ہوتا تھا نیند اُڑانے کا نسخہ استعمال ہو رہا ہے۔ ستم یا کرم کہہ لیجئے کہ لٹکانے کے بعد دو بڑے بڑے بلب روشن کر دیئے آناً فاناً پتنگوں کا لشکر جرار ٹوٹ پڑا آدھ آدھ گھنٹے بعد گھونسوں اور طمانچوں کا لاوا پھوٹتا رہا۔ رات بیت گئی، فجر کی اذان بلند ہوئی۔ اللہ اکبر کی صدا نے الحاج نواب دین (سب انسپکٹر) کی خدائی کا بت توڑ ڈالا حاجی صاحب ———

الصلوٰة خیر من النوم ——— الصلوٰة خیر من النوم

(نیند سے نماز بہتر ہے) ——— (نیند سے نماز بہتر ہے)

کی آواز پر آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھے، وضو کیا، مصلیٰ بچھایا اور نماز میں لگ گئے میری نیند چونکہ رات بھر معطل رہی تھی لہذا نماز بھی معطل ہو گئی میری نماز بھی گویا حاجی صاحب ہی ادا کر رہے تھے ——— دعا کر چکے تو مصلیٰ ہی سے فرمایا

"دیکھو ایک دن خدا کو جان دینی ہے۔ اللہ نے برطانیہ کو بادشاہی بخشی ہے" وتعز من تشاء وتذل من تشاء" اللہ جسے چاہے عزت دیتا اور جسے چاہے ذلت دیتا ہے۔ تم بادشاہوں کی مخالفت کر کے کیا لو گے؟ کراڑوں کو مرنے دو۔ صاحب جو پوچھتا ہے سچ سچ بتا دو۔ میں رسول اللہ کے مصلّٰی پر بیٹھا ہوں وعدہ کرتا ہوں تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو گی۔ فجر کا وقت ہے۔ ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کی ثنا و تعریف کر رہا ہے۔ تم مسلمان ہو اور مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ سچی بات پھانسی کے تختہ پر بھی کہہ دیتا ہے۔"

میں نے کہا

حاجی صاحب مجھے معلوم ہی نہیں کہ مجھے پکڑا کیوں ہے؟ اور آپ کیا پوچھ رہے ہیں؟ اتنے میں ایک دوسرا سب انسپکٹر بنتا سنگھ (غالباً یہی نام تھا) آ براجا ہتھکڑی کھول دی گئی۔ میں فوراً لیٹ گیا گھنٹہ بھر سویا تھا کہ حاجی صاحب اور سردار جی کے ٹھڈوں نے جگا دیا۔ وقت کٹ گیا۔ میں شاخ کی طرح نازک تھا مرجھا گیا۔ اچانک متلی ہوئی دن چڑھے بخار ہو گیا۔ اگلی شام میرے بخار پر قابو پا کر مجھے چھوڑ دیا گیا میں پوچھتا ہی

رہا کہ میرا قصور کیا ہے؟ مجھے کیوں پکڑا تھا؟ کوئی جواب نہ ملا میں قلعہ سے سیدھا دفتر "زمیندار" پہنچا مولانا ظفر علی خان دورے پر تھے، مولانا اختر علی خان سے آپ بیتی کہی انہیں رنج ضرور ہوا۔ میرزا صاحب کو فون کیا میرزا نے کہا ہم نے اسے پکڑا ہی نہیں جھوٹ بکتا ہے، یہ ایک سانحاتی لطیفہ تھا۔ وہاں سے اُٹھ کر ڈاکٹر عالم سے ملا کہ حقیقت حال معلوم کریں۔ وہ میرزا صاحب کے دوست تھے۔ میرزا صاحب یہاں بھی مکر گئے کہ نہ ایسا ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ میاں فیروز الدین احمد ان کے دفتر گئے وہ بھی یہی جواب لائے غرض جس سے پچھوایا یہی جواب ملا۔ گویا جو پیش آیا وہ میں نے کوئی خواب دیکھا تھا اور سرے سے یہ واقعہ ہی نہیں ہوا ——

میں نے میرزا صاحب کا پول کھولنے کی ٹھانی مجھ سے وہ پہلے ہی نالاں تھا میرا کوئی والی وارث نہ تھا۔ پولیس نے میرے خلاف وہی حربہ استعمال کیا جو اس ملک کے نادار لیکن مخلص کارکنوں پر استعمال ہوتا رہا۔ بغیر رسید بیٹر کے قلعہ یا حوالات میں لے گئے پٹوا دیا یا مروا دیا۔ ممکن ہے میرا انجام بھی وہی ہوتا جو اوم پرکاش یا دوسرے نوجوانوں کا ہو چکا تھا میں خوش قسمت تھا چھوٹ گیا اور بچ رہا —— ، —— ' خاندان متمول ہوتا تو شاید یہ سلوک نہ ہوتا۔ والد خوفزدہ ہو کر بے تعلق ہو چکے تھے لیکن ان کے پہلو میں بہر حال باپ کا دل تھا کس سے کہتے اور کیا کہتے؛ ایک محنت کش انسان لہو کے گھونٹ ہی پی سکتا ہے اور وہ پی رہے تھے۔ میں نے وزارت کے دروازے پر بھی دستک دی جہاں پہنچا ہر کوئی سودا کرتا، کارکن یا مخبر بنانے کے خواہاں ہوتے۔ فریاد پر کان نہ دھرتے کوئی خدا خوفی سے استفسار کرتا تو میرزا صاحب کے جواب سے مطمئن ہو جاتا۔ افلاس نے مجھے جھوٹا اور طاقت نے میرزا صاحب کو سچا بنا دیا تھا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر میں انتقام لینے پر اُتر آیا۔

رشوت یا پیشکش

میرا انتقام بھی قہر درویش بر جان درویش کے مصداق تھا۔ ہر تقریر میں میرزا صاحب میری گرم گفتاری کے نشانۂ خاص تھے۔ دل تھا کہ حالات کی ان سرد مہریوں کے باوجود جوان ہو رہا تھا۔ مجھ میں کوئی خم نہ تھا۔ غالباً ۱۹۳۸ء کا ذکر ہے ایک دوست کی گجرات میں شادی تھی میں بھی براتیوں میں شامل تھا۔ مقامی احباب نے جلسہ کر ڈالا اور مجبور کیا کہ مسئلہ فلسطین پر تقریر کروں ان دنوں یہی مسئلہ زوروں پر تھا۔ میں نے اس پر ایک دھواں دھار تقریر کی جو رات بارہ بجے تک جاری رہی تھوڑے دنوں بعد شہید گنج کا فیصلہ ہو گیا سکندر حیات نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ اگر مسجد شہید گنج میں مداخلت کی گئی تو مسلمانوں کو ہندوؤں کے بہت سے مندر لوٹانے پڑیں گے ہمیں لڑنے بھڑنے کے بجائے یہ قضیہ صلح صفائی سے طے کرنا چاہیئے کانگرس ہائی کمانڈ نے بھی سکندر کے اس بیان کا خیر مقدم کیا۔ یہی بات مجلسِ احرار کے راہنما بہت پہلے کہہ چکے تھے لیکن اس وقت ان کی بات پر قہر و غضب ٹوٹ پڑا تھا۔

مَیں حالات کے اس افسوسناک پس منظر سے لحظہ بہ لحظہ واقف ہوتا جا رہا تھا۔ مجلس احرار کے زعماءؔ سے میرا کوئی رابطہ یا واسطہ نہ تھا بلکہ اختلاف ہی تھا۔ مولوی مظہر علی اظہر نے دیکھا کہ شہید گنج اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتی تو علاج بالمثل کی ٹھانی سکندر وزارت کو زچ کیا اور اتحاد ملت کے زعماء کو بھی، نہ صرف خود قید ہو گئے بلکہ کئی سو رضاکاروں کو بھی قید کرایا ہر روز احرار کا ایک جتھہ شہید گنج کی طرف مارچ کرتا ہوا دہلی دروازہ کے باہر پکڑا جاتا۔ اسی اثنا میں چودھری افضل حقؒ سے میری ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے بہت سے حقائق بے نقاب کئے کئی تحریریں دکھائیں مَیں کانپ اُٹھا۔ مَیں نے لاہور کے ایک جلسۂ عام میں اعلان کیا کہ سکندر حیات نے شہید گنج کی بازیابی کا وعدہ ایفا نہ کیا تو مَیں عید قربان کے روز اُن کی کوٹھی پر رضاکاروں کا احتجاجی جتھا لے کر جاؤں گا۔ اس اعلان سے کھلبلی سی مچ گئی اب معاملہ ہی

دوسرا تھا کبھی مولانا ظفر علی خان آرہے اور سمجھا رہے ہیں۔ کبھی ڈاکٹر عالم آبراجتے ہیں میاں فیروز الدین احمد مجھے ایک بار پھر مرزا معراجدین کے پاس لے گئے۔ مسٹر بنیٹ ڈپٹی آئی جی سی آئی ڈی کے روبرو پیش کیا، کئی فریب دیئے گئے اسسٹنٹ سب انسپکٹر بھرتی کر لینے کی پیش کش کی گئی۔

شکار اور شکاری

امرتسر کے میر عبداللہ نواب محمد شاہنواز خان ممدوٹ کی طرف سے مستقل وظیفہ دلوانے اور ایک مکان خرید کر دینے کی پیش کش لائے۔ خود نواب صاحب نے کھانے پر بلایا رام کرنا چاہا، میر مقبول نے ہموار کرنے کی کوشش کی۔ غرض چاروں طرف سے ہلہ بولا گیا لیکن میں جو فیصلہ کر چکا تھا اُس پر خط تنسیخ کھینچنا ناممکن تھا۔ چودھری افضل حق برابر مجھے ان چالوں سے مطلع کر رہے تھے عید میں دو یا تین روز رہ گئے تھے، میں نے اعلان کیا کہ نماز عید شاہی مسجد میں پڑھوں گا اور وہاں سے جتھا لے کر وزیر اعظم کی کوٹھی پر جاؤں گا چودھری صاحب مجھے علامہ اقبالؒ کی کوٹھی پر لے گئے اُن سے کہا

"یہ ہے شورش کاشمیری"

شورش کاشمیری! حضرت علامہ کے چہرے پر ہلکا سا تبسم تھا فرمایا

"سکندر کی کوٹھی پر جتھا لے کر جا رہے ہو"

"جی ہاں! چودھری صاحب نے جواب دیا۔"

"جوانوں میں جرأت اور حرارت ہونی چاہیئے"

میں اُنکے سامنے مورتی کی طرح بے حس کھڑا رہا اُنکی پُر عظمت شخصیت کا رعب روئیں روئیں پر طاری تھا —— فرمایا

"گھبراؤ نہیں تم ایک انسان کے سامنے کھڑے ہو"

سنا تم بہت اچھی تقریر کرتے ہو۔ اللّٰھم زد فزد۔

میرے لئے یہ آزمائش کے دن تھے خوف بھی دلایا جا رہا تھا اور لالچ بھی دیتے جا رہے تھے۔ فریب کا تانا بانا بننے والے غافل نہیں تھے۔ جب کوئی ساحر یا سحر کامیاب نہ ہوا، تو امرتسر کا ایک ساتھی جو اس قسم کے کاموں میں اُتارو تھا مجھے اخلاقی مجرم بنانے پر تیار ہو گیا۔ اُس نے اسکیم تیار کی کہ مجھے سینما لے چلے، اور وہاں ایک فاحشہ عورت سے پٹوا دے وہ شور مچا دے کہ اس نے مجھے چھیڑا ہے اتنے میں پولیس آجائے اور گرفتار کر لے۔ اس غرض سے اُس نے ایک قحبہ کو تیار کیا صبح عید تھی —— رات اس پر عمل ہونا تھا۔ اُس نے بہتیرا مجبور کیا کہ اس کے ساتھ چلوں لیکن میں کسی طرح نہ مانا مجھے ایک دوست کی معرفت اس سازش کا علم ہو چکا تھا۔ رات ہمشیرہ کے مکان پہ کاٹی۔ علی الصباح سیدھا شاہی مسجد پہنچا نماز پڑھی، چودھری افضل حق کی صدارت میں جلسہ شروع ہوا، مجھے دیکھتے ہی تماشائی عوام کے چہرے پر رونق ہو گئی میں نے مختصر سی تقریر کی اور سو رضا کاروں کا جتھہ لے کر ایک بھاری ہجوم کے ساتھ سکندر حیات خان کی کوٹھی روانہ ہو گیا لوگ عید منا رہے تھے میں جیل جا رہا تھا راستہ میں ہجوم بڑھتا ہی گیا تمام راستہ یونی نسٹ وزارت مردہ باد اور سکندر حیات ہائے ہائے کے نعرے بلند ہوتے رہے ہمارا جلوس راستوں کے پیچ و خم سے ہوتا ہوا لوہاری دروازہ کے چوک میں آ گیا وہاں ہجوم دُگنا ہو گیا ہم انار کلی بازار سے ہوتے ہواتے جب بینک اسکوائر تک پہنچے تو پولیس کی گاردوں نے روک لیا۔ وائی ایم سی اے ہال اور بینک اسکوائر کے درمیان کی سڑک پر پولیس نے حلقہ باندھ رکھا تھا۔ مسلح گاردیں، آہنی لاریاں، گھڑ سوار، اور اعلیٰ افسر آناً فاناً پہنچ گئے مرزا محمد باقر سٹی کوتوال نے آگے بڑھ کر سوال کیا

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"سردار سکندر حیات کی کوٹھی پر"

"کیوں؟"

"عید کی مبارک باد پیش کرنے۔ وہ ہمارے مسلمان بھائی ہیں"

"منتشر ہو جایئے۔ مجمع خلافِ قانون ہے"

"ہم کوئی خلاف قانون حرکت نہیں کر رہے ہیں"

میرزا صاحب اور افسروں میں کچھ دیر کھسر پھسر ہوئی پھر ایک مجسٹریٹ نے آگے بڑھ کر کہا

"پانچ منٹ میں منتشر ہو جاؤ ورنہ آپ کو گرفتار کر لیا جائے گا"

میرے ہمراہی رضاکار بڑے ہی بہادر تھے۔ کچھ پٹھان کچھ پنجابی سبھی ڈٹ گئے ہم نے باہوں میں باہیں ڈال کر زنجیر سی بنالی زمین پر لیٹ گئے اب پولیس نے ہمیں گرفتار کرنا شروع کیا پانچ پانچ سپاہی ایک ایک رضاکار کو حلقہ سے توڑ کر لاری میں لادتے رہے' دیر تک کشمکش رہی ہم سب عدم تشدد پر کاربند تھے ایسے موقعوں پر بعض شرارتی' اکثر جوشیلے' اور کچھ پولیس کے گماشتے' پتھراؤ کرنے کی کوشش کرتے ہیں میں نے مختصر سی تقریر میں عوام کو روک دیا کہ وہ ہماری راہ میں حائل نہ ہوں ایک ڈیڑھ گھنٹے کی کشمکش کے بعد ہم سب کو لاریوں میں لاد کر چیرنگ کراس کے تھانے میں بند کر دیا گیا پولیس والے ساتھیوں سے الگ کر کے مجھے حوالات کے تحتانی حصے میں لے جانا چاہتے تھے ساتھیوں نے شور مچا دیا کہ وہ کسی صورت میں بھی الگ نہیں ہونے دیں گے۔

غرض شام تک چیرنگ کراس میں پڑے رہے کھانا مانگا تو جواب ملا

"سردار سکندر حیات کے گھر سے سویاں پک کر آ رہی ہیں"

یہ ایک مسخرے سب انسپکٹر کا جواب تھا۔ دوسری دفعہ انسپکٹر سول لائن کو بلا کر کہا تو وہ مسکرا کر نکل گیا ایک دوسرے انسپکٹر سے کہا' جواب ملا

"ابھی قربانی کا بکرا ذبح نہیں کیا ہے"

"میرے ساتھ صوفی عنایت محمد پسروری بھی تھے۔ بڑے ہی مخلص بہادر اور اشجع وہ عید پڑھ کے گھر واپس آ رہے تھے کہ میں نے انارکلی میں انہیں بھی ساتھ اڑس لیا ———— اُنہوں نے انسپکٹر سے کہا"

"تو آپ نے آپ کو ذبح کرتے ہیں"

اُس نے ماتھے پر شکنیں ڈالیں پھر ہنسا، رضاکاروں کے سالار نے آواز دی

"صُوفی جی! اس کے سری پائے حرام ہوں گے"

اسی میں اُس نے خیر سمجھی کہ چپ چاپ نکل جائے ہم نے روٹی روٹی کا شور مچانا شروع کیا نتیجہ یہ نکلا کہ پانچ بجے کے قریب پولیس نے لاریاں منگوا کر ہمیں جیل بھجوا دیا۔

تیسری بار

"پھر وہی کُنج قفس پھر وہی صیاد کا گھر" ———— ہمیں ساتھیوں میں رکھنے کی بجائے سیاست خانہ میں رکھا گیا۔ یہ جیل کا بدترین حصہ تھا، تین بلاک تھے اور تینوں میں چکیاں ہی چکیاں تھیں ان چکیوں میں آمنے سامنے کوٹھڑیاں تھیں مگر اس طرح کہ ایک چکی کا قیدی دوسری چکی کے قیدی کو نہ دیکھ سکتا تھا اور نہ اُن کی آواز سُن سکتا تھا۔ یہ قید تنہائی یا مار پٹائی کے لئے مخصوص تھیں۔

ہم سب کو ایک ہی بلاک میں رکھا گیا۔ کھانا یہاں بھی نہ ملا کیونکہ جیل میں نووارد قیدی یا حوالاتی کی روٹی تیار نہیں ہوتی راشن گذشتہ دن کی گنتی کے مطابق دیا جاتا ہے۔ کوئی بھوک کا تقاضا کرے تو آدھی رات کو دو روٹیاں بھیج دی جاتی ہیں۔ اس وقت کوئی سبزی یا دال تیار نہیں ہوتی قیدی پانی سے زہر مار کر لیتا ہے عید فاقے سے کٹ گئی۔ کوئی ایک بجے شب ہمیں دو دو روٹیاں ملیں۔ ہم بڑی خوشی سے کھا گئے پانی کا ایک ایک گھونٹ اور روٹی کا ایک ایک لقمہ کیا مزا دے رہے تھے؟ سیاست خانہ کی دیوار

کے بائیں بازو پر حوالات کا احاطہ تھا۔ جہاں چھولداریاں لگا کر مولانا مظہر علی اظہر اور ان کے ساتھی رضاکاروں کو رکھا گیا تھا ان رضاکاروں میں ہر روز چار کا اضافہ ہو رہا تھا ہمارا پتہ چلا تو انہوں نے جیل خانے کی ساری فضا کو نعروں سے گونجا دیا ہم نے بھی گنتی کھلتے ہی نعرے بلند کرنا شروع کئے۔ جیلر نے پہلے مولانا کو بلایا پھر مجھے آخر ہمیں اکٹھا کرنے پر راضی ہو گئے اور کوئی دو گھنٹے بعد ہم اکٹھے ہو گئے مولانا مظہر علی اظہر اے کلاس ترک کر کے سی کلاس میں رہ رہے تھے۔ اظہر امرتسری ایڈیٹر "زمیندار" جو اس وقت اتحاد ملت کے جنرل سکیرٹری تھے اور احرار رضاکاروں نے انہیں اغوا کر کے ایک جتھے کے ساتھ بھجوا دیا تھا وہ ان سے الگ بی کلاس میں تھے، میں نے فوراً ہی انہیں راضی کیا اور سی کلاس میں لے آیا۔

"ہمہ یاراں دوزخ ہمہ یاراں بہشت"

ہمارے خلاف دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کا مقدمہ چلایا گیا۔ کئی دن تک کچہری میں رونق رہی۔ استغاثہ نے بیان کیا کہ ہم سردار سکندر حیات وزیر اعظم کی کوٹھی پر حملہ بولنے کے لئے جا رہے تھے میں نے تردید کی اور کہا کہ وہ پبلک کے منتخب کردہ وزیر اعظم ہیں ہم انہیں اپنا نمائندہ سمجھ کر عید کی مبارکباد دینے جا رہے تھے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ سردار صاحب نے مجھے بلایا تھا مجسٹریٹ نے فیصلہ میں لکھا کہ ملزم اور وزیر اعظم میں حیثیت و مرتبہ کا بڑا فرق ہے لہذا میں تسلیم نہیں کرتا کہ انہوں نے ملزم کو بلایا ہو۔

چار ماہ قید

میرے ساتھی رضاکاروں کو دو دو ماہ قید سخت اور مجھے چار ماہ قید سخت کا حکم سنایا گیا ہم نے سزا سن کر نعروں سے کچہری کا احاطہ گونجا دیا اتنا شور مچا کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ سردار بھاگ سنگھ ڈی ایس پی غراتا ہوا نکلا انگریزوں کا پشتینی وفادار تھا بڑا جھلایا رضاکاروں نے مذاق اُڑایا خفیف سا

ہوگیا۔ اتنے میں مسٹر ایف سی بورن ڈپٹی کمشنر بھی اپنے کمرے سے باہر آگئے بھاگ سنگھ نے مجھے نشانہ بناکر اسی ساری خرابی کا ذمہ دار قرار دیا بورن میرے گرد ہوگیا۔

——— ٹم کیا کرتا ہے"

میں نے بھی "ت گوٹ" ہی کر دیا

"ہم نعرے مارتا ہے"

بورن "او یو" ———

مَیں: او ہم

بورن کے چہرے پر غصّہ کی علامتیں شدید ہوگئیں کچھ کہنا چاہتا تھا کہہ نہ سکا، اتنے میں ایک رضاکار نے عجیب و غریب بولیاں بول کر اُسے اَور بھی خفا کر دیا وہ غصے میں واپس چلا گیا کرنل سوندھی کو لکھا کہ اس حرکت پر انہیں سزا دی جائے۔ سوندھی نے مجھے طلب کیا خط پڑھ کر سنایا میں نے سوندھی سے کہا۔

یہ صحیح ہے کہ ہم نے انگریزی حکومت برباد اور برطانوی راج مردہ باد کے نعرے لگائے ہیں لیکن جیل میں نہیں، جیل سے باہر، بورن ہمیں خود سزا دے اُس نے آپ کو کیوں چنا ہے؟ اس لئے کہ آپ ہندوستانی ہیں۔ سوندھی افسرانہ تمکنت کے ساتھ مسکرایا اور بولا ——— اچھا آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیئے۔

قید یا میلہ

سیاسی تحریکوں میں عام ساتھیوں کی روزمرہ آمد و رفت سے قید خانہ کی فضا ہی بدل جاتی ہے جیل ہوسٹل سا نظر آتا ہے۔ کئی دفعہ ایک تفریحی ٹرین کا لطف آنے لگتا اور قید خانہ عیش خانہ ہو

جاتا ہے پندرہ دن تک ایک میلہ سا لگا رہا مولانا مظہر علی اظہر سارا دن چھولداری میں پڑے رہتے تو قرآن مجید حفظ کر رہے تھے اظہر امرتسری، صوفی عنایت محمد پسروری، قاضی احسان احمد اور میں ایک ہی ٹینٹ میں تھے۔ دن کا بیشتر حصہ مجلس آرائی میں کٹ جاتا۔

آخر یہ مجلس بھی اُجڑنے لگی اور اُجڑ ہی گئی۔ ایک شام چیف وارڈر بیڑیوں کا ایک انبار لیکر آگیا کہ ڈیڑھ سو رضا کار میانوالی چالان کئے جا رہے ہیں۔ لہذا بیڑیاں لگوالی جائیں۔

پوچھا چالان کب ہے؟

جواب ملا ——— کل

سالار نے کہا تو کل بیڑیاں لگوالی جائیں گی، رات ہم بے آرامی سے نہیں کاٹنا چاہتے اسسٹنٹ جیلر نے اصرار کیا جھگڑا ہو گیا جیلر آیا تو تکرار ہوئی، بات نہ بنی آخر مولانا مظہر علی اظہر چھولداری سے نکلے جیلر سے مخاطب ہو کر پوچھا!

"بخشی صاحب! چالان کب ہے؟"

اس کے منہ سے نکل گیا ——— آج

مولانا جانتے تھے کہ اس نے غلط کہا ہے غصہ میں کہا

"بخشی صاحب اگر چالان آج ہے تو کسی کو بیڑیاں لگوانے میں عذر نہیں اور اگر کل ہے اور آپ آج بیڑیاں لگوا رہے ہیں تو پھر آپ انہیں کبھی لے جا نہ سکیں گے؟ یہاں گولی چلے گی لاشوں کا ڈھیر لگے گا اور یاد رکھیئے ان رضا کاروں پر اُس وقت گولی چلے گی جب مظہر علی کا سینہ گولی کھا چکا ہو گا۔

جیلر یہ کلمات سنتے ہی بھاگ گیا۔ بیڑیاں لگانے والے نمبردار بھی چیف وارڈر کے ساتھ کھسک گئے۔ اگلے روز کوئی ڈیڑھ سو رضا کار مولانا مظہر علی اظہر سمیت میانوالی جیل بھجوا دیئے گئے۔ مظہر علی کو

بھی عام رضاکاروں کے ساتھ بیڑیاں اور ہتھکڑیاں پہنا کر روانہ کیا گیا ——— اس امر کا مطلق خیال نہ رکھا گیا کہ وہ ایم ایل اے ہیں ایڈووکیٹ ہیں اور کوئی دوسری حیثیت بھی رکھتے ہیں۔

گجرات جیل میں

میری اِس مختصر قید کو حکومت نے کافی نہ سمجھا کیونکہ اپیل کے پہلے جھٹکے ہی میں رہائی کا امکان تھا۔ چنانچہ فلسطین کے مسئلہ پر گجرات میں جو تقریر کی تھی وہ نکالی گئی اور اس کی بنا پر میرے خلاف ۱۲۴/الف کا مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ پولیس آئی اور لاہور سے گجرات لے گئی۔ وہاں رات شروع ہونے سے کچھ ہی بعد پہنچا صبح اُٹھا تو سب جیل کے انچارج اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ رام لال کپور نے یاد کیا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ وہ بورسٹل جیل میں رہا اور تب سے واقف تھا جیل خانوں کے انسپکٹر جنرل کرنل پوری کا چہیتا تھا۔ انہیں پاپا کہتا عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی اثنائے ملازمت ہی میں جواں مرگ ہو گیا سب جیلوں میں مستقل سپرنٹنڈنٹ نہیں ہوتے عموماً ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ایکٹنگ سپرنٹنڈنٹ کے فرائض سرانجام دیتے ہیں لالہ لکھمی داس اے ڈی ایم گجرات یہاں سپرنٹنڈنٹ تھے مقدمہ انہی کی عدالت میں تھا پیش ہوا تو وہ کچھ روکھے پن سے پیش آئے میں واپس آ گیا۔ کپور سے ذکر کیا کہ ذرا اُن کے کان کھول دیں۔

برطانوی فرزند

انگریزوں نے اپنی اعلیٰ ملازمتوں میں اس قسم کے ہندوستانی اور پاکستانی پیدا کئے تھے جو اس حسرت میں گھلے جاتے تھے کہ کاش وہ کسی انگریز کا جگر گوشہ ہوتے؛ ان کے لاشعور میں انگریز ماں باپ کا بیٹا نہ ہونے کی خلش تھی۔ اپنے ہی ملکیوں کے ساتھ ان کا سلوک انتہائی نفرت انگیز رہا۔ وہ کسی غریب کی عزت نہیں کرتے تھے۔ وہ غلام آقا تھے۔ انگریزوں کے غلام، اپنوں کے آقا، برطانوی عہد

میں "پبلک سرونٹ" کا لفظ سب سے زیادہ بے معنی رہا ہے ہر پبلک سرونٹ (اِلّا ماشاءاللہ) جو مرکزی یا صوبائی سروس کا رکن ہوتا اپنے آپ کو خدا سمجھتا اور سائلوں کو بندگانِ پُرتقصیر،

اب میں ایک ایسا سیاسی رکن بن چکا تھا جو اپنی ذات پر اعتماد رکھتا ہو اور اپنی عزتِ نفس کی حفاظت کر سکے۔

میری وارننگ کا وہی نتیجہ نکلا جس کی توقع تھی۔ لکھمی داس جیل دیکھنے آیا تو دور ہی سے انگریزی میں مزاج پُرسی کی، زور سے مصافحہ کیا بار بار کوئی "تکلیف تو نہیں ہے" پوچھتا رہا کپور سے کہا ان کا خیال رکھیئے۔

پُراسرار حوالاتی

بی کلاس میں ایک قیدی تھا اس کے ساتھ کی چکّی میں مجھے جگہ دی گئی یہ قیدی ایک معمّر سکھ تھا اور غبن کے مقدمہ میں ماخوذ ——— تیسرے یا چوتھے روز میرے ساتھ کی کوٹھڑی میں ایک ایسا حوالاتی رکھا گیا جو اوّل تو عام حوالاتیوں کے ساتھ رہنا چاہیئے تھا دوسرے اسکی حرکتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ جیسے وہ میری نگرانی کر رہا ہو یا پھر مجھ پر حملہ کرنے کی فکر میں ہے ——— مَیں نے کپور سے ذکر کیا اس نے کہا ایک وارڈر لگا دیتا ہوں لیکن اس کو یہاں سے ہٹا نہیں سکتا۔ یہ ایک پُراسرار جواب تھا مَیں نے اصلیت معلوم کرنے پر اصرار کیا تو کپور نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ یہ سی آئی ڈی کا فرستادہ معلوم ہوتا ہے۔ بظاہر یہ ایک مقدمہ میں ماخوذ ہے لیکن تمہارے قریب رکھنے کی جس ہدایت کے ساتھ اسے بھیجا گیا ہے اس سے ہمارا شبہ قوی ہوتا ہے۔ ان معاملات میں ہم عاجز ہیں۔ مَیں نے سعی محمد (بظاہر وہ یہی نام بتاتا تھا) کو ڈھب پر لا کر اندازہ کیا کہ میرزا معراج دین کو جانتا ہے میرزا صاحب گجرات ہی کے رہنے والے تھے اور دو روز پہلے گجرات سے ہو گئے تھے یہ جوابات مَیں نے بالواسطہ حاصل

کیئے سعی محمد کچھ زیادہ پڑھا لکھا بلکہ پڑھا لکھا ہی نہ تھا۔ ایک لمبا تڑنگا منبر دار جو ہمارے بلاک کا پہریدار اور ڈاکہ کے مقدمہ میں اپنی قید کے آخری دن گزار رہا تھا سعی محمد کا ہم نوالہ و ہم پیالہ تھا دونوں آپس میں کھُسر پھُسر کرتے شام کو لکھی داس معائنہ کے لئے آیا تو مَیں نے شکایت کی کہ اس شخص کا یہاں رہنا مجھے مشکوک معلوم ہوتا ہے اگر مجھ پر کوئی حملہ ہو گیا تو ذمہ دار کون ہو گا؟

سپرنٹنڈنٹ نے کپور سے پوچھا کیا پیچ ہے؟ کپور نے سپرنٹنڈنٹ کو اشاروں میں کچھ کہا وہ سمجھ گیا کہنے لگا سعی محمد کو دوسری جگہ بھیج دو کپور جھجکا لیکن وہ حکم دے چکا تھا چنانچہ سعی محمد کو فوراً ہی دوسری جگہ بھیج دیا گیا مگر دو گھنٹہ بعد ہی معاملہ صاف ہو گیا۔

گرم دوُدھ

مَیں سردار کے پاس سرنہیواڑے اخبار پڑھ رہا تھا صرف صافہ باندھ رکھا تھا۔ خان محمد (قیدی منبردار) گرم دودھ کی اُبلتی ہوئی پتیلی لے کر عقب سے آیا اور میرے قریب پہنچ کر اس زور سے ٹھوکر کھائی کہ اُبلتا ہوا دو تین سیر دودھ میری پیٹھ پر گر گیا۔ کولھوں کا حصہ جو تڑوں تک اس بُری طرح جُھلس گیا کہ میں تڑپنے لگا بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچا ڈسپنسر موجود تھا اُس نے فوراً پٹی کر دی، ڈاکٹر کو بلا بھیجا اس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی تھوڑی دیر بعد مجھے غش آگیا آنکھ کھُلی تو ڈسپنسر سرہانے کھڑا تھا ڈاکٹر ابھی تک نہ آیا تھا مَیں نے احتجاج کیا بے سود، نو بجے شب کے لگ بھگ ڈسپنسر بھی چلا گیا اِدھر میرا پیشاب رک گیا ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا اور تڑپتا ہی رہا ڈاکٹر پھر بھی نہ آیا ڈسپنسر آیا اور ربڑ کی نالیوں سے پیشاب نکالنے لگا تکلیف بڑھتی گئی۔ اتنے میں رام لال کپور آگیا۔

مَیں نے اس بوچڑی کے خلاف شکایت کی۔ اُس نے ڈسپنسر سے پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟ وہ کیوں نہیں آتے؟ ڈسپنسر نے کہا کہ میں انہیں خود جا کر کہہ چکا ہوں مرضی کے مالک

ہیں مجھے لوٹا دیا ہے کہ خود دیکھ لو ——— معاً ڈاکٹر عالم کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ جو منشی احمد دین نے سنایا تھا۔

آتشک کا ٹیکہ

۱۹۳۱ء کی نمکین ستیہ گرہ کے زمانے میں ڈاکٹر عالم گجرات جیل میں بیمار ہو گئے تو انہیں بغرض علاج گجرات سے لاہور میو ہسپتال بھیج دیا گیا۔ یہاں غالباً عبداللہ نام کا ایک ڈاکٹر انہیں آتشک کا ٹیکہ لگانے پر تیار ہو گیا۔ یہی کام اُس سے پہلے ایک ہندو ڈاکٹر روشن لال کے سپرد کیا جا رہا تھا اُس نے نہ صرف انکار کیا بلکہ ڈاکٹر عالم کو بھی آگاہ کر دیا، ڈاکٹر صاحب چوکنّا ہو گئے، عبداللہ ٹیکہ لگانے آیا تو ڈاکٹر صاحب نے نہ صرف سرنج چھین لی بلکہ ہنٹر نکال کر سٹر سٹر مارنا شروع کیا ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔
——— ڈسپنسر سے ڈاکٹر کا جواب سنا تو مجھے اُس کے سنگدلانہ رویے پر سخت طیش آیا۔ مَیں نے کپور سے کہا مَیں سمجھ رہا ہوں کہ مجھے مار دینے کی سازش کی گئی ہے۔ مَیں اپنے اعزہ کو مطلع کر چکا ہوں مجھے کسی بالا سازش کے تحت قتل کیا گیا یا اِس طرح ختم کر دینے کا روّیہ جاری رہا تو قاتل آپ ہوں گے ذمہ داری آپ پر ہو گی۔ یہ کہہ کر مَیں نے زور زور سے نعرے لگانا شروع کئے سرکار مردہ باد ڈاکٹر مردہ باد معراج دین مردہ باد وزارت مردہ باد یہ مردہ باد اور وہ مردہ باد۔ صرف انقلاب زندہ باد۔

شرمناک سنگدلی

کپور گھبرا گیا کہنے لگا گھبراؤ نہیں میں خود جا کر ڈاکٹر کو بلاتا ہوں ڈاکٹر آگیا اسے دیکھتے ہی میرا پارہ تیز ہو گیا ڈاکٹر صاحب مَیں کل دن سے مر رہا ہوں اس وقت رات کے دو بجے ہیں آپ کو

اتنی دفعہ بلایا گیا مگر آپ نے توجہ ہی نہیں کی آخر اس سنگدلی کا آپ کے پاس کوئی جواز ہے؟ ڈاکٹر نے سُنی اَن سُنی کر دی مجھے غصہ آگیا میں نے زخموں سے چور ہونے کے باوجود ڈاکٹر صاحب کو اس زور سے لات رسید کی کہ وہ چوتڑوں کے بل گر پڑا میں اُس وقت مرنے مارنے پر تلا بیٹھا تھا میری آنکھوں میں خون اُتر رہا تھا ڈاکٹر نے پہلے تو ذرا تمکنت دکھائی پھر نرم پڑ گیا منت سماجت کرنے لگا میں مصر رہا کہ اب اس سے علاج نہیں کراؤں گا مجھے مار دے گا میرزا معراجدین کا ایجنٹ ہے کپور نے جب دیکھا کہ میری تکلیف بڑھتی جا رہی ہے اور پیشاب ابھی تک نہیں آ رہا تو وہ صورتحال کو خراب پا کر سول سرجن کے ہاں گیا وہ لالہ تھا کپور کے ساتھ چلا آیا۔ اُس نے ڈاکٹر کو بُرا بھلا کہا ——

حتّٰی کہ ہسپتالوں کے انسپکٹر جنرل کو رپورٹ کر دی۔ ڈاکٹر کو اس پر وارننگ ہوئی یا شاید کوئی اور سزا دی گئی اس ذات شریف نے اخباروں میں اس مطلب کے مراسلات چھپوانے شروع کر دیئے کہ ضلع گجرات کا ہندو سول سرجن مسلمان عملہ کے ساتھ متعصبانہ سلوک کر رہا ہے جس سے عملہ میں اضطراب پھیلا ہوا ہے اور ملازمین اپنی نوکری خطرے میں سمجھتے ہیں۔

پاگل قیدی

خیر یہ ایک ”جملہ معترضہ“ تھا سول سرجن ایک آدھ گھنٹے کی کشمکش کے بعد پیشاب لانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر اُس نے میری پشت کے سوختہ حصہ پر پٹی کی، جس سے مجھے نیند آ گئی۔ ابھی آنکھ لگی ہی تھی کہ دھڑام سے میرے سر پر ایک سٹول آ رہا اور ماتھا لہولہان ہو گیا —— یہ ”کارنامہ“ ایک پاگل قیدی کا بیان کیا گیا جو میرے ساتھ کی بیرک میں بند تھا۔ میرے بلبلاتے پر جیل میں سیٹیاں بجنے لگیں اُسی وقت داروغہ آ گیا اور اس پاگل کو جو پاگل نہیں تھا وہاں سے نکال کر چکی بند کر دیا گیا۔ لازماً یہ ڈاکٹر صاحب کی شرارت تھی —— معلوم ہوا کہ سعی محمد خاں مجھ سے الگ ہوتے

ہی "ضمانت" پر رہا ہو گیا خان محمد کا تبادلہ کر دیا گیا اور "پاگل" کا پتہ نہیں چلا کہ پھر کہاں ہے؟ مقدمہ کوئی چار مہینے چلتا رہا میں نے صفائی میں کوئی گواہ پیش نہ کیا۔ اس ویرانے میں صفائی کا کوئی گواہ ڈھونڈھنا عبث تھا۔ گجرات سوہنی کا شہر ہے جہاں مٹی کے گھڑے بھی عشاق سے دغا کر جاتے ہیں۔ جتنے دنوں وہاں رہا کسی نے ملاقات نہ کی۔ ایک دفعہ شاید کوئی احرار دوست آیا تھا مگر میں اُسے بالکل ہی نہیں جانتا تھا غالباً چودھری افضل حق نے لاہور سے اُسے لکھا تھا۔ پرانے ساتھی غائب ہو چکے تھے جس نوجوان کی وجہ سے گجرات میں اتحاد ملت کا چرچا تھا وہ ایک ہی "جھٹکے" میں ڈپٹی کمشنر کے ہاں کلرک ہو گیا ——— البتہ حیرت شاہ وارثی کسی کام کے لئے گجرات آئے تو مجھے بھی ملے۔ دیر تک محبت کی باتیں کرتے رہے۔ شعر و شاعری کی ایک مختصر صحبت ہو گئی۔

شاعر اور چناب

رات کا اندھیرا ہوتے ہی احساسات کی شمعیں روشن ہو جاتیں خیالات کا بازار جگمگا اُٹھتا شاعر جاگ اُٹھتا اور کچھ دیر کے لئے چناب کے کناروں پر چلا جاتا موجوں کو گنگناتا ہوا پاتا کھیتوں کی ہریالی سے گمشدہ محبتوں کا پتہ پوچھتا اِدھر اُدھر کے کھنڈروں سے مرحوم دلوں کی دھڑکنیں سنتا ——— کبھی یہ محسوس ہوتا کہ مہینوال چناب کے اس پار کھڑا عشق کا ساز اُٹھا رہا ہے کبھی آنکھیں ملنے لگتا کہ سوہنی دریا کی خشمگیں موجوں میں گھری ہوئی ہے گھڑا "کھُر" "دگھل" رہا ہے طوفانی لہریں سوہنی کے ہونٹوں کو بوسہ دیتی اور ٹوٹتی چلی جاتی ہیں۔ کبھی کسی موج سے کھرج کی لے بلند ہوتی ہے کبھی کوئی موج پنچم بن جاتی ہے ——— سوہنی کہتی ہے میں جاؤں گی اور ضرور جاؤنگی مہینوال میرا انتظار کر رہا ہے ——— "موجیں کہتی ہیں" او مٹیار رک جا تیرے ساتھ تیرے ماں باپ کی لاج بھی جا رہی ہے تو اپنے ساتھ محض حُسن ہی نہیں آبرو بھی لئے جا رہی ہے لیکن سوہنی اُڑی جا رہی ہے ——— فطرت گھڑے

کے کان میں جانے کیا کہتی ہے کہ گھڑا پگھلنے لگتا ہے پانی میں گھل رہا ہے جیسے کہہ رہا ہو" مجھے کمہار نے بنایا ہے مَیں انسان نہیں گھڑا ہوں اپنے خالق سے دغا نہیں کروں گا میں اس شخص کی بیٹی کو نہیں لے جاؤں گا جس نے مجھے بنایا ہے خود ڈوب جاؤں گا اسے ڈبو دوں گا لیکن مہینوال کا پرایا ہاتھ میرے آقا کی بیٹی کو چھو نہیں سکے گا سوہنی ڈوب جا سوہنی ڈوب جاتی ہے۔ موجیں کہتی ہیں شاعر تو یہاں کیا لے رہا ہے جا میری وفا کے گیت تراش، بزدل کا سفینہ کنارے پہ ڈوبتا ہے بہادر کا منجدھار میں ——— اچانک شاعر شورش سو جاتا سیاسی شورش جاگ اُٹھتا اور سوچتا کہ چناب کی یہ لہریں میری غلامی کی زنجیریں ہیں، مَیں ان زنجیروں کو توڑ دوں گا اب یہاں مہینوال نہیں جوان پیدا ہوتے ہیں، جن کی قیمت ستر ہ روپے ہے جو کعبہ کا غلاف پھاڑتے بغداد پر گولی چلاتے گیلی پولی میں گردنیں کاٹتے اور خلیفۃ المسلمین کی بیٹی کو قسطنطنیہ کے بازاروں میں بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہیں اور جب یہ "غزوات" انجام دے چکتے ہیں تو اپنے بازوؤں پر بندھے ہوئے تعویذوں کو چومتے ہیں جو اُن کے پیروں نے انہیں دیئے تھے کہ ترکوں اور عربوں کی گولیاں ان تک آتے آتے ٹھنڈی ہو جائیں گی لیکن ان کی گولیاں اُن کے سینوں کو چھلنی کر دیں گی۔ پھر معاً مَیں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتا جیسے کوئی مجھے جگا رہا ہو یا کسی نے مجھے جگا دیا ہو ——— ہائے ماہیا! گجرات کا ظالم دو سخنہ رات کے سناٹے میں پھڑپھڑاتی ہوئی دلگداز آواز کسی پہلو بھی چین نہیں لینے دیتی جس طرح سونے کو سہاگہ چمکا دیتا ہے اسی طرح قید تنہائی میں ماہیا درد کو چمکاتا بلکہ بھڑکاتا ہے۔

انسان شاعر ہو تو خوبصورت آنکھیں بڑا تنگ کرتی ہیں ——— جو کنسٹیبل مجھے جیل سے عدالت میں لے جاتا اور واپس لاتا نوعمر تھا انیس بیس سال کے پیٹے میں ہوگا۔ قدرت نے اس کو اپنے ہاتھ سے بنا کر آنکھیں دی تھیں۔ اردو غزل میں آنکھوں کی مستی، پلکوں کی خنجر زنی، نظروں کی دل فریبی، اور مژگان کی تیر اندازی پر جو کچھ لکھا گیا سب اُس کی آہو چشمی کا اثاثہ تھا وہ مجھے ہتھکڑی

لگتا میں اُسے ٹکڑ ٹکر دیکھتا اور قدرت کا ممنون ہوتا کہ اُس نے اِس حال میں بھی کتنا کرم کیا ہے! کچہری جاتے ہوئے میں راستہ کی لمبائی کے لئے دعائیں کرتا مجھے مقدمہ کی سماعت سے کوئی دلچسپی نہ تھی میں صرف اُسی کو دیکھا کرتا۔ واپسی پر ہتھکڑی کھولتا تو مجھے افسوس ہوتا کاش! ان حلقوں کی عمر دراز ہوتی۔ میر تقی میر کو پیرو مرشد مانتا، شاید ہی کوئی دیوان ہو جو میں نے اِن دنوں نہ پڑھا ہو یہی میرے حافظہ کا سن آغاز ہے میرا حافظہ اشعار کے اعتبار سے گنج قارون ہو گیا۔

سہانے دن جلد گزر جاتے ہیں، وصال میں فراق کی ہلکی سی ترشی ہو تو دن رک کے چلتے ہیں لیکن جب محض وصال ہی رہ جائے تو آنکھ کی جھپکی میں عمر بھر کی حکایت ختم ہو جاتی ہے ——

ایک سال قید

اڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے مجھے ایک سال بامشقت قید کا حکم سنایا گیا اگلے روز مجھے لاہور منتقل کر دیا گیا خیال تھا شاید وہی کنسٹیبل ہمراہ ہو مگر عام شاعرانہ آرزوؤں کی طرح یہ آرزو بھی مر گئی میں ایک دوسری گارد کے سپرد بیڑیاں کھنکھناتا اور ہتھکڑیاں جھنجھناتا لاہور روانہ ہو گیا۔

پولیس نے اسٹیشن تک سواری کا انتظام نہ کیا سی کلاس قیدی تھا پیدل جا رہا تھا ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پاؤں میں بیڑیاں کتابوں کا ایک ڈھیر اُٹھا رکھا تھا۔ چہرے مہرے سے سولہ برس کا دکھائی دیتا اپنے کپڑے پہن رکھے تھے ایک خوش پوش مجرم یا ملزم کا اشتباہ ہوتا تھا —— لوگوں کو کیا خبر کہ کون ہے؟ کدھر سے آ رہا ہے؟ اور کہاں جا رہا ہے؟ کسی راہگیر کی نگاہ اُٹھتی تو ایک نفریں قہقہہ کے ساتھ لوٹ جاتی یہ میرا پہلا تجربہ تھا کہ میں بیڑیاں پہن کر کھلے بازار میں اس طرح چل رہا تھا مجھے احساس ہی نہ تھا کہ پاؤں زخم کھا رہے ہیں۔ چھوٹے نہ بندھے ہوں تو ٹخنے اور ایڑیاں لہولہان ہو جاتی ہیں میں نے احتیاطاً چھوٹے باندھ لئے تھے پھر بھی خراش کی لذت چکھتا چلا جا رہا تھا —— سامنے سے دو عورتیں

آرہی تھیں ایک معمّر دوسری جوان ——— معمر نے جوان سے کہا

" دیکھ! گھبرو جوان ہے لیکن بُرے کاموں کے برے نتیجے جو بویا اب کاٹ رہا ہے"

"کسی گناہ میں پکڑا ہوگا" ——— جوان نے کہا

" چوری کی ہوگی ؛ یا کسی کی ماں بہن کو چھیڑا ہوگا" بڑھیا بولی،

کنسٹیبل نے معمر کی بات کاٹتے ہوئے کہا

"نہیں ماں جی! خلافت کا قیدی ہے"

مغربی پاکستان کے بعض پسماندہ اضلاع میں قومی تحریکوں کے قیدیوں کو عموماً خلافت ہی کا قیدی کہا جاتا تھا ابھی تک تحریک خلافت اور تنظیم خلافت کے الفاظ کا اثر باقی تھا، یا پھر ان قیدیوں کو گاندھی جی کا "پیرو" کہا جاتا۔

بڑھیا نے سُنا تو جھریوں کا روپ بدل گیا جیسے معمر چہرے پر رونق آگئی ہو ——— اُس نے دعا دیتے ہوئے کہا

"خدا عمر دراز کرے بیٹا! مشکلیں آسان ہوں، وہ مائیں نہیں شیرنیاں ہیں، جو تم جیسے بچوں کو پیدا کرتی ہیں" ———

میرا چہرہ قدرتاً بشاش ہوگیا راستہ بھر سوچتا رہا کہ انسان جذبات و واقعات کے ساتھ تبدیل ہو جاتا ہے اور صرف الفاظ کے فرق سے نفسیات کتنی جلدی متغیر ہو جاتی ہیں ———

دل کے معاملات

اس زمانہ میں مسافر گاڑیوں کے ڈبے عموماً خالی ہوتے تھے عام لوگوں کو بہ آسانی جگہ مل جاتی، مسافر بہ اطمینان بیٹھ جاتے تھے پولیس والوں نے تھرڈ کلاس کے ایک چھوٹے سے ڈبے پر قبضہ کرلیا۔

مردوں کو تو انھوں نے گھٹنے ٹیک دیا مگر دو نوجوان لڑکیاں اپنی ماں کے ہمراہ سامنے کی نشست پر آ بیٹھیں، گارڈ نے بہت چاہا کہ زنانہ ڈبے میں چلی جائیں مگر وہ کسی طرح نہ مانیں، پولیس کو "جھکنا" ہی پڑا گاڑی چلی تو نگاہوں کا تعاقب شروع ہو گیا یہ غلط ہے کہ محبت کی جاتی ہے محبت ہو جاتی ہے اس کا وار اتنا سخت ہوتا ہے کہ اسکی جھونک شاذ ہی کوئی سنبھال سکتا ہے۔ نگاہیں اتنی ظالم ہیں کہ زاہد خشک بھی آناً فاناً چوکڑی بھول جاتے ہیں۔ عابد دل ٹٹولنے لگتے ہیں دانشوروں کی عقل شکست کھا جاتی ہے فلاسفروں کا تخیل سپر انداز ہو جاتا ہے رہ گئے شاعر تو وہ گویا ان کے خانہ زاد ہیں اور ادیب حلقہ بگوش ——— بڑے بڑے سپہ سالار بھی ان کے اڑنگے پر آ کر پٹخنی کھا جاتے ہیں اپنی صفوں میں خالد بن ولید ہوں پرائی صفوں میں نپولین بونا پارٹ، حسن دونوں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ غالب سا شاعر، اقبال سا مفکر، کارل مارکس سا پیغمبر بے جبرائیل، شبلی سا سیرت نگار اور ابوالکلام سا عبقری یہ سب اپنی رفعتوں کے باوصف عشق کے کوچہ میں تلوے سہلاتے رہے ہیں ———

جن لوگوں نے میدان جنگ کو لرزا دیا اکثر پلکوں کی ہیبت کے سامنے دم بخود ہو گئے، یہ معرکہ میرے لئے نیا تھا میں نے قیافہ سے صحیح اندازہ کیا کہ معمر عورت ان کی ماں ہے اور بیٹیوں میں عمر کے اعتبار سے خاصا فاصلہ ہے۔

اُن کا آپس میں نام لینا ظاہر کرتا تھا کہ چھوٹی کا نام ثریا بڑی کا نام خورشید ہے۔

خورشید کے چہرے پر حیا نے ہالہ کر رکھا تھا لیکن اندر خانہ چنچل نظر آ رہی تھی گجرات سے لاہور تک نگاہوں ہی نگاہوں میں دیوان مرتب ہو گیا ——— ستر میل کا فاصلہ جیسے کوئی فاصلہ ہی نہ تھا بغیر الفاظ کے گفتگو ہوتی رہی، نگاہوں نے صدیوں کی منزلیں ہفتوں میں طے کر لیں، نظر اُٹھی مطلع ہو گیا، نظر گری مقطع آ رہا، پھر جب لاہور کا اسٹیشن آیا تو میں نے محسوس کیا کہ دل گرفت سے باہر ہے اور مجھ سے دغا کر کے خورشید کے ہمراہ جا رہا ہے خورشید گاڑی سے اُتری اپنی تمام نظریں یکجا کر کے میرے

چہرے پر گاڑ دیں نظریں جو کہنا چاہتی تھیں ایکا ایکی کہہ گئیں ۔ پھر ان میں نم آگیا میں نے اس نم کو چُن لینا چاہا مگر چُن نہ سکا ۔ خوبصورت یادوں کے کشکول میں یہ موتی ہمیشہ کے لئے رہ گئے جب کبھی قید کی تنہائیاں کاٹنے کو دوڑتیں ان کی چمک سے اندھیروں کو روشن کرتا ۔ اکثر راتیں اِن سے جگمگایا کرتیں ——

لاہور سنٹرل جیل کھلا بند ہو گیا وہی پرانا چودہ نمبر جہاں چھ سات ماہ پہلے رہ چکا تھا۔ اب یہاں ایک اور قیدی بھگوان سنگھ لونگوالیہ ۱۲۴/الف، میں دو سال کے لئے قید تھا اور کئی مرتبہ سزا کاٹ چکا تھا جیل اور ریل دو جگہیں ہیں جہاں انسان جلد ہی "دوست" بن جاتے ہیں۔ ریل کی دوستی زبان کے ذائقے کی ہوتی ہے ذائقہ بدلا بات گئی جیل کی دوستی پائدار ہوتی اور اس رشتے کو درد مشترک استوار کرتا ہے۔ بھگوان سنگھ لونگوالیہ خاصی عمر کا بہادر شخص تھا۔ اس کی موجودگی کا فائدہ یہ ہوا کہ تنہائی کا احساس جاتا رہا۔ ہم آپس میں سیاسیات پر بات چیت کرتے جس سے دن کا ایک بڑا حصہ بخوشی کٹ جاتا۔ لونگوالیہ سے سکھ پالیٹکس بکمال وتمام معلوم ہو گیا ہم دونو کے مذاق میں بڑا فرق تھا وہ صرف سیاسی کارکن تھا اُسے کتابوں سے کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی مَیں سیاسی بن رہا تھا اور تھا ادبی، کتابوں کے بغیر گویا مَیں تھا ہی نہیں، پھر میں ایک رومان میں سے گزر رہا تھا ——— !

——— تیسرے روز مجھے دو خط ملے ایک والد کا کہ ہفتے کے روز ملاقات کو آ رہے ہیں دوسرا انور رشید کا کہ آپ کے ساتھ سفر کر کے کچھ پایا اور بہت کچھ کھو دیا ہے آپ کی تقریریں بھی سُن چکی

ہوں دل پر ان کا نقش ہے کیا ایسی صورت ہوسکتی ہے کہ مَیں آپ سے جیل میں مل سکوں؛ یہ میرا شوق ہی نہیں آرزو بھی ہے۔

مَیں اس خط کے بارے میں دو ذہنی کا شکار رہا ہوسکتا ہے کوئی چال ہو؛ ممکن ہے خورشید ہی ہو' جواب دینے سے احتراز کیا ہفتہ عشرہ بعد ایک اور خط آگیا تغافل کا شکوہ تھا مَیں نے پھر احتراز کیا اُس نے علی التواتر کئی خط بھیجے' بالآخر مَیں نے ایک پوسٹ کارڈ لکھا کہ جیل کے قواعد ہی کچھ ایسے ہیں کہ ملاقات کی اجازت مشکل سے ملتی ہے آپ کے مخلصانہ جذبات نے قید کی تنہا ہیوں کو خوش کر دیا ہے۔ اِس کرم فرمائی کے لیئے شکر گزار ہوں یہ خط اس کے لیئے گویا مصرع طرح ہو گیا۔ سال بھر خطوط کا تانتا بندھا رہا کتنے ہی خط جمع ہو گئے۔

۱۴ نمبر

مَیں چودہ نمبر سے نکلنا چاہتا تھا۔ یہ جیل میں جہنم تھا۔ کوئی دو ماہ کے لگ بھگ وہاں رہا۔ لونگو الیہ کا چالان ہو گیا' یا شاید اُسے بی کلاس مل گئی اور وہ اپنے درجے کے قیدیوں میں چلا گیا جیلر نے مجھے چکر منشی بنا کر پہلے احاطہ میں بھیج دیا۔ مَیں اب دوزخ سے اعراف میں تھا بلکہ مقابلتہً بہشت میں۔ ایک تو احاطہ کی آٹھ بیرکوں کا منشی دوسرے ہر روز نئے حوالاتی آتے جاتے نئے چہروں کو دیکھنے سے باہر کے حالات معلوم ہوتے پھر چکر منشی ایک بڑی چیز تھی۔ جیل میں دو بڑے احاطے تھے باقی تمام حصے تقریباً چکیوں پر مشتمل تھے ان میں سب سے بڑا سیاست خانہ تھا جہاں نو وارد قیدی ہفتہ عشرہ کے لیئے رکھے جاتے' یا پھر جن قیدیوں کو ضابطہ شکنی میں بند کیا جاتا دوسرے احاطے میں زیادہ تر لمبی قید کے مستقل قیدی رہتے تھے ہر بارک کے ساتھ کارخانہ تھا جہاں قیدی مختلف مشقتیں کرتے پہلے احاطہ میں بھی بارکوں کے ساتھ کارخانے تھے مگر ان میں زیادہ تر نمبر دار رہتے یا گنتی بڑھ جانے کی صورت میں قیدی رکھے جاتے

یا اُن میں بان بٹنے مُنج کوٹنے اور دری بُننے کا کام ہوتا تھا۔ نمبرداروں کے احاطہ کا نام بڑھی خانہ تھا۔ پھانسی گھر کے دائیں طرف اور سنٹرل جیل پریس سے ملحق شاہی قیدیوں کا بلاک تھا۔ یہ ریسٹ ہاؤس کے طرز کی دو چھوٹی عمارتیں تھیں جن کے بغل میں پریس تھا اسکی پشت پر بی کلاس قیدیوں کی بارک تھی اُس کے سامنے دوسرے احاطہ میں گورہ وارڈ اور اے کلاس کے پولیٹیکل قیدیوں کا بلاک تھا۔ اس کے ساتھ ہسپتال اور ہسپتال کے بائیں بازو کی طرف دھوبی گھاٹ، لنگر خانہ، وردی گودام، پرانی حوالات' اور ٹیررسٹ وارڈ' جسے ہم کیس کا احاطہ بھی کہتے واقع تھے۔ ان کے پیچھے سبزیوں کا ذخیرہ اور پانی کا ٹینک تھا پھر ڈیوڑھی کی طرف "کوٹھے موقع" کے ساتھ ساتھ پرانا شاہی احاطہ' رنگت خانہ' اور خراس گھر تھا۔ ڈیوڑھی اور ہسپتال کے وسط میں جیل خانے کا نگران چیف ہیڈوارڈر بیٹھتا۔ اس جگہ کو چکر کہتے۔ یہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جہاں کوئی نصف درجن قیدی منشی تمام جیل کی گنتی کا حساب رکھتے ——— ڈیوڑھی کے دائیں بازو کی طرف نیا چودہ نمبر یعنی پھانسی کے قیدیوں کا بلاک تھا۔ غرض تمام جیل اسی طرح پھیلا ہوا تھا——— ایک بڑے گاؤں کی طرح جو نئے طرز پر آباد کیا گیا ہو لیکن اس میں کچی اور پکی دونو طرح کی عمارتیں ہوں۔

اسیر اللغات

جیل خانے کا اپنا ایک لغت ہوتا ہے ماحول کے مطابق خاص خاص الفاظ خاص خاص مفہوم کے ساتھ رواج پا جاتے ہیں۔ مثلاً پنجاب میں قیدیوں کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی یکبارہ یا اک باریا۔ دوسری دوبارہ ——— دوبارہ قیدی اُسے کہتے ہیں جو دھوکے چوری جیب تراشی اور اسی قسم کے لچر جرائم کا عادی ہو اور ایک سے زائد دفعہ قید کاٹ چکا ہو ان دوبارہ قیدیوں کے لئے بعض جیلیں مخصوص تھیں مثلاً صوبہ کے کسی حصہ میں کوئی دوبارہ قیدی ہو اُسے عموماً منٹگمری جیل بھجوا دیا جاتا۔ یکبارہ قیدی

اُسے کہتے ہیں جو بعض مردانہ دفعات میں ماخوذ ہو مثلاً قتل، سیاسی دفعات یا ایسے جرم جو خرابی اخلاق کے عام تصور سے خارج ہوں یکبارہ قیدی کے لیے ضروری نہیں کہ وہ پہلی دفعہ کا سزا یافتہ ہو ——— اُس کا انحصار دفعات کی نوعیت پر ہے ——— حوالاتی اُس ملزم کو کہتے ہیں جس کے خلاف مقدمہ چل رہا ہو۔

انسان ——— انسان کو کس طرح کاٹتا اور معافی (کٹوتی) کا لالچ ایک قیدی کو دوسرے قیدی پر کس طرح حکمرانی کی ترغیب دیتا ہے اس کا اندازہ قیدی عہدیداروں کے وجود سے ہوتا ہے۔

قید کی دو قسمیں ہیں۔ قید محض اور قید سخت۔ کوئی ناکارہ شخص ہی قید محض کاٹتا ہوگا ورنہ ہر "محض قیدی" اپنی قید بامشقت کرا لیتا ہے۔ قید محض میں قیدی کے لئے کوئی فائدہ نہیں، نہ خوراک پوری ملتی ہے نہ عام قیدیوں کی سی آزادی"۔ تمام دن ہاتھ پہ ہاتھ دھرکے بیٹھے رہنا آدمی کو ویسے ہی شَل کر دیتا ہے۔ پھر جیل خانہ خلقتہً بُری بلا ہے باہر کے لوگ قید سخت کا مطلب کوئی عذاب سمجھتے ہیں حالانکہ مراد اس سے یہ ہے کہ قیدی سے کام لیا جائے صرف مشقت کے لفظ نے مفہوم کو مجروح کر دیا ہے ورنہ جیل میں ہر کام مشقت ہے۔ مثلاً قیدیوں کو پڑھانا مشقت ہے چرخہ کاتنا مشقت ہے۔ منشی ہونا مشقت ہے لفافے بنانا، چقیں بننا، سوت اٹیرنا، بان بٹنا، صفائی کرانا، اردلی ہونا، کھانا پکانا، کھانا کھلانا، غرض وہی کام جو ہم باہر کی دنیا میں کرتے ہیں اندر کی دنیا میں مشقت ہیں ——— چونکہ قید کے تصور میں کھُردرا پن ہے اور قید بہر حال ایک سنگینی بلکہ جانکنی کا نام ہے اس لئے لازماً اس سے وحشت ہوتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اُس زمانہ میں جو قیدی نیا نیا جاتا اُس سے ہفتہ عشرہ چکّی پسوانے، کولہو میں جوتنے، یا خراس میں لگا دیتے تھے، یا پھر جیل خانے میں "بدمعاشی" کرنے پر چکّی بند کر دیتے، اور اٹھارہ سیر گیہوں پسواتے مگر اس کا مشقت سے نہیں معناً سزا سے تعلق تھا۔ مشقت کا فائدہ یہ ہے کہ قیدی کو ضابطہ کے مطابق قید میں چھوٹ مل جاتی ہے یعنی سال قید ہو تو اس میں تین ماہ یا اس کے

لگ بھگ کا عرصہ معاف ہو جاتا ہے بشرطیکہ قیدی کا چال چلن ٹھیک رہے اور وہ باقاعدہ مشقت کر تا رہا ہو۔ یہ معافی' چھوٹ'، یا کٹوتی' دراصل مشقت کا معاوضہ ہے جو ہر بامشقت قیدی کو ملتا ہے اور جب وہ جیل میں کوئی بدمعاشی کرتا ہے' تو اسی معافی میں سے دن کاٹے جاتے ہیں' محض قیدی کو ہر حال میں پوری قید بھگتنی پڑتی ہے سخت قیدی کی چھوٹ مقررہ میعاد میں سے کٹ جاتی ہے۔ مثلاً سال قید ہو تو محض قیدی بارہ مہینے گزار کر رہا ہو گا لیکن سخت قیدی نے جتنی معافی حاصل کی ہو گی اسے منفی کر کے باقی میعاد کاٹ کر رہا ہو گا دس مہینے' ساڑھے دس مہینے، نو مہینے' بہر حال اس کا انحصار چھوٹ پر ہے کہ اُس نے کتنے دن کی معافی لی ہے۔ چھوٹ کی مراعات ان قیدیوں کو حاصل ہوتی ہیں جن کی قید چھ ماہ یا اس سے زائد ہو اس سے کم مدت کے اسیروں چھوٹ نہیں ملتی ہے۔

عام قیدیوں کو ہر سہ ماہی پر بارہ دن، بلے والے کو پندرہ دن، کالی والے کو اٹھارہ دن' اور پیلی والے کو چوبیس دن' معافی ملتی ہے اس آخری رعایت میں لانگری (روٹی پکانے والے) اور اب اُستاد و منشی بھی شامل کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر کسی قیدی کا چال چلن سال بھر اچھا رہا ہو تو وہ پندرہ دن مزید معافی کا حقدار ہوتا ہے' جسے جیل کی اصطلاح میں "پندری" کہتے ہیں۔ جیل خانہ کا انسپکٹر جنرل سالانہ انسپکشن کرتا ہے تو ہر قیدی کو کچھ دن کی معافی دے جاتا ہے ہر وہ قول و فعل' یا چیز و ناچیز جس پر جیل خانوں کے اندھے قانون کی مہر نہ ہو بدمعاشی ہے مثلاً اُس زمانہ میں کتاب کاغذ اور پنسل رکھنا بھی بدمعاشی تھا۔ جیل خانے کے حکام خلاف وضع فطری کے مرتکب قیدیوں کو اتنی سخت سزا نہیں دیتے تھے جتنی کاغذ اور پنسل برآمد ہونے پر ایک قیدی کو دی جاتی۔ پولیٹیکل قیدی کے پاس قلم اور کاغذ کا ہونا سنگین قسم کی بدمعاشی تھا۔ ہر قیدی کا ایک ہسٹری شیٹ ہوتا ہے جسے جیل کی اصطلاح میں ٹکٹ کہتے ہیں تمام معافیاں' مشقتیں، سزائیں' تبادلے اور ریمارکس' اس میں درج کئے جاتے ہیں۔ پریڈ کے روز تمام قیدی اپنا اپنا ٹکٹ ہاتھ میں لئے کھڑے ہوتے ہیں۔ صفیں بندھی ہوتی ہیں۔

سپرنٹنڈنٹ آنا اور سامنے سے گزر جاتا ہے بعض قیدی طلب و احتیاج کے مطابق سوال بھی کرتے ہیں۔

وحشی تصویریں

سنٹرل جیلوں کے سپرنٹنڈنٹ عام طور پر آئی ایم ایس تھے دوسری جنگ عظیم کے دوران آئی ایم ایس آفیسر قریب قریب سبکدوش ہو گئے مدۃ العمر دستور یہ رہا کہ سنٹرل جیل کا سپرنٹنڈنٹ اور میڈیکل آفیسر ایک ہی شخص ہو۔ ڈسٹرکٹ جیل کا سپرنٹنڈنٹ اور میڈیکل آفیسر عموماً الگ الگ ہوتا بعض جگہ سول سرجن کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جاتا۔ سب جیلوں میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو سپرنٹنڈنٹ کے زائد فرائض تفویض کئے جاتے۔ انگریزی عہد میں کسی راجہ یا نواب کو بھی اپنی ریاست کے لوگوں پر وہ حقوق حاصل نہیں تھے جو جیل خانے کی مخلوق پر سپرنٹنڈنٹ یا جیلر کو حاصل رہے۔ کرنل بار کر کی سبکدوشی کے بعد کرنل پوری انسپکٹر جنرل اور کرنل چوپڑہ ڈپٹی انسپکٹر جنرل بنا دیئے گئے۔ کرنل سوندھی لاہور سنٹرل جیل کے سپرنٹنڈنٹ تھے اس تثلیث نے جیلوں کو خوفزدہ رکھا لیکن سیاسی قیدیوں کے ساتھ رعائتیں بھی کیں، لالہ منوہر لال وزیر خزانہ اور جیل خانہ مقرر ہوئے تو ان کا زور بندھ گیا۔ چونکہ یہ ہندو ذہن رکھتے تھے اس لئے انہوں نے ملازمت میں فرقہ واریت کو ہوا دینے میں حصہ لیا اپنے عہد میں نہ تو کسی مسلمان سپرنٹنڈنٹ کو اُبھرنے دیتے اور نہ کسی مسلمان افسر کو آسانی سے ترقی دیتے تھے نتیجۃً مسلمان افسروں کے دل ان کے خلاف تھے قیدیوں سے بھی ان کے سلوک کا یہی حال تھا ہندو مجرمین مقابلتاً کم ہوتے سیاسی قیدیوں میں ان کی اکثریت ہوتی اور اپنی خارجی طاقت کے باعث ڈٹ کے رہتے۔ سوندھی سکھ قیدیوں سے بہت نالاں تھا کیونکہ وہ سرکش تھے۔ مسلمان قیدی زیادہ تر عاجزی سے دن کاٹنے کی کوشش کرتے افسروں کے اردلی عموماً مسلمان ہوتے ایک دن کی معافی کے لئے ساتھی کا گلا کاٹ سکتے اور جیل کی خبروں سے افسروں کو ہر لحظہ باخبر رکھتے تھے۔ سکھوں نے انفرادی اور اجتماعی طور پر

پر بید کھا کے جیل کا انتظام ہی بدل ڈالا تھا بہت سی سہولتیں انہی کی وجہ سے جیلوں کو حاصل ہوئی تھیں قید کاٹنے کے معاملہ میں وہ بڑے بہادر تصور کئے جاتے اور بے شبہ بہادر بھی تھے ــــــــ جیل کے اکثر ہنگامے انہی کے دم قدم سے تھے وہ خراب خوراک پر احتجاج کرنے، اور بڑی جرأت سے بھوک ہڑتال کر کے اپنی بات منوا لیتے۔ وہ کسی افسر سے گالی نہیں کھاتے تھے کولھو میں جُتنے، خراس چلانے، اور چکی پیسنے میں انہیں کمال حاصل تھا مشقت سے وہ کبھی جی نہ چراتے، قصوری لائن میں بھی انہیں کا چرچا تھا بید بڑے حوصلے سے کھاتے اور بید کھانے سے پہلے عموماً افیون کھا لیتے جس سے ایک غنودگی سی پیدا ہو جاتی۔

بید مارنے پر بھنگی قیدی مقرر تھا۔ بید دو طرح کے ہوتے ہیں ایک عدالتی جو خونخوار نہیں ہوتے۔ دوسرے قصوری جو جیل خانے میں قصور کرنے پر لگائے جاتے ہیں۔ یہ بید بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ قیدی کو ململ کا لنگوٹ بندھا کر ٹکٹکی پر باندھ دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر رسماً دیکھ لیتا ہے دو خاکروب رک رک کر آمنے سامنے سے بید مارتے ہیں۔ بید زور سے پڑتا ہے لیکن کھینچا ؤ لکیر کھینچنے کی طرح ہوتا ہے۔ نتیجتہً پہلے کھال پھٹتی پھر گوشت کٹتا آخر میں لہو کی پھوار بہہ نکلتی ہے ــــــــ جب ایک دفعہ کوئی "بدمعاش" بید کھا لیتا ہے تو وہ مشکل سے قابو میں آتا ہے اسکو قیدیوں میں ایک طرح کی فوقیت حاصل ہو جاتی ہے خود جیل کے افسر اس سے خوف کھاتے اور گھبراتے ہیں۔ سوندھی سکھوں سے بوجوہ ناراض تھا ایک وہ اس کے وقت میں بارہا اجتماعی بھوک ہڑتالوں اور قواعد شکنیوں کے مرتکب ہو چکے تھے دوسرے وہ خم ٹھونک کے مقابلہ میں ـــ اُترتے رہے تھے۔

زبردست اور زیردست

ایک دفعہ خراب آٹے کی وجہ سے خراب روٹی پکنے لگی تو سکھ قیدیوں نے احتجاج کیا سوندھی نے

ٹکا سا جواب دیا۔ سکھوں نے مشورہ کر کے سارے قیدیوں کو ساتھ ملا لیا۔ روٹی کو صحیح کرانے میں انہی کی ہمت کو دخل تھا۔ ایک زمانہ تھا روٹی میں آدھا آٹا، ایک حصہ چھان، اور ایک حصہ مٹی ہوتی تھی سکھوں نے مورچے باندھ کر ان خرابیوں کو رفع کروایا یہاں بھی انہوں نے تمام جیل میں بھوک ہڑتال کرا دی آن واحد میں نظام مختل ہو گیا اگر کچھ لوگ کھانے پینے پر تیار تھے تو ہڑتالیوں نے اجتماعی قوت سے لانگریوں کا داخلہ روک دیا سالن وغیرہ چھین کر زمین پر ڈھیر کر ڈالا سوندھی پہلے دن تو خود نہ آیا جیلر کو بھیجا جیلر سخت مزاج تھا اس نے اول احاطہ کا رخ کیا اور ذرا درشت لہجے میں ہڑتالیوں سے مخاطب ہوا تو انہیں بھی طیش آگیا آناً فاناً دنگا ہو گیا جیلر نے گالیاں دیں قیدیوں نے لوہے کی پلیٹیں اور کٹوریاں پھینکیں، عجب منظر تھا۔ قیدی کہتے ہیں حرامزادہ، وہ کہتا ہے تم سب حرامزادے ایک طرف غل مچا تیری ماں کی، وہ کہتا ہے تم سب کی ماں کی، ——— اب چاروں طرف سے اینٹیں برسنے لگیں جیلر بھاگ کر وسطی برج پر چڑھ گیا وہ اوپر سے اجتماعی گالی دے رہا ہے قیدی نیچے سے بک بک کر رہے ہیں اتنے میں الارم ہو گیا گاردیں آگئیں سوندھی بھی آپہنچا بگڑے ہوئے قیدی کہاں رکتے ہیں، طرفین میں گالیوں کا تبادلہ ہو رہا ہے۔ آخر شام تک قابو پالیا گیا ایک ایک بارک کا محاصرہ کر کے لیڈر قسم کے سکھ قیدی، چن چن کر نکالے گئے اور گھنٹہ گھر (تمام جیل کا وسط) کے میدان میں ٹکٹکی لگا دی گئی۔

یہ نظارہ بھی عجیب و غریب تھا جس مردانگی اور جرأت سے ان قیدیوں نے بید کھائے، یا مقابلہ کیا، وہ بے شبہ لائق تحسین تھا۔ فیروزپور کا ایک مسلمان نوجوان عبدالغنی بھی ان کا سرغنہ تھا اس نے بیس (۲۰) بید کھانے کے بعد اپنے اوپر فرضی غشی طاری کر لی۔ سوندھی نبض دیکھنے آگے بڑھا تو اس نے پھریری لیکر اس زور سے اُس کے منہ پر طمانچہ مارا کہ بلبلا اُٹھا ———

کئی دن جیل میں کرفیو سا لگا رہا لیکن اس تمام جبر و تشدد اور ظلم و بہیمیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ قیدی جیت گئے روٹی صاف ہو گئی ——— سوندھی کے دل میں ایسی گرہ پڑی کہ اُس نے ملازمت بھر نہ تو کسی

سکھ قیدی کو مُنہ لگایا اور نہ اُن کا کوئی انفرادی سوال کبھی منظور کیا سکھوں کا یہ شعار تھا کہ مقفل ہونے کے بعد جپ جی کا پاٹھ کرتے پھر اکٹھے ہو کر ست سری اکال پکارتے "راج کرے گا خالصہ باقی رہے نہ کو"۔

لاہور کے ایک مسلمان نوجوان نے جو کسی اتفاقی مقدمہ میں ماخوذ تھا پنج تنی نعرہ "یا علی مدد" لگانا شروع کیا۔ اس پر سکھ بگڑے انہوں نے سوندھی سے شکایت کی۔ سوندھی نے کہا "تم اپنا نعرہ یا نعرے بند کر دو"۔ یہ خود بخود بند ہو جائیں گے، یک طرفہ کاروائی نہیں ہو سکتی ——— سکھوں نے کہا "لڑائی ہو جائے گی۔"

سوندھی نے کہا "ناممکن ہے مَیں گولیاں مار مار کر ہلاک کر دوں گا"

جانبین اپنا اپنا نعرہ لگاتے رہے کشیدگی بڑھتی گئی دسویں یا بارھویں روز وہ نوجوان ضمانت پر رہا ہو گیا پھر کسی مسلمان میں یہ شوق نہ تھا کہ نعرہ بلند کرتا اور نہ کبھی کسی نے اِس پر غور ہی کیا تھا۔

چار یاری

مَیں لاہور سنٹرل جیل کی اینٹ اینٹ بلکہ ذرّوں تک سے واقف ہو چکا تھا جو باقی تھا اُس سے واقف ہو رہا تھا۔ مجھے عام طور پر ایک ہنس مکھ قیدی سمجھا جاتا۔ سبھی قیدی مجھ پر اعتماد کرتے اور اپنا خیرخواہ سمجھتے مَیں حتی الامکان قیدیوں کو ان کے مذاق کے مطابق تقسیم کرتا، آٹھ نمبر بارک کو پڑھے لکھے قیدیوں کے لئے مخصوص کر دیا تھا یہاں ہم چار پانچ گہرے دوست تھے پہلا بابا طالب جو میانوالی (یا کیمبلپور؟) کے ضلع کا باشندہ تھا دوسرا ملک محمد اعظم راج جو جلال پور جٹاں گجرات کا رہنے والا تھا تیسرا میگھ راج جسے راولپنڈی سے عمر قید ہوئی تھی۔ چوتھا عبدالباقی جو امرتسر سے سیشن سپرد ہو کے آیا تھا۔

بابا طالب خاں

طالب خاں ہم سب میں بڑا تھا کہولت کی عمر میں اس کی داڑھی کے بال کھچڑی ہو گئے تھے اسی جیل میں ہم کچھ دن پہلے بھی اکٹھے رہے تھے۔ پابند صوم وصلوٰۃ، انتہائی نیک، دوست نواز چیف ہیڈ وارڈر بابا سکندر خاں کا اردلی، جن حوالاتیوں کا گھر سے کھانا آتا انہیں اپنی نگرانی میں کھلاتا خود دوپہر کی روٹی کے لئے ٹماٹر، مولی، پودینہ، پیاز، ہری مرچ، وغیرہ کی چٹنی تیار کر لیتا جو ہم سب مل کر مزے سے کھاتے جیل کا پکوان ہمیشہ ہی بدذائقہ رہا ہفتہ میں دو بار ساگ، دو بار بھنڈی توری، ایک دفعہ حلوہ کدو، اور دو دفعہ ایسا ہی کوئی کچرا جس میں نون نہ مرچ۔ میرے ذائقے نے کسی دور میں بھی ان سبزیوں کو قبول نہ کیا البتہ بعض دالیں بڑے شوق سے کھاتا رہا۔ خصوصیت سے ماش کی دال! مونگ کی دال سے میرا جی گھبراتا تھا بہر حال ہم اپنے لئے کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتے تھے رات کو چائے پکتی جو بابا طالب کے ذمہ ہوتی وہ کسی نہ کسی طرح چائے کا پیکٹ حاصل کر لیتا نئی یا پرانی ٹکٹوں کے گتے اُڑا کے آگ جلاتا، ٹین کے ایک بڑے سے ڈبے میں پانی اُبالتا پھر اس میں چائے اور گڑ ڈال دیتا خوب جوش آچکتا تو ٹین کے ڈبوں کو بھر بھر کر مزے مزے میں چسکیاں بھرتے۔ اتنا لطف آتا کہ جیسے ہم کسی شاہ کے دستر خوان پر ہوں، یہ روز نہیں ہو سکتا تھا اکثر ناغہ بھی ہو جاتا معمول یہی رہا جب تک ہم اکٹھے رہے، چائے میں گڑ، یا گڑ میں چائے پیتے رہے۔ مہینے میں ایک آدھ دفعہ تھوڑا سا دودھ مل جاتا تو چائے کا رنگ بدل لیتے۔ یہ گویا یوم عید ہوتا۔ جیل میں دودھ حاصل کرنا آسان نہیں وہاں دودھ کہاں؟ دو تہائی پانی ایک تہائی دودھ۔ میڈیکل آفیسر جس قیدی کے بارے میں یہ سمجھ لے کہ بیمار یا کمزور ہے تو پاؤ بھر دودھ لگا دیتا ہے، تقسیم کنندگان پانی ملا ملا کر دودھ تقسیم کرتے ہیں۔ بعض قیدی جو نشے کے عادی ہوتے اور سگریٹ کا کش لگائے بغیر جی نہیں سکتے، اپنا پاؤ بھر دودھ لیمپ کے ایک سگریٹ یا دو چار کش میں

فروخت کر دیتے' اور یہ کاروبار جیل میں عام ہوتا تھا ——

قید کیا ہے

قید بظاہر سنگ و خشت میں مقید رہنے کا نام نہیں' انسان اپنے دن ہر طرح کاٹ لیتا ہے۔ قید نام ہے انسان کی اپنی مرضی کے ٹوٹنے اور پرائی مرضی کے چلنے کا۔ انسان نہ اپنی مرضی سے مسکرائے نہ اپنی مرضی سے سوئے' نہ جاگے نہ کھائے نہ پیئے نہ پھرے' نہ اُٹھے نہ بیٹھے' نہ بولے' یہ ہے قید' اور اسی کا نام قید ہے' جس اندھے انسان نے جیل مینوئل بنایا تھا اس نے صرف انتقام و سزا کو سامنے رکھا اور کچھ سوچا ہی نہیں' نہ وہ انسان کی داخلی سرشت سے واقف تھا جو عام لوگوں میں مشترک اور اٹل ہوتی ہے نہ وہ قیدیوں کی اصلاح کا خواہاں تھا۔ کوئی عادت انسانی فطرت بن جاتی ہے تو وہ ٹالی یا بدلی نہیں جا سکتی' بہت کم لوگ اس کے بدلنے یا ٹالنے پر قادر ہوتے ہیں۔ جیل کے حکام و احکام ہی اتفاقی قیدیوں کو عادی قیدی' اور عادی قیدیوں کو ظالم قیدی بنا دیتے ہیں۔ ایک زمانے میں جیل خانے جرائم کا ٹریننگ سکول تھے۔ کیونکہ سزا کا مقصد اصلاح نہیں انتقام تھا ——

سگریٹ نوشی

جیل خانے میں سب سے بُری چیز سگریٹ نوشی ہے۔ سکھوں کی بہادری کا سبب یہ تھا کہ وہ اس سے محفوظ تھے لیکن مسلمان یا ہندو قیدی اس لت کے بُری طرح شکار تھے جیل میں اول درجہ کا سگریٹ نہ آ سکتا تھا نہ کوئی لاتا اور نہ کسی میں استطاعت تھی۔ لیمپ کا سگریٹ جیل کا برانڈ سمجھا جاتا اور یہی چلتا تھا اُن دنوں بازار میں ڈبی کی قیمت ایک آنہ تھی اندر چار آنے یعنی چار گُنا منافع لیکن یہ منافع نہیں' لانے اور بیچنے والوں کا ایک (RISK) تھا اور وہ اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر یہ بیوپار کرتے تھے۔

سگریٹوں کے ڈبے یا تو بڑے دروازے یعنی ڈیوڑھی سے آتے تھے اس صورت میں وارڈر کو دربان اور دربان کی معرفت کسی اسسٹنٹ جیلر یا جیلر سے سودا کرنا پڑتا تھا۔ یا پھر بیرونی پنجہ کے قیدی وارڈروں سے مل کر باہر دیوار سے ڈبہ پھینکا جاتا اور اندر سے "بیوپاری" اُٹھا لیتے تھے کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بھنگی قیدی فضلہ کی بمبیوں یعنی پیپوں میں رکھ کر لے آتے۔ فروخت کا طریقہ اتنا گندہ تھا کہ طبیعت متلا جاتی، یعنی ڈبی لنگوٹ میں مع الید ثلاثہ کے ساتھ باندھ کر گاہک تک پہنچائی جاتی اور یہ تلاشی سے بچنے کا سہل طریقہ تھا سگریٹ ہر شخص نہیں خرید سکتا تھا کوئی ایک خریدتا لیکن پیتے بہت سے تھے اس کا ایک نتیجہ یہ تھا کہ کم عمر بلکہ چوبیس پچیس سال تک کی عمر کے قیدی محض سگریٹ کے لئے دوسروں کے ہتھے چڑھ کر جفتی کھانے پر راضی ہو جاتے یہ بات جیل کے حکام بخوبی سمجھتے تھے مگر چشم پوشی سے کام لیتے کرنل سوندھی خلاف وضع فطری کے مرتکبین کو اوّل تو سزا ہی نہ دیتے اور جو سزا دیتے وہ انتہائی نرم ہوتی ان کا کہنا تھا کہ یہ ایک فطری تقاضا ہے اس سے جیل کے نظم کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا یہ دو قیدیوں کا باہمی سمجھوتہ ہے اب سنا ہے کہ سگریٹ نوشی کی قیدیوں کو اجازت ہوگئی ہے لیکن اس سے پیدا شدہ خرابیاں اپنی جگہ قائم ہیں کیونکہ جو لوگ جیل جاتے ہیں ان میں اکثر سگریٹ خریدنے کی استطاعت ہی نہیں رکھتے وہ نشہ کے عادی ہو کر خرابکاری ہی سے سگریٹ حاصل کر پاتے ہیں۔ قومی اور سیاسی تحریکوں کو اکثر اسی سے نقصان پہنچا۔ چودھری افضل حق مرحوم نے لکھا ہے کہ تحریک کشمیر میں سگریٹ نوش رضاکاروں کا وجود آخر وقت تک ایک پرابلم بنا رہا۔ احرار نے جتنا فنڈ جمع کیا اس کا بڑا حصہ رضاکاروں کو سگریٹ مہیا کرنے پر صرف ہوا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی مختلف کتابوں اور تحریروں میں سگریٹ کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے وہ اس بارے میں بڑے ہی دردناک واقعات سنایا کرتے تھے۔

کئی تحریکوں میں سگریٹ نوش قیدیوں اور حوالاتیوں نے وہ گل کھلائے کہ بعض مواقع پر شرمندہ ہونا پڑا۔ اس قسم کے لوگ جوش میں آکر جیل تو چلے جاتے ہیں مگر رہ نہیں سکتے۔ نتیجہ یہ نکلتا

ہے کہ معافی مانگنے والوں کی ایک ڈار لگ جاتی ہے یا پھر بڑے چھوٹوں کے ساتھ جنسی معاملہ کرنے سے نہیں چوکتے یہ حصہ آخری حد تک افسوسناک ہوتا ہے سگریٹ کا بدل تمباکو ہے جسے بڑا کہتے ہیں یہ بھی اندر مہنگا ملتا ہے مگر بڑا معمر اور باوضع قیدی کھاتے ہیں۔ کانگرس نے اپنی تحریک کو اس طرح ڈھال لیا تھا کہ اس قسم کی کمزوریاں اس کی راہ میں مانع نہ ہوتی تھیں۔ پھر اس میں حصّہ لینے والے کھاتے پیتے گھرانوں کے لوگ تھے ہماری طرح نہیں کہ جیب و داماں میں نقد دم کے سوا کچھ نہ ہوتا۔

بابا طالب کو مسلمانوں کی اس کمزوری کا بڑا خیال رہتا وہ خود تو بڑا کھاتا مگر مسلمان نوجوانوں کے لئے اِدھر اُدھر سے سگریٹ مانگ لاتا۔ ملک راج بھی بڑا کھاتا باقی ہم سب سگریٹ تمباکو سے متنفر تھے۔

انتقام کا چکر

بابا طالب نے اپنے خاندانی دشمنوں کو قتل کیا اور اب چودہ سال کی سزا بھگت رہا تھا اِس سے پہلے بھی دس سال کاٹ چکا تھا اس کے بڑے بھائی کو جس خاندان کے لوگوں نے قتل کیا اس نے اس خاندان کے تین سگے بھائیوں کو باری باری قتل کر ڈالا پہلی دفعہ دس سال قید ہوا دوسری دفعہ چودہ سال، تیسری دفعہ پھانسی پا گیا، لاہور ہی اُسے پھانسی پر لٹکایا گیا اس کے ورثاء ایک چوبی صندوق میں لاش لے گئے، اور اپنے گاؤں میں دفن کیا، اس دفعہ میں لاہور میں نہیں تھا بلکہ منٹگمری سنٹرل جیل میں تھا ٹرانسفر ہو کر لاہور پہنچا تو یہ سانحہ معلوم ہوا غور کیجئے ایک شخص جیل ہی میں پلتا رہا، جوان ہوا بوڑھا ہوا اور آخر موت کے منہ میں چلا گیا اس میں ایک قاتل کی عادتیں بالکل نہ تھیں وہ واقعتہً ایک شریف انسان تھا لیکن انتقام کی آگ نے اسے پاگل کر رکھا تھا ہم اُسے اکثر سمجھاتے کہ بابا دس سال پہلے کاٹ چکے ہو چودہ سال اب کاٹ رہے ہو بڑھاپا سر پہ آ گیا ہے۔ جانے دو لیکن اس عنوان سے

وہ کچھ سنتا ہی نہ تھا وہ کہتا تھا کہ یہ ہمارا خاندانی شعار ہے جب تک ہم ایک خون کا بدلہ تین خون کر کے نہ لیں ہماری مائیں دودھ نہیں بخشتیں ۔ وہ اس معاملہ میں پتھر کی طرح سخت اور فولاد کی طرح مضبوط تھا ——— اپنی ضد پوری کر کے رہا۔ اس ضد میں بعض قبیلے اتنے سخت ہیں کہ آج تک قصاص یا بدلے سے اپنے آپ کو باہر نہیں لا سکے، افراد کے قتل کا یہ سلسلہ پشت ہا پشت سے چل رہا ہے اور اس معاملہ میں وہ کسی مذہب دین، پیر، فقیر، اور مرشد کی نہیں مانتے ۔ یہی ان کا مذہب اور یہی ان کا مرشد ہے ۔ مرحوم پنجاب کے کچھ اضلاع میں تو یہ خو بو نہیں ہے لیکن وہ اضلاع جو سرحد سے ملتے ہیں یا صوبہ کے وسط میں ہیں اُن میں انتقام کی یہ آگ ہمیشہ روشن رہی ہے ۔ بعض اضلاع میں دلیرانہ قتل کئے جاتے ہیں بعض میں بزدلانہ۔ مثلاً ڈیرہ غازی خاں انتہائی پس ماندہ ضلع ہے یہاں کی زمینوں اور خزینوں پر تمن داروں کا قبضہ ہے لوگ اپنی آبروئیں تک گروی رکھ دیتے ہیں۔ سینکڑوں کنبے تمنداروں اور وڈیروں کے پشتینی غلام ہیں بچے ابھی ماں کے پیٹ میں ہوتے ہیں کہ بڑے بڑے زمیندار مادہ اور نر کے مقررہ نرخوں پر انہیں خرید لیتے ہیں۔ قتل، عام ہوتے ہیں لیکن قانون کی زد سے بچنے کے لئے حد درجہ شرمناک طریقے اختیار کئے جاتے ہیں مثلاً الف نے بے کو قتل کیا گھر پہنچ کر بیوی کو قتل کر ڈالا پھر بے کی لاش کو اُٹھا کر گھر لے آیا اور دونوں کو برہنہ کر کے ایک ساتھ لٹا دیا۔ پھر پولیس کو اطلاع کر دی کہ انہیں اس حالت میں دیکھ کر بہ حالت غضب اُس نے قتل کر دیا ہے سال بھر میں بیسیوں قتل ہوتے ہیں۔ بعض اضلاع میں عورتیں اُٹھا لینا یا مویشی بھگا کر لے جانا بہادری سمجھا جاتا ہے۔ یہ ایک عجیب سی بات ہے کہ ان اضلاع کے لوگ انفرادی خونریزی یا رہزنی میں تو انتہائی دلیر ہیں مگر اجتماعی طور پر ان میں قومی یا سیاسی مردانگی کا شائبہ تک نہیں بلکہ اس رُخ سے انتہائی بزدل ہیں ان اضلاع سے آج تک نہ کوئی قومی لیڈر شپ پیدا ہوئی، اور نہ ان اضلاع کی مٹی سے کوئی ایسا شخص اُٹھا جو نابغہ یا عبقری ہو، یہ لوگ آزاد ہو کر بھی غلام ہی ہیں اور اس زمانے میں بھی قرونِ مظلمہ کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اضلاع کی فطرت

ڈیرہ غازیخاں ایشیا کا سب سے بڑا ضلع ہے۔ اس کا طول اتنا ہے جتنا لاہور سے دہلی لیکن صرف تمندار اس سارے ضلع کے خداوند ہیں کوئی مزارع ان کی جھوٹی قسم کھا کر زندہ نہیں رہ سکتا ذہنی افلاس کا یہ عالم ہے کہ ان کے نزدیک تمندار ہی مامور من اللہ ہیں۔ قلاش لوگ اپنی بیویوں کے پیٹ بیچ دیتے ہیں لڑکی کے پیٹ کی قیمت زیادہ پڑتی ہے عام عورتیں لڑکی کی پیدائش کے لئے پیر فقیر مناتی ہیں۔ یہاں کے لوگوں کو تمنداروں کی عظمت اور پیروں کی کرامت کے سوا کچھ معلوم نہیں کہ خدا بھی کوئی چیز ہے۔ تمن بلوچی زبان میں علاقہ کو کہتے ہیں اکثر تمندار بقلم خود ہیں خود ہی مقدمہ بناتے اور خود ہی سزا دیتے ہیں۔ ماضی مرحوم میں ایک بلوچ نے کسی کی بکری چوری کر کے ذبح کر ڈالی مقدمہ پیش ہوا۔ تمندار استنجا کر رہا تھا کھڑے کھڑے مقدمہ سنا اور فیصلہ سنا دیا کہ یہی چھری اس بلوچ کی مقعد میں دے دی جائے چنانچہ فوراً عمل کیا گیا اور وہ بے چارہ عالم بقا کو سدھار گیا۔

سرحد سندھ اور بلوچستان میں بھی انسانی خون کی رفتار یہی ہے۔ صرف اسباب قتل اور طریق قتل میں فرق ہے ان اضلاع کے باشندوں کی یہ عادت گویا ان کی فطرت بن چکی ہے انگریزوں نے اُنکی اس فطرت کو پروان چڑھایا اب یہ ایک بے قابو ذہنیت ہے جو پیروں فقیروں زمینداروں اور ان کے گماشتوں کی بدولت پختہ ہو گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان اضلاع میں قتل کی بیشتر وارداتیں زمینداروں اور گدی نشینوں کے ایما سے ہوتی ہیں اور ان میں انہی نفوس قدسیہ کے اغراض مشؤمہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔

عبرت کا ورق

جب کبھی سزائے موت کے قیدیوں سے گفتگو کا موقع ملا یا اُن کے مقدمات کی نوعیت

معلوم کی تو اس کی تہہ میں عداوت کا یہی چکر نکلا۔ بابا طالب پھانسی پا گیا اب اسکی قبر بھی مٹ چکی ہو گی مگر پچیس تنائیس سال بعد بھی اس کی تصویر نظروں میں گھوم رہی ہے وہ قاتل ہونے کے باوجود ایک انسان تھا محض نسلی عصبیتوں نے اسے قاتل بنا دیا تھا۔ ہمارا دوسرا دوست ملک راج گجرات کے قصبہ جلال پور جٹاں کا رہنے والا اور عمر قید تھا اُس نے اپنی بہن کو ایک نامحرم سے آشنائی کے باعث قتل کر ڈالا۔ یہ ایک پڑھا لکھا اور سمجھدار نوجوان تھا اس نے پہلی دو قیدوں میں مجھے بڑا آرام پہنچایا خدمتگار بنا رہا میں بیمار ہوا تو اُس نے آنکھوں میں راتیں بسر کیں۔ ڈیوٹی سے فارغ ہوتا تو میری خدمت کرتا۔ تمام قید امن و عافیت سے گزاری رہا ہوتے ہی آگرہ چلا گیا وہاں شیشہ بیچنے کی دوکان کی۔ پنجاب سے اس کا دل بھر چکا تھا دو اور نوجوان عبدالباقی اور میگھ راج تھے نوجوان کیا بالکل ابتدائی عمر میں دونو پھانسی پا گئے۔ عبدالباقی امرتسر کا رہنے والا تھا آج کل کے بے قابو نوجوان کی طرح کھلنڈرا۔ اُس نے خان بہادر بڈھے شاہ کے خوبرو نوجوان بیٹے کو قتل کیا تھا۔ خان بہادر پہلے محض بڈھے شاہ تھا پھر علاقہ کے تھانیدار کا اعزازی مددگار ہو گیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کبھی اس کا سلام قبول نہ کرتے۔ شاہ جی جامع مسجد خیر الدین (امرتسر) میں جب کبھی جمعہ کی نماز پڑھتے یا پڑھانے جاتے تو دروازہ پہ خان بہادر کھڑا ہوتا وہ جھک کر سلام کرتا مگر شاہ جی خلاف عادت جواب دیئے بغیر منہ پھیر کر اندر چلے جاتے، ایک دن نیازمندوں نے بااصرار پوچھا ماجرا کیا ہے؟ شاہ جی نے ہونہہ ہاں کر کے ٹال دیا آخر ایک دن فرمایا بات کوئی نہیں ہے میں کسی ایسے شخص کا سلام ہی قبول نہیں کرتا جو انگریز دوست ہو' نیازمندوں نے بعض افراد کا ذکر کیا جن کا شاہ جی سلام قبول کرتے اور وہ انگریز دوست تھے اس پہ شاہ جی نے اصل واقعہ بیان کیا کہنے لگے مارشل لاء میں نیشنل بنک کے فرنگی منیجر کو کسی شخص نے چھت سے زمین پہ پھینک دیا تھا وہ گرا اور ہلاک ہو گیا۔ پولیس نے مجرم کو بہتیرا تلاش کیا مگر نہ ملا۔ مقتول کی بیوی نے قصاص کا مطالبہ کیا حکومت نے انعامی اشتہار نکالا کہ جو شخص مجرم کا پتہ دے گا وہ اتنے ہزار روپے کا حقدار ہو گا۔ ڈپٹی کمشنر

نے بعض "معززین شہر" کو بلا کر کہا کہ مجرم کا سراغ ملنا چاہیئے اور یہ خود ان کی وفاداری کا امتحان ہے ؛ حکومت مقررہ انعام کے علاوہ خان بہادر یا رائے بہادر کا خطاب دے گی اور ساتھ ہی آنریری مجسٹریٹی ،

سید بڈھے شاہ نے "مجرم" کا پکڑوانا گویا اپنے اوپر فرض کر لیا اپنے ہی محلہ کی ایک غریب الحال بیوہ کے پاس گیا جس کا اکلوتا نوجوان بچہ تھا۔ بیوہ سے کہا "منیجر کے قتل میں تمہارے بیٹے کا نام لیا جا رہا ہے۔ پولیس گواہ پیدا کر رہی ہے اس طرح بچہ پھانسی لگ جائے گا اور تم بھی قید ہو جاؤ گی۔ بیٹے سے کہو کہ میرے ساتھ تھانے میں حاضر ہو کر مان لے کہ اس نے بنک کے منیجر کو کوٹھے سے گرایا ہے۔ میں حلفاً وعدہ کرتا ہوں کہ دو ماہ کے اندر اندر اس کو چھڑا لاؤں گا اُس کا بال بھی بیکا نہ ہو گا۔"

بڑھیا جھانسے میں آگئی نوجوان بے پڑھا لکھا تھا لاغر و بیمار فریب میں آگیا۔ پولیس کو اور کیا چاہیئے تھا "ملزم" نے اقبال جرم کر لیا مقدمہ چلا چٹ منگنی پٹ بیاہ موت کی سزا ہو گئی جو اُسے آخر کار تختہ دار پر لے گئی بڑھیا نے خان بہادر کا دامن پکڑا وہ اثنائے مقدمہ سے لے کر سزائے موت تک یہی کہتا رہا کہ فکر نہ کرو شور نہ مچاؤ گورنر صاحب نے مجھ سے وعدہ کر رکھا ہے لازماً رہا ہو جائے گا یہ محض قانون کا پیٹ بھرا جا رہا ہے بڑھیا انہی طفل تسلیوں پر جیتی رہی آخر بیٹا پھانسی پا کر رہا ہو گیا ماں نے بیٹے کی لاش دیکھی تو سر پیٹ لیا چیخی چلّائی، واویلا کیا، مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا بڈھے شاہ خان بہادر ہو گئے جائداد ملی آنریری مجسٹریٹی ہاتھ آگئی لیکن بڑھیا کا بیٹا نہ آیا آخر ایک روز وہ بھی بیٹے ہی کے پاس چلی گئی۔

قدرت کا غائبانہ ہاتھ منتظر رہا۔ مکافات نے برسوں چکر کاٹا۔ بڈھے شاہ المیہ ہو گیا جوان بیٹا قتل ہوا۔ آنریری مجسٹریٹی ایک ڈپٹی کمشنر کی ناراضی کھا گئی مکان کی چھت گرنے سے ٹانگ ٹوٹ گئی بالآخر عبرت کی تصویر ہو کر قبر میں ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

عبدالباقی

عبدالباقی ——— ایک منچلا نوجوان تھا موت کا خوف اُسے نتھا ہی نہیں جس روز اسے پھانسی دی جارہی تھی اس دن بھی مسکراتا ہی رہا۔ گول مٹول چہرہ، نین نقش تیکھے، گورا رنگ، گھنگھریالے بال، تختہ دار پر بھی اکڑ کے رہا، سوندھی نے چڑ کر بھنگی سے کہا کہ اس کے گلے میں ذرا ٹیڑھا رسہ ڈالو تاکہ جان نکلنے میں ذرا دقت ہو، یہی ہوا۔ عبدالباقی دیر تک تڑپتا رہا آخر جان ہار گیا وہ خان بہادر کے بیٹے پر جی جان سے عاشق تھا۔ رقابت میں قتل کر ڈالا اُسے یقین تھا کہ آئندہ زندگی میں دونو کی ملاقات ہوگی اور اسی یقین کے ساتھ اس نے تختہ دار کو لبیک کہا۔ جس صبح وہ پھانسی پا رہا تھا اس رات دیر تک گاتا رہا اُس نے دوہوں، مصرعوں، گیتوں، اور ماہیوں کے دفتر اَلاپ ڈالے، لحظہ بھر کے لئے بھی تالو سے زبان نہ لگائی موت کو موت ہی نہ سمجھا چند دن ہمارے ساتھ رہا تاریخ پر امرتسر چلا گیا وہاں سے موت کی سزا پاکر لاہور آگیا یہاں اپیل تک رہا جب اپیل خارج ہوگئی اور رحم کی درخواست بھی ضابطہ کے مطابق مسترد ہوگئی تو موت کی طرف اس تیزی سے قدم بڑھا کر چلا جیسے ماں نے اِسی دن کے لئے جنا تھا۔ بڑے بڑوں کا جی پھانسی کا تختہ دیکھ کر لرزاُٹھتا ہے اور سینکڑوں سورما موت کو سامنے پاکر سہم جاتے ہیں لیکن عبدالباقی موت سے اتنا مطمئن تھا جیسے رہا ہو رہا ہو اور اس کے لئے یہ ساعت بڑی ہی سعید ہے ———!

میگھ راج

میگھ راج ایک دھان پان نوجوان تھا۔ رنگ گیہوں کے خوشوں کی طرح صاف، گلا نورانی، قامت پستہ، اور منحنی، آنکھیں روشن اور متحرک ماتھا کشادہ، ناک ستواں، بڑا ہی خوش اخلاق، اور

خوش اطوار اس کی بیاض میں مومن میر غالب اختر حفیظ بیدم اور اقبال کی بہت سی غزلیں درج تھیں رات کے تاریک سناٹے میں الاپتا تو سماں بندھ جاتا قدرت نے اسکی آواز میں جادو بھر دیا تھا مالکونس میں تو ہر شخص گا لیتا ہے لیکن وہ عموماً پہاڑی میں گاتا طبیعت موم کی طرح پگھلنے لگتی۔ محسوس ہوتا جیسے زنجیریں ٹوٹ رہی ہوں وہ خود بھی غمگین تھا اور اسکی آواز سے بھی آنسوؤں کا ترشح ہوتا تھا۔ عموماً بیدم کی یہ غزل گاتا ؎

وہ چلے جھٹک کے دامن مرے دست ناتواں سے
اسی دن کا آسرا تھا مجھے مرگِ ناگہاں سے

یا پھر میں اس سے یہ گوایا کرتا ؎

وہ حرف راز جو مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں

کیا لمحے تھے وہ! جیسے جہنم میں جنت آگئی ہو ان شب آرائیوں کا رنگ ہی اور تھا معلوم ہوا کہ میگھ راج اندر ہی اندر گھلتا چلا جا رہا ہے اور کسی خاص بوجھ سے ہڈیوں کا ایک ڈھیر رہ گیا ہے۔

ایک روز اُس نے ڈاکٹر سے چھٹی لی اور پارک میں لیٹ کر ہلکے ہلکے سروں میں گاتا رہا ؎

فرقت میں زندگی مجھے اپنی اکھر گئی
اے مرگ ناگہاں تو کہاں جا کے مر گئی

اُس کے گالوں پر آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے تھے۔ مَیں نے پوچھا میگھ راج! کیا ہو گیا ہے؟ ٹالنے کے لئے ہنسا لیکن آنسو رخساروں پر بے حروف عبارتیں چھوڑ چکے تھے۔ مَیں نے اپنے استفسار پر اصرار کیا تو اُسکی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ ٹپ ٹپ ٹپ آنسو! آنسو ہی آنسو! آخر اُس نے اپنا غم کہہ ڈالا اپنی بیس سالہ بیوی ساوتری اور اپنی سہ سالہ بچی شکنتلا کی یاد میں اشکبار تھا۔

مَیں نے اس کی سزایابی کا سبب پوچھا پہلے تو ہچکچایا پھر قدرے ردوکد کے بعد مجھے اپنا ایک مخلص دوست سمجھتے ہوتے بیان کیا کہ اُس نے اپنی بہن کو قتل کیا ہے دونو بہن بھائی ماں باپ کی تنہا یادگار تھے ——— بہن عمر میں تین چار سال چھوٹی تھی۔ عمر بھر اُسے ماں باپ کی لاج سمجھا' پڑھایا لکھوایا اب اس فکر میں تھا کہ اچھا سا بَر ملے تو رخصت کردے مگر یہ راستہ ہی میں بھٹک گئی اس نے دل کے اٹکاؤ کا سامان پیدا کرلیا ہر صبح مندر جاتی اور مورتی کو ماتھا ٹیک کر واپس آجاتی کچھ دنوں بعد اُس نے شام کو بھی یہی دستور بنالیا۔ معاً کانوں میں بھنک پڑی کہ پارو نوجوان مہنت کا شکار ہوگئی ہے۔ میگھ نے پیچھا کیا مشاہدہ ہو گیا آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ مندر کے عقب میں بوہڑ کا درخت تھا اس کی اوٹ میں مہنت اور پارو پیار کا مطلع اُٹھا رہے تھے کہ میگھ نے چاقو سے حملہ کردیا۔ پارو نے آگے ہو کر وار روکا۔ لیکن اتنے میں چاقو اپنا کام کرچکا تھا۔ پارو نے "بھاپا" "بھاپا" پکارا لیکن تیسری آواز کے ساتھ ہی ڈھیر ہوگئی۔ مہنت دو چار زخم کھا کے بھاگ نکلا۔ میگھ کا ایک دوست کانشی رام ساتھ تھا اُس نے مہنت کا پیچھا کیا اور اڑنگے پر لاکر دھر لیا میگھ نے بڑھ کر دو کاری زخم پہنچائے لیکن وہ بچتنیاں کھاتا ہوا فرار ہوگیا۔ واقعہ کے بعد میگھ سیدھا پولیس سٹیشن چلا گیا۔ دونوں گرفتار ہوگئے۔ مقدمہ چلا میگھ کو تین برس قید کی سزا ہوئی اس کے دوست کانشی رام کو سزائے موت، کانشی اُن دنوں راولپنڈی جیل میں تختہ دار کا منتظر تھا ——— ! میگھ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ پڑا۔

"تم نے کوئی اپیل کی ہے"؛ میرے اس سوال سے وہ دل شکستہ سا ہوگیا۔

بولا "ہم دونوں بے سہارا ہیں ہمارا دور دراز تک کوئی عزیز نہیں۔ میرے دوست کے والدین انتہائی بوڑھے اور غریب ہیں کانشی ہی انھیں کما کے کھلاتا تھا میری جوان بیوی اور ننھی بیٹی باہر ہیں آج ہی خط ملا ہے کہ سیٹھیوں کے ہاں برتن مانجھنے پر نوکر ہوگئی ہے ان ویران حالات میں اپیل کی ہمت کس میں ہے؟ قاعدہ کے مطابق جیل سے اپیل کی ہے یہ اپیلیں کون سُنتا ہے؟ درخواستیں

چلی جاتیں اور مسترو ہو کر آجاتی ہیں۔

میگھ راج نے بچوں کی طرح بلک بلک کر رونا شروع کیا معلوم ہوتا تھا پانی ندیوں سے اُچھل اچھل کر کناروں پر آرہا ہے سارا دن روتا رہا رات مجلس لگی ——— تو اس کی طبیعت میں قدرے سکون پیدا ہوا مگر غم لگاتار اس کے ساتھ چل رہا تھا۔

کوئی چار ماہ بعد ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ جیل سردار ہرچرن سنگھ نے مجھے دفتر میں بلوا کر پوچھا——— تمہارے احاطہ میں میگھ راج نام کا کوئی قیدی ہے میں نے کہا جی ہاں! کہا جاؤ اس کو لے آؤ اس کی ملاقات ہے میں میگھ راج کو بلا لایا ہم دفتر پہنچے تو جیلر نے میگھ راج کو حسرت سے دیکھ کر کہا۔

"بدبخت تیری قسمت کیوں پھوٹ گئی ہے؟"

جمعدار سے کہا اس کو پھانسی گھر لے جاؤ اس بدنصیب کی سزا اپیل میں تین سال سے موت ہو گئی ہے۔

جمعدار نے فوراً ہی ہتھکڑیاں پہنا دیں اور چودہ نمبر میں لے گیا میگھ راج کا رنگ زرد پڑ گیا۔ آنکھوں میں آنسو تیر گئے لیکن اُس نے فوراً ہی ضبط کیا جیسے وہ اس وقت رونے کے لئے تیار نہ تھا۔ آخری حسرتوں کے سوا اس کے چہرے پر کچھ نہ تھا۔ کوئی ہفتہ بھر میری طبیعت کا سکون ہلا رہا ایک ہی جیل میں رہنے کے باوجود ہم آپس میں نہ مل سکتے تھے اور نہ یہ درد بانٹا جا سکتا تھا۔ نمبرداروں کی معرفت دن میں دو چار دفعہ سلام آجاتا یا کبھی رات کے سناٹے میں دور سے اُس کی آواز سنائی دیتی کوئی غزل گا رہا ہوتا۔ آواز سے رس اور روپ دونوں اُڑ چکے تھے درد اور سوز رہ گئے تھے کبھی کبھار چوری چھپے ——— اُس سے مل بھی آتا اب وہ صرف موت کے دن گن رہا تھا کہ تاریخ کب مقرر ہوتی ہے؟ ہم میں اتنا پیار ہو گیا تھا کہ ہم دونوں انتہائی گہرے دوست بن گئے تھے ایک دن وہ گردن نہوڑائے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا میں ملنے گیا تو ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو اور اچانک اُس کا

سپنا ٹوٹ گیا ہو ـــــــ کہنے لگا "شورش بھائی" میری ساوتری اور میری شکنتلا کو خط لکھ دو کہ ہم سورگ میں ملیں گے جہاں نہ پھانسی کا قانون ہے نہ موت کی سزا نہ کوئی مہنت ہے نہ کوئی پار و"۔ اُس کی گھگھی بندھ گئی، آواز رندھ گئی، کوشش کے باوجود اور کچھ نہ کہہ سکا، میں نے حوصلہ بندھانا چاہا مگر وہ جانتا تھا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ محض تسلیاں ہیں۔ قانون کے سامنے سب بے بس ہیں آخر پھانسی پانے کی تاریخ آ گئی جب اسکو تختہ دار پر لے گئے تو سپرنٹنڈنٹ نے حسب قاعدہ استفسار کیا تمہاری کوئی خواہش ہے؟ تم کوئی سوال کرنا چاہتے ہو؟

میگھ راج نے کہا "جی ہاں" مجھے شورش کاشمیری سے ملا دیں وہ میرا دوست ہے میں اس سے ملنا چاہتا ہوں"

"اور کوئی خواہش؟"

"جی ہاں اس سے پہلے کہ یہ رسہ میرا منکا ڈھلکا دے مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس تختہ پر ایک غزل گاؤں"

سپرنٹنڈنٹ نے اس کی یہ دونو خواہشیں پوری کر دیں۔

میگھ راج تختہ دار پر کھڑا تھا اس کے دونوں ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو اُبل پڑے اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں غالب کا یہ مطلع اُٹھایا ؎

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

دو تین دفعہ یہ شعر اُٹھا بٹھا کر پڑھا پھر اس کی آواز بھرا گئی۔

سپرنٹنڈنٹ، جیلر، مجسٹریٹ، گارد، خاکروب سب کے چہرے اشکبار تھے لیکن قانون کی آنکھوں میں کوئی آنسو نہ تھا اُس کے چہرے پر کالی ٹوپی ڈال دی گئی سپرنٹنڈنٹ نے اشارہ کیا خاکروب نے

ہڑکا کھینچا میگھ راج ساوتری شکنتلا کہتا ہوا ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ——— شکنتلا کا "لا" اس کی ہچکی میں ڈوب کر رہ گیا اور "ت" ہونٹوں پر جم گئی۔

مَیں نے بعض ہندو دوستوں کو اس کے انتم سنسکار کیلئے کہلا بھیجا تھا وہ راولپنڈی جا کر اسکی بیوی اور بچی کو لے آتے تھے۔ نعش باہر نکالی گئی تو سیوا سمتی کے رضاکاروں نے ارتھی تیار کی اور شمشان بھومی لے گئے سنٹرل جیل کے آہنی دروازے جوں کے توں کھڑے تھے، سنگین تماشائی کی طرح بے حس و حرکت، فضا آزردہ، قدرت خاموش، لاش چپ چاپ، دو نسوانی جسم (اہلیہ اور بچی) دو ہتھڑ مار مار کر پیٹ رہے تھے۔ قانون چتا کے شعلوں کی نگرانی کر رہا تھا اور انصاف ارتھی کے گرداگرد پہرے دار تھا۔

مَیں مارچ یا اپریل ۱۹۳۹ء میں رہا ہو کر راولپنڈی پہنچا، وہاں ساوتری اور شکنتلا سے ملا۔ دُکھ ہوا کہ تین روپے ماہانہ کی ایک کوٹھڑی میں کرشن کی بانسری کا نسوانی روپ اذیت کے دن کاٹ رہا ہے۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں سات برس کے لئے پھر قید ہو گیا۔ ۱۹۴۴ء کے آخر میں رہا ہوا۔ اب زمانہ بدل چکا تھا اور اس طرح کی سبھی یادیں مرحوم ہو گئی تھیں فسادات بہار کے دنوں میں پٹنہ گیا تو جس ریسٹ ہاؤس میں قیام کیا وہاں گیا کے ایک زمیندار کا نوجوان لڑکا اوپندر عرف بچہ بابو بھی ٹھہرا ہوا تھا۔ بڑا خوش مزاج یار باش انتہائی عیاش ہر رات بستر کے لئے کھلونا ڈھونڈھتا، مَیں کوئی کتاب یا اخبار لینے اس کے کمرہ میں گیا تو پلنگ پر ایک نسوانی وجود پڑا تھا مَیں ٹھٹکا معاً میری نگاہیں اُس کے چہرے پر گڑ گئیں اُس نے بھی تاکا فوراً ہی مُنہ پھیر لیا آنکھیں جھکا لیں رنگ اُڑ گیا، یوں ہو گئی جیسے زمین میں گڑ گئی ہو، مَیں نے کہا "ساوتری"

وہ خاموش رہی مَیں نے دوبارہ سہ بارہ کہا "ساوتری! ساوتری"

ساوتری نے بڑے ہی آزردہ لہجے میں کہا "بھیا پرنام"

"تم کہاں؟"

اوپندر بھونچکارہ گیا ساوتری اپنی جگہ سے اُٹھی اور تیر کی طرح نکل گئی جاتے جاتے صرف یہ کہا" اب میں ایک "ویشیا" ہو چکی ہوں۔ میگھ راج کی پتنی اُس کے ساتھ ہی پھانسی پا گئی تھی میں اس ساوتری کا سایہ ہوں اِنصاف کے دیوتا نے بہن بھائی اور پتی تینوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے"

یہ سانحہ بھی بیت گیا۔ تین چار سال بعد ۹ جون ۱۹۴۹ء کو مجھے ایک خط ملا جو کئی آوارہ پتوں سے ہو کر مجھ تک پہنچا تھا اس میں لکھا تھا

بھیا ——— پرنام

میں آپ کے متر میگھ راج کی ودھوا ہوں۔ آپ مجھے پٹنہ میں ملے تھے میری بیٹی شکنتلا کو آپ جانتے اور پہچانتے ہیں۔ بٹوارہ کے وقت جو بیتی وہ کہانی بڑی ہی دردناک ہے۔ شکنتلا کو راولپنڈی کے لگ بھگ کسی اسٹیشن پر بلوائیوں نے اُٹھا لیا تھا۔ وہ بہت دنوں لاہور کے کنیا سہائیک آشرم میں رہی ہے اب کچھ پتہ نہیں کہاں ہے؟ آپ کھوج لگا سکتے ہوں تو پتہ دیں۔ آپ کی مہربانی ہو گی آپ کے ایک سورگ باشی متر کی آتما کو چین ملے گا ———

"ایک ویشیا"

ساوتری میگھ راج

خط ملا تو میں عرصہ تک بے چین رہا "چٹان" کی زندگی کا پہلا سال تھا میں نے یہ سبھی کچھ اُس میں چھاپ دیا۔ ساوتری کے الفاظ خون کے قہقہے اور آگ کے انگارے تھے

ایک روح فرسا تصویر آنکھوں میں گھومنے لگی۔

میگھ راج ———————— پھانسی

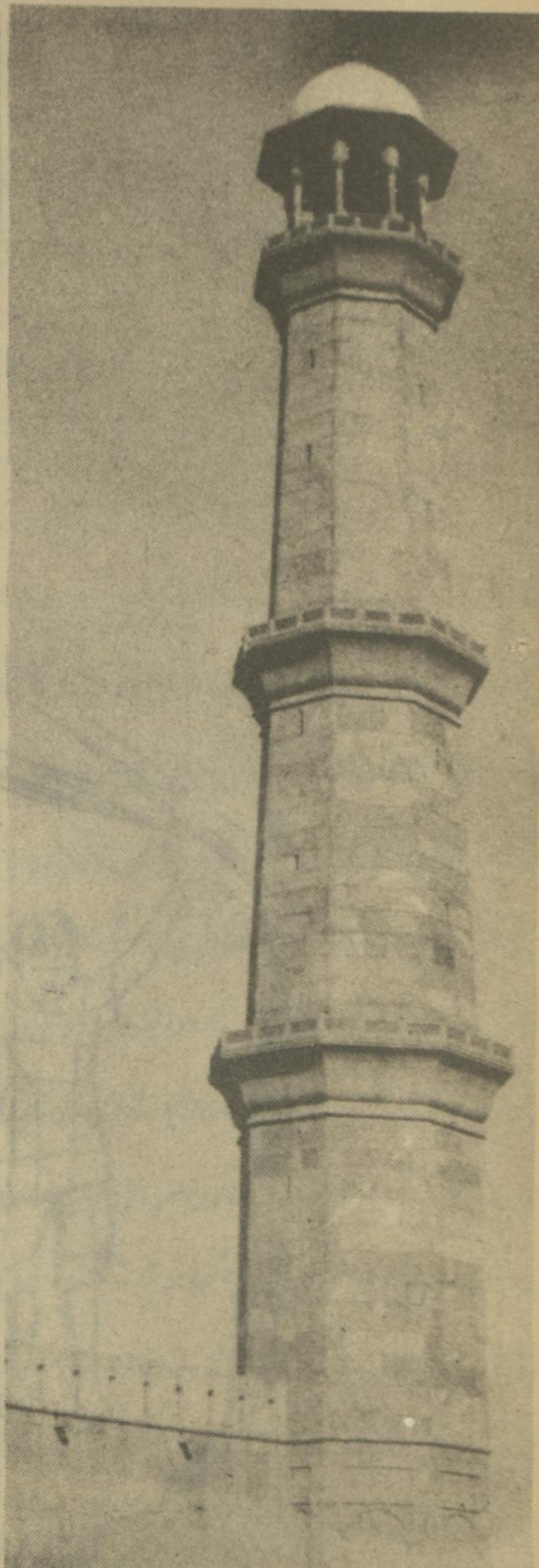
پارد ———————— قتل

ساوتری ———————— ویشیا

شکنتلا ———————— اغوا

ایک ڈرامہ مختلف سین، ہدایت کار سنگدل قانون کا اندھا انصاف ؎

ہیں
اہلِ نظر
کشورِ
پنجاب سے
بیزار





برطانوی پنجاب میں مسلمان سیاسی قیدی اکثر ابتلاء و اہانت کا شکار ہوئے۔ بڑے بڑے راہنماؤں کی بات دوسری ہے لیکن مسلمان نوجوانوں کو عموماً ذلیل کیا گیا۔ تحریک خلافت کے بعد جب عام مسلمانوں نے کانگرس سے علیحدگی اختیار کر لی تو پنجابی مسلمانوں میں انقلابی نوجوانوں کا قحط ہی رہا۔ وجوہ ڈھکے چھپے نہیں اصل وجہ یہ تھی کہ پنجاب برطانوی حکومت کے لئے ریڑھ کی ہڈی تھا۔ اُسے یہاں سے مضبوط اور سستا سپاہی ملتا رہا جو یورپ کے میدانوں افریقہ کے صحراؤں ترکوں کے دروازوں اور عربوں کے گھروں میں گھس گھس کر اُن کے لئے لڑتا رہا بلکہ مقامات مقدسہ کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں بھی جھجکا نہیں۔ انگریز نہیں چاہتا تھا کہ اس صوبہ میں سیاسی بیداری کے آثار پیدا ہوں یا مسلمانوں میں اس قسم کے نوجوان نکل آئیں جو عام مسلمانوں پر اثر انداز ہو سکیں۔ انگریزوں نے اپنے اس قلعہ کو مضبوط تر بنانے کے لئے یہاں مفادات کا ایک طلسم خانہ تیار کیا۔ پنجاب کو بڑی بڑی زمینداریوں کا مرکز بنا ڈالا۔ ہندو مسلم فساد یہیں سے اُٹھا سکھوں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں لاکھڑا کیا مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں عقائد کی کشمکش کا ڈول ڈالا قادیانی نبوت کا پودا سینچا، اس نبوت نے تمام مسلمانوں کو کافر کہہ کر نہ صرف تنسیخ جہاد کا اعلان کیا بلکہ برطانیہ کی ہندوستان میں حکمرانی کا جواز پیدا کیا۔ خانقاہیں پیدا کیں، گدی نشینوں کی کھیپ کو پروان چڑھایا۔ مخلوق خدا کو ان کے مریدوں کی حیثیت سے

لایعقل کر دیا، ملازمتوں کے لئے بعض اضلاع چھنے اور ان اضلاع میں سے کچھ خاندان معزز و متمول بنا دیئے تاکہ وہ مسلمانوں کے دماغوں اور اُن کی جرأتوں کا شکار کر سکیں ان حالات میں یہاں کسی انگریز دشمن یا مخالف سامراج مسلمان نوجوانوں کا پیدا ہونا معجزہ سے کم نہ تھا۔ جو اُبھرتا اس کو ابتدا ہی میں سی آئی ڈی "چھاپہ" مار کر مخبر بنا لیتی یا سرکاری گماشتے خرید لیتے یا پھر اس قسم کا تشدد کیا جاتا کہ وہ بہت جلد ٹھکانے لگ جاتا مسلمان نوجوانوں کو مخبر بنانا، ذلیل کرنا' یا پھر بے قابو سمجھ کر رُسوا کرنا پنجاب پولیس میں سی آئی ڈی اور اس کے مسلمان افسروں کا شیوۂ خاص رہا ہے۔

جب کوئی مسلمان نوجوان سیاسی حیثیت سے جیل جاتا اس کے ساتھ اخلاقی قیدیوں سے بدتر سلوک کیا جاتا۔ سی آئی ڈی میں ہندو اور سکھ افسر بھی تھے۔ بعض ان میں بھی بُری مٹی کی پیداوار تھے مگر ان کی اکثریت میں قومیت و وطنیت کا احساس بھی تھا مثلاً جو ظالم تھے وہ مسلمان افسروں کی طرح قصائی نہ تھے ان میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو فرائض میں سخت تھے لیکن بہت سے مسلمان افسروں کا رویہ مسلمان نوجوانوں کے حق میں وحشیانہ تھا وہ قید میں ڈلوا کے بھی پیچھا نہیں چھوڑتے تھے مسلمان سیاسی قیدیوں کو عمداً اخلاقی قیدیوں میں رکھواتے، ہندوؤں اور سکھوں کو بظاہر کافر کہہ کر مارتے لیکن جی میں ڈرتے مسلمانوں سے ڈرنے کا سوال ہی نہ تھا انہیں غدار کہہ کر پیٹتے اور پٹواتے۔ ۲۲-۱۹۲۱ء کی تحریک لاتعاون کے بعد ان لوگوں نے پنجابی مسلمانوں میں ایک بھی سیاسی نوجوان اُبھرنے نہ دیا جو اُبھرا جیبی گھڑی بنا لیا دو چار صورتیں نکلیں، تو اُن کی حیثیت کو غارت کر دیا سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں میں پانچ سات "مسلمان" تھے انہیں قید کیا تو پھر اُس وقت چھوڑا جب وہ تھک ہار گئے یا اُن کے حوصلے نا قدری حالات کا شکار ہو کر ٹوٹ گئے یا پھر مسلمانوں سے ان کا تعلق نہ رہا۔ میں ہی ایک مسلمان نوجوان تھا جس نے ۱۹۲۹ء کی سیاسی تحریکوں کے بعد اس کوچہ میں قدم رکھا اور دنوں ہی میں نمایاں ہو گیا۔ خطابت کے خداداد جوہر کا چرچا ہونے لگا محض اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے قدم بڑھاتا رہا اور قدم بڑھتے ہی گئے لیکن پنجاب پنجاب ہی رہا اُس کے

مزاج وطبیعت سے انگریزوں کی چھاپ اُتارنا بہت مشکل تھا۔ خان بہادر عبدالعزیز جو قائمقام انسپکٹر جنرل پولیس بھی رہے یا پھر مرزا معراج الدین جو سی آئی ڈی میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کے عہدے تک پہنچے اور ابھی اونچا اُڑ رہے تھے کہ اچانک حرکت قلب بند ہونے سے رحلت کر گئے اپنے گماشتوں سمیت اس خو بو کے لوگ تھے کہ انگریز بھی اپنی سلطنت کے اتنے وفادار نہ ہوں گے یہ لوگ صرف انگریزوں کے لئے جئے اور انگریزوں کے لئے مرے۔ دوسروں کے بچوں کی گردنیں کٹوا کر اپنے بچوں کو سرفراز کیا' انعامات واعزازات پائے۔ میرزا صاحب کو مجھ سے صرف اس لئے للّٰہی بغض رہا کہ مَیں نے کسی مرحلے میں بھی ان کا آلۂ کار بننا قبول نہ کیا اس کا نتیجہ تھا کہ ۱۲۴/الف کا قیدی ہو کے بھی عام اخلاقی قیدیوں میں رہا لاہور سنٹرل جیل میں سیاسی اور غیر سیاسی قیدیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ بلاک تھے لیکن مجھے عمداً اخلاقی مجرموں میں رکھا گیا مسلمان سیاسی قیدیوں کو ہندو سیاسی قیدیوں سے الگ رکھنے کی ہدایات ہوم ڈیپارٹمنٹ جاری کرتا تھا لیکن سی آئی ڈی کے ایماو منشا پر مسلمان سیاسی قیدیوں کو اخلاقی قیدیوں میں رکھا جاتا' جس سے ان کی تحقیر ہوتی لیکن یہ سلوک نو وارد مسلمان سیاسی کارکنوں کے ساتھ تھا پرانے سیاسی زعما' یا کارکن' اس سے مستثنیٰ تھے۔ غرض وہ مسلمان نوجوان جو برطانوی امپیریلزم کے خلاف تھے ان کا پنجاب میں کوئی پرسان حال نہ تھا وہ سرکار کی بدسلوکی' اپنوں کی بے اعتنائی اور پرایوں کی بے رخی' کا شکار ہوتے رہے انگریز انہیں حقیر وباغی سمجھتا۔ ہندو مسلمان سمجھ کر صرفِ نظر کرتا اور مسلمان جانے کیا کچھ کہہ کر آوازے کستا' ان نوجوانوں کا حوصلہ قابل داد تھا کہ ستائش وتبریک کا کوئی سا گوشہ بھی سامنے نہ تھا مگر ضمیر کی سچائی اور مقصد کا عشق دو چیزیں ایسی تھیں جو ان کے حوصلوں کی روح اور ولولوں کی جان تھیں بہر حال مجھے اخلاقی قیدیوں میں رہنے کا یہ فائدہ ہوا کہ جیل خانے کا نظام' قیدیوں کی نفسیات اور جرم وسزا کی نوعیت سمجھنے میں آسانی ہو گئی ہزاروں قیدیوں میں رہا سینکڑوں سے ملا بیسیوں سے دوستی کی' طرح طرح کے جرائم اور رنگ رنگ کی سزائیں معلوم ہوئیں۔ بے شمار جوان و معمر میرے سامنے پھانسی پا گئے انہیں پڑھنے اور جانچنے کا موقعہ ملا۔

"پولیس ایک جرم دریافت کرنے کے لئے خود دس جرم کرتی ہے" ________

جسٹس ینگ یا جسٹس منرو نے اپنے کسی فیصلے میں یہ ریمارکس دیتے ہوئے انگریزی محاورے کے مطابق لکھا تھا کہ پولیس کا کام شکاری کا نہیں حفاظتی کتے کا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انگریزوں نے اس ملک کو اس سانچہ میں ڈھال دیا تھا کہ پولیس کے بغیر امنِ عامہ، خواب و خیال تھا یہ بات غلط نہیں کہ پولیس والے خود بھی غنڈے یا مجرم پالتے اور اس طرح اپنی کارگزاری کا راستہ نکالتے تھے۔ پنجاب میں پولیس نے جرائم کی باقاعدہ پرورش کی ہے سی آئی ڈی کے بعض افسروں نے محض اپنی ترقیوں کے لئے کئی مرحلوں میں سازش کو خود جنم دیا اُن کی تفصیل کا یہ محل نہیں اور غالباً اس طرح بات دور نکل جائے گی مگر پنجاب میں اراضی کے مربعے اور اعزاز و انعام حاصل کرنے کے لئے سی آئی ڈی کے بعض افسروں نے اس قدر گندہ ناٹک کھیلا کہ اب بھی اُس کے تصور سے جی لرز اُٹھتا ہے۔ بے شک سبھی ایسے نہیں تھے۔ خال خال لوگ نیک بھی تھے اور ان کی اچھی روایتیں بھی کانوں تک پہنچی ہیں یعنی ان کے سینہ میں بھی ملک و قوم کا درد تھا وہ بال بچوں کو پالنے کے لئے نوکری کر رہے تھے لیکن من حیث المجموع پنجاب پولیس ایک استبدادی طاقت کا نام تھا انگریزی حکومت کا دبدبہ قائم رکھنے کے لئے وہ جس شریف انسان کو چاہے ذلیل کر سکتی تھی کرتی رہی اور اس کے شواہد و نظائر موجود ہیں۔

موت کے قیدی

مجھے پھانسی پانے والے قیدیوں سے خاصی "دلچسپی" رہی ہیں اُن سے طرح طرح کے سوالات پوچھتا رہا میرے سامنے کوئی پانچ چھ سو قیدی تختہ دار پر لٹکے ہوں گے، اُن میں صرف دو بے گناہ تھے، ایک نے کہا کہ اُس نے یہ قتل تو نہیں کیا جس میں وہ پھانسی لگ رہا ہے البتہ اس سے پہلے وہ ایک قتل کر چکا ہے لیکن اُس میں بری ہو گیا تھا ایک دفعہ پھانسی کے تختہ پر چلا چلا کر کہتا رہا میں بے گناہ

ہوں، گواہ رہنا میں بے گناہ ہوں۔ میں نے قتل نہیں کیا تھانیدار نے قاتلوں سے رشوت لے کر مجھے پھانسی لگوا دی ہے۔ میں بے گناہ ہوں، باقی جتنے قیدی بھی میرے سامنے پھانسی پاتے رہے میں ان کے ہاتھوں کی رکیھا بھی دیکھتا رہا اور پوچھتا بھی رہا وہ تسلیم کرتے تھے کہ وہ ناحق پھانسی نہیں پا رہے انہوں نے قتل کیا ہے عام طور پر قتل کے محرکات میں ذاتی عداوتیں، خاندانی بدلے، ڈاکہ اور اسی قسم کے دوسرے اسباب مضمر ہوتے ہیں۔ اپنی ذات سے باہر کسی عشق یا مقصد کے لئے شاذ ہی کوئی جان دیتا ہے، اسی صوبہ کے ایک قصبہ پلول میں ایک ہندو سرکاری سرجن تھا جس نے اپنے گدھے کا نام (خاکم بدہن) حضورؐ کے نام پر رکھا ایک مسلمان نوجوان نے اُسے قتل کر ڈالا۔ عدالت نے اُسے سزائے موت کا حکم سنایا جو آخر تک بحال رہا اُس کے پھانسی پانے سے ایک دن پہلے میں اُسے ملا وہ چھریرے بدن کا ایک خوبصورت نوجوان تھا بڑا مطمئن مطلقاً پشیمان یا ہراساں نہ تھا اُس کا یقین تھا کہ وہ بارگاہ رسالتمآب میں حاضر ہو رہا ہے چنانچہ بڑی جوانمردی کے ساتھ دار کے تختہ پر گیا بڑے اطمینان کے ساتھ جان دی، مسلمانوں کو رسول اللہؐ (فداہ اُمی وابی) سے جو عشق ہے اور اسلام کے آثار و مظاہر سے جو محبت ہے، وہ شاید ہی کسی پیرو مذہب کو اپنے ہادی یا مذہب سے ہو مسلمانوں نے ۱۸۵۷ء سے لے کر تحریک خلافت ۱۹۲۰ء تک ذوق و شوق سے دار و رسن کو لبیک کہا۔ اور جوانمردی یا مردی کے بڑے بڑے نشان چھوڑے۔ اس کے بعد بھی سرحد کے سرخپوشوں، پنجاب کے خاکساروں نے پامردی کا ثبوت دیا۔ یو۔پی میں جمعیت العلماء اور پنجاب میں مجلسِ احرار نے قربانی و ایثار کا ولولہ کبھی سرد نہ ہونے دیا مگر خلافت کے بعد جب مسلمانوں کی قیادت بالطبع رجعتی عناصر کے ہاتھ میں چلی گئی تو ان میں سیاسی قربانی کی اجتماعی روح مقابلتہً کمیاب ہو گئی، انہوں نے خالص سیاسی مقصد کے لئے جان دینے کی رسم و راہ سے ہاتھ اُٹھا لیا لیکن حضورؐ اور اسلام کے نام پر جان دینا کبھی ترک نہ کیا یہ شمع ہر دور اور ہر حال میں روشن رکھی اور اس پر پتنگوں کی طرح قربان ہوتے رہے۔

مسجد شہید گنج کے انہدام پر (راہنماؤں کے اغراض مشومہ سے قطع نظر) نوجوانوں نے جس دلیری سے دو روز تک گولیاں کھائیں، اور متواتر اڑتالیس اور ساٹھ گھنٹے تک مورچہ باندھے رکھا بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے، قرنِ اول کے غزوات ہی کا عکس تھا ہم جہاد و قربانی کے جو معرکے کتابوں میں پڑھتے ہیں اُن کی تصویر ——— سے اِس کی نظیر مختلف ہوجاتی ہے کہ یہاں ایک طرف حکومت کے جبر و استبداد کا سرو سامان تھا دوسری طرف نہتے نوجوانوں کا شوقِ شہادت ہو انہیں کھینچ کھینچ کے گولیوں کے سامنے لاتا تھا۔

تحریکِ ختمِ نبوت

دوسرا معرکہ ختمِ نبوت کی تحریک میں پاکستان بن جانے کے بعد اِن آنکھوں نے دیکھا یہ ایک نہیں بیسیوں مورچے تھے بظاہر اس کا تعلق اس کہانی سے نہیں کیونکہ یہ کہانی بہت پہلے کی ہے اور آزادی سے پہلے کے ایام قید و بند کے گرد گھومتی ہے لیکن یہ کہانی چونکہ اب لکھ رہا ہوں اور ذکر بھی حضورؐ سے مسلمانوں کی شیفتگی کا ہے اس لئے تذکرۃً یہ واقعہ بھی آگیا ہے۔ کربلا کا سانحہ پڑھا یہ المیہ دیکھا ہے۔ وہاں خاندان اہل بیت تھا اُس کی عظمتیں و نسبتیں ہر لحاظ سے بالا و اعلا ہونے کے علاوہ مقدس و محترم ہیں یہاں جاں نثاران نبوت تھے کہ اپنوں ہی کے ہاتھوں گولیاں کھا کھا کر اور کلمہ طیبہ پڑھ پڑھ کر جان دے رہے تھے۔ ایک جگہ نہیں، لاہور کے مختلف بازاروں کوچوں کونوں اور موڑوں پر فدایانِ رسول شہید ہو رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے کافی ہاؤس کے سامنے نوجوانوں کے ایک غول کو شہید ہوتے دیکھا لا الٰہ الا اللہ پڑھتے چلے آرہے تھے مال روڈ کی طرف سے پولیس کا مسلح دستہ پہنچا باڑھ باندھا تڑتڑ گولیاں چلنے لگیں۔ نوجوانوں کی زبان سے یا رسول اللہ کے سوا کوئی کلمہ نہ نکلا اور

اس کلمہ کے ساتھ ہی دس بارہ نوجوان ڈھیر ہو گئے یہ اتنا دلدوز پُرجوش اور عظیم مظاہرۂ ایثار تھا کہ ان نظائر و شواہد ہی سے تاریخ کی بعض حیرت انگیز سچائیوں کو انسانی اذہان میں درجہ یقین حاصل ہوتا ہے یہ شرار بولہبی اور چراغِ مصطفوی کے درمیان معرکۂ کربلا ہی کا ایک جانگداز پڑاؤ تھا۔

شخصیتیں اور سانحے

۱۹۲۸ء بھی قید ہی میں گزر گیا تجربوں پر تجربے ہوتے رہے سکھوں کے مشہور معمر لیڈر بابا کھڑک سنگھ اسی جیل کے احاطہ دوم کی ایک علیحدہ بارک میں تھے ان کی تمام عمر قید و بند میں کٹی چل چلاؤ کا زمانہ تھا انگریزی حکومت کے خلاف نعرۂ رستخیز بلند کرتے رہنا ان کا مسلک ہو گیا تھا سید لال بادشاہ پیر آف مکھڈ بھی ان دنوں اسی جیل میں اے کلاس کے قیدی تھے انہیں ترغیب قتل کے الزام میں غالباً پانچ سال قید کی سزا ہوئی تھی جو اپیل میں معاف ہو گئی اور وہ چھ سات ماہ بعد رہا ہو گئے نظر بظاہر بڑے ہی کم گو، چپ چاپ، صابر و شاکر اور وضع دار بزرگ تھے سوندھی اپنی روایتی رعونت کے باعث ان سے بھی عام قیدیوں جیسا سلوک کرتا اور وہ ان سے ایک عاجز قیدی کی طرح ملتے اے کلاس کے عام ہندو یا سکھ قیدی قدرے تمکنت سے رہتے، مگر پیر صاحب میں تمکنت کا شائبہ تک نہ تھا ایک روز پیر صاحب کسی کاغذ پر سوندھی کے دستخط حاصل کرنا چاہتے تھے اور وہ کھلے باغیچہ میں دفتر لگا کے بیٹھا تھا پیر صاحب کوئی بیس گز کے فاصلہ پر دست بستہ کھڑے رہے اُس نے سر اُٹھا کر دیکھا تک نہیں کوئی گھنٹہ بھر بعد سر اُٹھا کے دیکھا پوچھا کیا چاہتے ہو؟ نفی میں جواب دے کر اُلٹے پاؤں واپس کر دیا پیر صاحب کے دل پر کیا گزری؟ اللہ بہتر جانتا ہے لیکن ہم دو چار مسلمانوں نے جو اپنے احاطہ سے سبھی کچھ دیکھ رہے تھے عزت کی اس رسوائی کو محسوس کیا سوندھی کو ذلیل کرنے میں غالباً لطف محسوس ہوتا تھا اور اس کی وجہ اس کا آئی۔ ایم۔ ایس ہونا تھا لیکن ان رعونتوں اور خشونتوں کے باوجود وہ پکا نیشنلسٹ تھا۔ انگریزوں کے مقابلہ میں ہندوستانی اور مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندو ——— !

ایک دن مسٹر بلمپ ایس ایس پی لاہور اور مسٹر بورن ڈپٹی کمشنر لاہور سہ ماہی انسپکشن پر آئے تو میں عام قیدیوں میں کھڑا تھا۔ بورن نے پوچھا "کس جرم میں قید ہوئے ہو"

"۱۲۴۔ الف میں"

"۱۲۴-الف؟" بورن کا رنگ قدرے متغیر ہو گیا گویا اب اُسے مجھ سے کوئی ہمدردی نہ رہی تھی۔

سوندھی سے مخاطب ہو کر بولا۔

"۱۲۴-الف کا قیدی عام قیدیوں میں گھل مل کے رہ رہا ہے؟" سوندھی نے جیلر کی طرف دیکھا۔

جیلر نے کہا "صوبائی گورنمنٹ کی ہدایت پر سیاسی قیدیوں سے الگ رکھا ہے"

"لیکن عام قیدیوں میں نہیں رکھنا چاہیئے" بورن بولا

جیلر بہت اچھا کہہ کر چپ ہو گیا لیکن بورن نے سوندھی سے کہا علیحدہ چکّی (CELL) میں بند کر دو۔ سوندھی کو ناگوار گزرا جیلر سے کہا کہ شورش سے کہہ دو کہ آئندہ جب کبھی یہ لوگ آئیں تو اُن کے سامنے نہ ہو، کچھ دنوں بعد بورن نے استفسار کیا تو اُسے ٹرخا دیا کہ آج کل چکی میں بند اور عام قیدیوں سے الگ ہے۔

اُدھر میرزا معراجدین نے حکم نامہ بھجوا دیا کہ عادی مجرم ہونے کی وجہ سے شورش کو منٹگمری جیل بھیج دیا جائے، لاہور کے ایک مجسٹریٹ نے وارنٹوں پر عادی مجرم لکھ دیا تھا۔ عجب نہ تھا کہ منٹگمری چالان ہو جاتا لیکن مرافعہ پر ایک تو وہ سزا ہی منسوخ ہو گئی، دوسرے اسی احاطہ میں ایک عادی مجرم مسٹر کنور سین تھے، جو غالباً لاگریجوایٹ تھے اور قانون کی نوک پلک خوب جانتے تھے انہوں نے بتایا کہ اس دفعہ کے تحت عادی مجرم قرار دینا ہی غلط ہے، عادی مجرم قرار دینے کے لئے فلاں فلاں دفعات ہوتی ہیں، بخشی پر مانند نے تسلیم کر لیا۔ معراجدین نے یہ نکتہ چھیڑا تو سوندھی آڑے آ گیا اس نے جواباً لکھا کہ "۱۲۴-الف" عادی مجرموں کی دفعہ نہیں ہے۔ یہ معاملہ چل ہی رہا تھا کہ میرزا معراج دین شملہ میں حرکت قلب بند ہونے سے رحلت کر گئے اور اس طرح یہ قضیہ ٹھپ ہو گیا ———— ایک انسان کی موت سے کئی عنوان بدل گئے۔

علامہ اقبال بھی اسی سال اللہ کو پیارے ہوئے! لاہور ہائیکورٹ کے جسٹس سکیمپ کا تاریخی تبصرہ ٹریبون کی شہ سرخی تھا۔

"ایشیا (یا شاید ہندوستان) کا آخری مسلمان چل بسا۔"

یہ خبر پڑھ کر میں بہت رویا بلکہ دیر تک روتا رہا۔ آنکھوں میں ایک گمشدہ سا نقشہ آگیا، یہی دو چار دفعہ ان کے ہاں گیا تھا دو تین دفعہ مولانا ظفر علی خان کے ساتھ، آخری دفعہ اس قید سے پہلے چودھری افضل حق کے ہمراہ، لیکن کجا ذرہ، کجا آفتاب ——— کئی دن تک ان کی وفات کا قلق رہا سبھی زخم بھر جاتے ہیں یہ زخم بھی بھر گیا۔

ایک روز میں اپنے احاطہ میں بیٹھا کوئی رسالہ دیکھ رہا تھا کہ جیلر کا اردلی میرے پاس آیا کہنے لگا بخشی صاحب بلاتے ہیں؛ اُن کے پاس ایک خوش وضع اور خوب رُو انسان پاس بیٹھا تھا۔ جیلر نے کہا آپ کے ملاقاتی ہیں؛

"میرے ملاقاتی؛" حیرت ہوئی کہ کون صاحب ہیں؛ بخشی صاحب نے میری حیرت کو توڑتے ہوئے کہا کہ ان کا نام سردار احمد بخش ہے۔ سردار سکندر حیات کے عزیز اور کھیوڑہ کی مزدور سیٹ سے اسمبلی کے ممبر ہیں۔ زحمت فرمائی کا سبب پوچھا فرمایا، مولانا ظفر علی خان اور اُن کے بعض نوجوان ساتھی آپ کی رہائی کے لئے سردار صاحب پر زور دے رہے ہیں۔ سردار صاحب بھی آپ کو جیل میں رکھنا نہیں چاہتے ان کی یہ شرط ہے کہ آپ لاہور چھوڑ دیں۔

"کہاں جاؤں؛"

"لاہور کے سوا آپ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں"

میں نے اُن کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے عرض کیا "یہ مشروط رہائی مجھے منظور نہیں؛ میں اس کو ذلت سمجھتا ہوں۔ میں نے اپنی راہ متعین کر لی ہے اور بحمد للہ مطمئن ہوں۔ سردار صاحب کو میرا سلام کہیئے۔"

سردار احمد بخش واضح جواب پا کر چُپ ہو رہے۔ میں نے مصافحہ کیا اور اندر چلا آیا ———

—— قید کا تیسرا دور تھا۔ کسی نہ کسی طرح یہ دن بھی کٹ ہی گئے۔ خیالات بالکل وہی تھے، جو ایک انقلابی کے ہوتے ہیں۔ افکار پر جدوجہد کے اعتبار سے مولانا ابوالکلام آزادؔ کی تحریروں کا جادو چھا رہا تھا۔ اس وقت تک میں کسی دوسری جماعت میں باقاعدہ شریک نہ تھا تاہم میرے سامنے صرف ہندوستان کی آزادی کا سوال تھا۔ مولانا ظفر علی خان سے جو تعلق خاطر تھا اب اس کا ولولہ باقی نہیں رہا تھا شہید گنج کے المیہ کا ایک ایک ورق سامنے آ چکا تھا چونکہ ہم قومی ہندوستان کے اتحاد کو غارت کرنے کا الزام انگریزوں پر دھرتے تھے، لہٰذا انہیں پر شہید گنج کے انہدام کی ذمہ داری ڈالتے' زمیندار بڑے دنوں تک کانگرس کا حامی رہا۔ غالباً ۱۹۳۸ء کے آغاز میں سردار سکندر حیات نے اس کا رُخ پلٹا' اور وہ کانگرس کی حمایت سے ہمیشہ کے لئے دستبردار ہو گیا' ورنہ اس وقت تک سیاستہً وہ کانگرس ہی کا ہمنوا تھا جو لوگ نسلاً بعد نسلٍ انگریز پرست تھے اور تحریک شہید گنج میں محض مجلس احرار کو "مٹانے" کے لئے چلے آئے تھے انتخابات ختم ہوتے ہی روپوش ہو گئے' اور آج کل سکندر حیات کی چوکھٹ پر تھے۔ کانگرسی زعماً مثلاً مولانا عبدالقادر قصوریؒ اور ڈاکٹر محمد عالم کو احرار سے ملال تھا اب وہ بھی اپنی اپنی جگہ لوٹ چکے تھے۔ میں جیل میں تھا کہ لیگ نے پنپنا شروع کیا۔ مولانا کے نوجوان بازو اُس میں چلے گئے مولانا ظفر علی خان بوڑھے ہو گئے اور اب ان میں دم خم نہیں رہا تھا۔ سنٹرل اسمبلی کی رکنیت نے انہیں گوشہ نشین سا کر دیا ——

قید کا یہ زمانہ میں نے بغیر کسی آشنائی کے بسر کیا والد کی بے سروسامانی ہی سروسامان رہی وہ دوسرے تیسرے مہینہ ملاقات کے لئے آ جاتے' یا سید عنایت شاہ ایڈیٹر "سیاست" تشریف لاتے' اِکا دُکا ذاتی دوست بھی چلا آتا، مگر کسی جماعت یا فرد کے ساتھ سیاسی خیالات کی بناء پر میرا کوئی رشتہ نہ تھا اپنے ہی خیالات کی تنہائیوں میں وقت نکل گیا ۱۹۳۹ء شروع ہوا تو سوا سال بعد ۱۲ فروری کو رہا ہو گیا۔ احرار کے چار پانچ سو رضاکار استقبال کو موجود تھے' چند ایک اتحاد ملتی بھی آ گئے تھے،

مَیں نے احرار میں شمول کا فیصلہ جیل ہی میں کر لیا تھا مجھ پر شہید گنج کا سانحہ اپنی تمام اصلیتوں کے ساتھ کھل چکا تھا، مَیں نے جو کچھ اس تحریک میں دیکھا وہ اتنا اندوہ ناک تھا کہ پناہ بخدا چودھری افضل حق نے اپنی عظیم فراست' اور ذاتی دیانت' کا مجھ پر ایسا نقش جمایا کہ مَیں خود ہی اُن کی طرف کھنچ گیا۔ اِدھر اس قید نے مجھ میں کئی چیزیں پیدا کر دیں۔ مثلاً

۱۔ مَیں خود اعتماد ہو گیا۔

۲۔ میرا حوصلہ بڑھ گیا۔

۳۔ مَیں نے اپنے لئے جدوجہد کا سیاسی میدان متعین کر لیا۔

۴۔ میرے نظریات متشکل ہو گئے۔

۵۔ مجھے مطالعہ کا عادی بنا دیا۔

۶۔ میری فکر کو یکسوئی بخشی۔

۷۔ اچھے بُرے سیاسی نظریوں اور قومی و ملکی راہنماؤں کی پہچان ہو گئی۔

۸۔ ملک کو انگریزی سامراج سے نجات دلانے کا جذبہ سرفہرست آ گیا۔

۹۔ اس سے پہلے مَیں نراج کی طرف راجع تھا اب میرا ذہن ایک ایسے انقلابی نوجوان کا ذہن ہو گیا جو اثباتی نظریات کی اساس پر ملک کی آزادی چاہتا ہو'

۱۰۔ مَیں عدم تشدد کا قائل ہو گیا کیونکہ جس جماعت یا قوم کے پاس حکومتوں کے منظم تشدد کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہ ہو اُنکے لئے عدم تشدد اور ترکِ موالات ہی بہترین ہتھیار ہیں۔

۱۱۔ لیڈروں کے متعلق میرا تصور پرستش کے بجائے پُرسش ہو گیا۔

۱۲۔ ملک کی سیاسی ضرورتوں اور اُن کے اُور چھور سے کماحقہٗ شناسا ہو گیا۔

احرار کانفرنس پشاور

اپریل ۱۹۳۹ء میں آل انڈیا مجلس احرار کا سالانہ اجلاس پشاور میں ہوا۔ چودھری افضل حقؒ صدر تھے۔ انہوں نے ایک تاریخی خطبہ پڑھا جس میں تقریباً سبھی سیاسی مسئلوں پر روشنی ڈالی چودھری صاحب نے فرمایا؛ دوسری جنگ عظیم یورپ کے سر پر منڈلا رہی ہے جانے کب لڑائی چھڑ جائے اس جنگ میں ہارنے والے تو ہاریں گے مگر جیتنے والے بھی ہار جائیں گے ظالموں کا یوم حساب قریب آگیا ہے اب برطانیہ کے لئے ہندوستان میں رہنا مشکل ہوگا۔ ملک آزاد ہو کر رہے گا وغیرہ۔ چودھری صاحب کا یہ خطبہ نہ صرف ان کی سیاسی فراست کا شہ پارہ تھا بلکہ جو کچھ انہوں نے اس میں فرمایا وہ حرف بحرف پورا ہو کے رہا ملک میں کانگرسی وزارتیں کام کر رہی تھیں ڈاکٹر خان صاحب صوبہ سرحد میں وزیر اعظم تھے انہوں نے تحریر و تقریر کی آزادی کو عام ہی نہیں کیا بلکہ ان کی وجہ سے لوگوں میں حوصلہ و اعتماد بڑھ گیا تھا۔

مَیں نے بھی اس کانفرنس کو خطاب کیا میرے خیالات بلاشبہ باغیانہ تھے خانصاحب کی حکومت نہ ہوتی تو یہ تقریر کبھی برداشت نہ کی جاتی انگریز گورنر رپورٹ پڑھ کر خفا ہو گیا اس نے خانصاحب کو بُلایا خانصاحب ہو نہ ہاں کر کے آئے مگر آتے ہی سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور دوسرے احرار لیڈروں کو چائے پر مدعو کیا۔ گورنر کی ناراضی بہان کی اس دوران گورنر کا فون آگیا کہ تقریر پر کیا ایکشن (ACTION) لیا ہے خانصاحب ٹال گئے تاہم صوبہ سرحد سے مجھے نکلنا پڑا میں چودھری صاحب کے ہمراہ لاہور روانہ ہو گیا مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی پشاور رہ گئے تاکہ کانفرنس کے اثرات معلوم کریں۔ خانصاحب اور گورنر میں جھڑپ ہو گئی گورنر چاہتا تھا کہ مجھے گرفتار کر کے مقدمہ چلایا جائے خانصاحب راضی نہ ہوئے انہوں نے کہا کہ وہ مقرر کو صوبہ سے نکال چکے ہیں گورنر مصر تھا کہ تقریر

میں کھلم کھلا تشدد پر اُبھار اگیا ہے مقدمہ چلنا چاہیئے غرض خانصاحب نہ مانے اور اِس طرح یہ بلا ٹل گئی۔

انہی دنوں سنٹرل اسمبلی نے "آرمی بل" پاس کر دیا۔ یہ احرار رہنماؤں کی تقریروں کا ردِ عمل تھا جو دوسری جنگ عظیم کے چھڑ جانے کی پیش گوئی کر رہے اور علی الاعلان فوجی بھرتی کی مخالفت پر تلے ہوئے تھے۔ ان کے نزدیک برطانوی سامراج پر ضرب لگانے کا یہ آخری موقع تھا احرار نے آرمی بل کے خلاف باقاعدہ مہم شروع کر دی حافظ علی بہادر نے بمبئی میں احرار کانفرنس منعقد کی۔

بمبئی کا سفر

لاہور سے احرار رہنماؤں سالاروں اور رضا کاروں کا ایک قافلہ بمبئی پہنچا تین دن تک اجلاس ہوتا رہا انہی دنوں مَیں نے یورپ کی جنگ پر ایک معرکہ آرا نظم کہی مَیں کبھی کسی مشاعرے میں نہیں گیا اور نہ بحیثیت شاعر کبھی کسی جلسہ میں کوئی نظم پڑھی۔ لیکن یہ نظم ہی ایسی تھی کہ پڑھ کے خود بھی لطف اُٹھاتا رہا اس میں جوش وجذبہ عروج پر تھے پنڈال میں لاکھ سے کیا کم مجمع ہوگا۔ نظم نے آگ لگا دی اگلے روز بمبئی کے تمام اردو روزناموں نے صفحہ اوّل پر نظم چھاپ دی۔ انگریزی روزناموں میں بھی نظم کا چرچا رہا تقریر نے اَور رنگ باندھا میری تصویریں اور انٹرویو چھپنے لگے مسٹر کے۔ ایف نریمان کی صدارت میں صوبہ کانگرس کمیٹی کا جلسہ عام ہو رہا تھا مجھے بھی مدعو کیا گیا وہاں تقریر کی جو مقامی اخبارات نے نمایاں طور پر شائع کی بمبئی کرانیکل کے وقائع نگار نے لکھا کہ

> ایک نوجوان جو ابھی لڑکپن سے نکلا ہی ہے احرار کانفرنس پر چھایا رہا بمبئی کے لوگوں نے اس کو کئی جگہ تقریروں کی دعوت دی وہ اردو زبان کا ایک شعلہ نوا اور صاف گو مقرر ہے لوگوں کے دماغ و دل پر جادو کرتا ہے اُس نے احرار کانفرنس

میں اڑھائی گھنٹے تک تقریر کی لوگ اس طرح بیٹھے رہے جیسے اُس نے سحر کر دیا ہو،

سید عطاء اللہ شاہ بخاری جیسا عظیم خطیب جو انسانی عقلوں کا شکار کرتا رہا ہو اپنی تقریر ختم کر چکا تو دن کے اُجالے میں ابھی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا لوگوں نے شور مچا دیا! شورشؔ! شورشؔ! چنانچہ فجر کی اذان ہونے تک میں بولتا رہا۔ اتنا بڑا مجمع اکائی کی تصویر بنا رہا۔

بمبئی سے رخصت ہو کر ہم آگرہ پہنچے وہاں قلعہ کے میدان میں بڑے معرکہ کا جلسہ ہوا۔ ہزارہا انسان جمع تھے ہم لوگ گویا جان کی بازی لگا کر تقریریں کر رہے تھے، لازماً یہ تقریریں قانون کی زد میں آتی تھیں مگر ان صوبوں میں چونکہ کانگرس کی حکومتیں تھیں لہٰذا ہم لوگ گونج گرج کر چلے آئے پنجاب فوجی بھرتی کا مرکز تھا یہاں سے برطانیہ کو سپاہی ملتے بلکہ بعض اضلاع تو سپاہی جنتے تھے انگریزوں کے لئے یہ صوبہ ہیروں کی کان تھا پولیس اور فوج دونو فصلیں یہاں اس کثرت سے ہوتی تھیں کہ برطانوی مستعمرات میں اتنی کار آمد فصلوں کا پیدا ہونا ناممکن تھا سردار سکندر حیات احرار سے عاجز آ چکے تھے۔ اب اُن کے ہاتھ میں آرمی ایکٹ بھی آ گیا۔ ۱۲۴۔الف وہ پہلے ہی کھُلے دل سے استعمال کرنا چاہتے تھے احرار رہنماؤں کے لئے جیل روزمرہ کا کھیل تھا انہوں نے فوجی بھرتی کے خلاف آواز اُٹھانا اور سکندر حیات کی وزارت کو نشانہ تنقید بنانا اپنا شعار بنا لیا تھا تمام صوبہ میں دن رات تقریریں ہو رہی تھیں خود مَیں نے مئی سے اگست تک بیسیوں مقامات پر تقریریں کیں۔

یک روزہ قید

ڈیرہ اسماعیل خاں (صوبہ سرحد) کے احباب بہ اصرار اپنے ہاں لے گئے وہاں تین تقریریں کیں۔ ایک رات جلسہ کے بعد ـــــــ بستر پہ لیٹے ہی تھے کہ پولیس نے میزبان کے مکان کو

گھیر لیا مجھے اور میرے ساتھی میرزا غلام نبی جانباز کو گرفتار کیا رات بھر حوالات میں رکھا علی الصبح جیل پہنچا دیا۔ ڈیرہ اسماعیل خاں سنٹرل جیل سرحد کا کالا پانی تھا۔ دیواروں اور تالوں کا گورکھ دھندا۔ ہمیں علیحدہ علیحدہ چکیوں (CELLS) میں رکھا جانباز نے پولیس سے خفا ہو کر کھانا واپس کر دیا تھا اب جیل میں بھی بھوک ہڑتال پر مصر تھا میں اس بھوک ہڑتال کے حق میں نہ تھا کیونکہ سرحد کی پولیس کا رویہ قابل اعتراض نہ تھا جس بات پر جانباز خفا ہوا انسپکٹر نے معذرت کر لی تھی جانباز ضد پر قائم رہا میں اس کے بغیر کیونکر کھا پی سکتا تھا جانباز کو سمجھایا نہ مانا لطیفہ یہ رہا کہ میں تو بھوک ہڑتال پر ڈٹ گیا جانباز چپکے سے راضی ہو گیا ڈاکٹر خانصاحب کے فرزند خان عبید اللہ خان اسی جیل میں قید تھے ڈاکٹر صاحب نے انہیں کسانوں کی تحریک کے سلسلہ میں قید کر رکھا تھا جانباز اُن کے کہے پر مان گیا اُدھر ڈیرہ کے لوگوں نے ہماری گرفتاری کو اپنی ہتک سمجھا ہڑتال کر دی مظاہرہ کرنے لگے ضلعی حکام سخت پریشان ہوتے۔ لوگوں پر زور دیا کہ دوکانیں کھول دیں مظاہرے بند کر دیں لوگ کہتے کہ مہمانوں کا پکڑے جانا میزبانی کی ہتک ہے شام کو پشاور سے ڈاکٹر خان کا حکم آگیا کہ چھوڑ دو۔ سپرنٹنڈنٹ اور ڈپٹی کمشنر چاہتے تھے کہ ضلع کے حدود سے نکال کر ہمیں پنجاب کے حدود میں پہنچا دیں لوگ کوئی سی شرط بھی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے اور یہ سبھی کچھ عوام کے اخلاص سے ہو رہا تھا غرض شام ہوتے ہی ہمیں چھوڑ دیا گیا باہر نکلے تو جیل کے دروازے پر ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا زندہ باد کے نعروں سے لوگوں نے کاندھوں پر اُٹھا لیا پھولوں سے لاد دیا جلوس نکالا ایک بڑا جلسہ ہوا گرما گرم تقریریں ہوئیں اگلے روز ہم لاہور کے لئے روانہ ہو گئے سینکڑوں لوگوں نے دریائے سندھ کے کنارے پر الوداع کہی یک روزہ قید کا لطف ختم ہو گیا۔

دوسری جنگ عظیم

سردار سکندر حیات تقریباً سبھی احرار رہنماؤں کی گرفتاری کا فیصلہ کر چکے تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن

پر لدھیانہ میں مقدمہ چل رہا تھا اور وہ ضمانت پر تھے مولانا مظہر علی اظہر راولپنڈی کی ایک تقریر میں زیر دفعہ ۱۲۴۔الف ماخوذ تھے۔ شاہ جی کے خلاف ۱۲۱ اور ۱۲۴۔الف کے علاوہ $\frac{302}{117}$ کے مقدمات رجسٹر ہو چکے اور وہ ایک آدھ دن میں گرفتار ہونے والے تھے۔ میرے خلاف اوکاڑہ کی ایک تقریر کو قابل مواخذہ قرار دے کر ۱۲۴۔الف کا مقدمہ چلایا جا رہا تھا وارنٹ نکل چکے تھے تعمیل باقی تھی اتنے میں خبر آئی کہ ہٹلر نے ڈینزگ پر حملہ کر دیا ہے یہ دوسری جنگ عظیم کا آغاز تھا فوراً ہی قانون دفاع ہند نافذ ہو گیا۔

چودھری صاحب ہفتوں سے اسی گھڑی کے منتظر تھے اُس روز امرتسر میں تھے خبر پڑھتے ہی رقص کرنے لگے۔ کبھی اتنا خوش نہیں ہوئے جتنا اُس روز خوش تھے۔ فرمایا اب برطانوی سامراج کا مرحلہ جانکنی ہے۔ یہ جنگ اِس کے لیے حرف آخر ثابت ہو گی، جیت ہو یا ہار، انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑے گا، اور ہندوستان سے برطانیہ کے اخراج ہی میں افریشیائی ملکوں بالخصوص جزیرۃ العرب کی نجات ہے، مجلس احرار اسلام کی مجلس عاملہ کا فوری اجلاس بلوایا جس میں فوجی بھرتی کے خلاف تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ شیخ حسام الدین صدر اور میں جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ نوجوان رضاکاروں نے ناچنا شروع کیا ہال بازار میں لوگوں کا ایک ہجوم ہو گیا غرض اس جرأتمندانہ اقدام پر نعرہ ہائے تحسین گونج اُٹھے رات گلوالی دروازے میں جلسۂ عام منعقد ہوا چودھری افضل حق صدر جلسہ تھے اکثر احرار رہنما سٹیج پر فروکش تھے۔ میں نے قرار داد کی وضاحت میں بڑے ہی بانکپن سے تقریر کی۔ ہزار ہا افراد کا مجمع تھا۔ تقریر نے لوگوں میں اتنا جوش و خروش پیدا کیا کہ اثنائے تقریر میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اُٹھ کھڑے ہوئے مجھے اپنے دونو بازوؤں میں بھینچ لیا فرمایا تقریر بند کر دو یہی وہ مقام ہے جہاں ایک خطیب لوگوں کے دل و دماغ پر قابو پا کر جس طرف چاہے اس کا رُخ موڑ سکتا ہے یہ خطابت نہیں ساحری ہے اور ساحری عقل و ہوش کو شکار کرتی ہے۔ تم ساحر نہ بنو داعی رہو جو تمہیں کہنا تھا کہہ چکے ہو جلسہ برخاست کیا جاتا ہے لوگ نعرہ ہائے تکبیر اور نعرہ ہائے رستخیز کے ساتھ رخصت

ہو گئے پولیس میری تلاش میں تھی ۱۲۴ ۔ الف کے وارنٹ پیچھا کر رہے تھے میں لوگوں کے ہجوم سے نکل کر غائب ہو گیا ۔ رات کوئی ایک بجے چودھری صاحب کے پاس دفتر احرار پہنچا تو وہ بستر پر لیٹے ہوئے تھے فرمایا ۔ یہاں کیوں آئے ہو ؟ چلے جاؤ پولیس ڈھونڈھ رہی ہے رات بھر ایک دوست کے ہاں چھپا رہا دن چڑھے لاہور چلا گیا وہاں رات کو جلسہ عام تھا شیخ حسام الدین نے مجھ سے کہا کہ چودھری صاحب نے کہلا بھیجا ہے کہ شورش اس جلسہ میں تقریر نہ کرے میں امرتسر کی تقریر کے نشہ میں تھا اور یہاں بھی اسی سرور میں ڈوب کے تقریر کرنا چاہتا تھا سمجھ میں نہ آیا کہ چودھری صاحب نے منع کیوں فرمایا ہے ؟ ایک لاکھ کا مجمع ہو گا شیخ صاحب نے کوئی تین گھنٹہ معرکہ آرا تقریر کی ۔ اگلے روز چودھری صاحب ملے تو ناراض ہوئے کہ تقریر کیوں نہیں کی ؟ میں نے شیخ صاحب کی روایت کا ذکر کیا فرمایا میں نے تو کوئی پیغام نہیں بھیجا تھا پھر کچھ سوچ کر خاموش ہو گئے اُن کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس "فرضی روایت" سے خوش نہ تھے ۔

میرا ارادہ یو ۔ پی کی طرف نکل جانے کا تھا غازی محمد حسین نے تاندلیانوالہ میں احرار کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کر رکھا تھا وہ مصر تھے کہ اس صورتحال کے بعد کانفرنس ناکام رہی تو نہ صرف اُنکے انتظامات درہم برہم ہو جائیں گے بلکہ جماعت کو بھی صدمہ پہنچے گا ۔ چنانچہ ان کے اصرار پر میں اور اسمٰعیل ذبیح ان کے ساتھ روانہ ہو گئے ۔ اِدھر پولیس ہماری تلاش میں تھی ۔ اُس نے لاہور کا کونہ کونہ چھان مارا لائل پور پہنچ کر ہمیں کچھ دیر کے لئے رکنا پڑا مقامی جماعت نے جلسہ عام کا اعلان کر دیا دھوبی گھاٹ پر بے پناہ ہجوم تھا چاروں طرف آدمی ہی آدمی حکیم نورالدین کی صدارت میں دھواں دھار تقریر ہوئی پھر جیسا کہ طے پایا تھا جلسہ برخاست ہوتے ہی چاروں طرف کے گیس فوراً بجھا دیئے گئے میں وہیں سٹیج تلے چھپ گیا رضا کار اندھیرے میں ایک نوجوان کو کاندھے پر اُٹھا کر شورش کاشمیری زندہ باد کہتے ہوئے شہر کو چلے گئے جلوس گھنٹہ گھر پہنچا تو روشنی میں کھُلا کہ شورش جلوس میں

نہیں کوئی اور نوجوان ہے سی آئی ڈی کو پریشانی ہوئی رضا کار قہقہے اڑاتے ہوئے منتشر ہو گئے۔

پولیس نے اِدھر اُدھر چھاپے مارنے شروع کئے مگر بے نتیجہ، مَیں وہاں سے نکل کر ایک ذاتی دوست خورشید کے ہمراہ اس کے ہاں چلا گیا یہ دوست اُس وقت زراعتی کالج میں ملازم تھا پھر فوج میں لیفٹیننٹ ہو گیا جنگ کے اختتام پر میجر تھا پولیس لائنز کے ساتھ ہی اس کا کوارٹر تھا اس نے اپنے ایک ایسے ساتھی کے مکان پر پہنچا دیا جو عقیدۃً قادیانی تھا تھوڑی ہی دیر پہلے میرا اس سے تعارف ہوا تھا مَیں قدرے جھجکا لیکن خورشید نے کہا جھجکنے کی ضرورت نہیں یہ میرا معتمد دوست ہے شہر سے باہر کھیتوں کی طرف اس کا مکان ہے۔ وہاں کوئی اندیشہ یا خدشہ نہیں وہیں کھانا کھایا صبح ناشتہ کیا دن چڑھے اسمٰعیل ذبیح اور محمد حسین غازی کو بلوایا تاندلیانوالہ ہم اِس رازداری سے پہنچے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی جلسہ ہو رہا تھا تقریر کی شام کے اجلاس میں دوبارہ تقریر کا وعدہ کیا دوستوں کو تصویر کھنچوانے پر اصرار تھا اتنے میں ایک نوجوان نے اطلاع کی کہ پولیس آرہی ہے جہاں ٹھہرا تھا اس کی کھڑکی سے دیکھا تو سب انسپکٹر پولیس کی جمعیت لئے بھاگم بھاگ آرہا تھا۔ ذبیح اور مَیں عقبی دروازے سے نکل گئے فرلانگ دو فرلانگ کے فاصلہ پر ایک دوسرے دوست کا مکان تھا وہاں پہنچے کچھ دیر قیام کیا وہی نوجوان بھاگتا ہوا آیا کہ پولیس یہاں بھی آرہی ہے باہر نکلے اُڑنے کے لئے پر تول ہی رہے تھے کہ میاں نور اللہ شیخ حسام الدین کو اپنی کار میں لے کر پہنچ گئے، اُن سے درخواست کی کہ ہمیں کسی ایسے راستہ پر چھوڑ دیں جہاں سے ہم لاہور چلے جائیں شیخ صاحب کو تقریر کرنی تھی وہ تاندلیانوالہ رہ گئے میاں صاحب ہمیں فوراً ہی لے کر اُڑ گئے سب انسپکٹر نے دوڑ لگائی لیکن ہم نکل چکے تھے پولیس منہ دیکھتی رہ گئی۔ موٹر کوئی چالیس پچاس گز چلا ہو گا کہ رُک گیا تھانیدار نے زقند لگائی۔ پانچ قدم کا فاصلہ درمیان میں تھا کہ موٹر سٹارٹ ہو گیا میاں نور اللہ ہوا ہو گئے پولیس نے ناکہ بندی کے لئے چاروں طرف فون کئے لیکن وہ راستہ بدل کر گوجرہ پہنچ گئے۔ ہم دونوں کو ریل کی پٹڑی پر اُتارا اور کہا کہ آپ لوگ یہاں ٹھہریں مَیں

ابھی آتا ہوں۔ تاندلیانوالہ سے بھاگتے وقت ہم اپنا سامان وغیرہ وہیں چھوڑ آئے تھے۔ جیب میں ایک ٹکا تک نہیں تھا۔ اس افراتفری میں میرا بٹوہ بھی نکل گیا ۔ ذبیح کے روپے سوٹ کیس میں رہ گئے لاہور تک دو یا تین روپے ریل کا کرایہ تھا۔ میاں صاحب نے ہمیں گوجرہ کی مجلس احرار کے حوالے کیا اور رخصت ہو گئے۔ مقامی صدر نے ہمیں دس یا بیس روپے دیئے۔ اِس آنے جانے میں کوئی پون گھنٹہ اُٹھ گیا۔ ہم پٹڑی پر ٹہل رہے تھے کہ کچھ دیہاتی نوجوانوں نے ہمیں گھورنا اور پہچاننا شروع کیا۔ یہ غالباً چرواہے تھے اُن کے ہاتھ میں لمبی لمبی ڈانگیں (لاٹھیاں) تھیں۔ ایک نوجوان قریب آگیا پوچھنے لگا

"آپ کا نام شورش کاشمیری ہے؟"

"ہاں بھائی"

اس میں عقیدت و احترام کے ملے جلے جذبات پیدا ہو گئے۔ بولا "ہم نے آپ کی تقریر سنی ہے آپ یہاں کیوں کھڑے ہیں گوجرہ چلئے لوگ آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔ اُن سے معاملہ بیان کیا تو وہ پُرجوش ہو گئے۔ ہمارے ساتھ چلئے دیکھیں وہاں کون آتا ہے پولیس کی ایسی تیسی لاشیں بچھا دیں گے۔ ایک نوجوان دوڑ کر گھر سے لسّی مکھن اور مکئی کی روٹی لے آیا ہم دونوں نے سیر ہو کر کھائی لاہور کی گاڑی نکل چکی تھی تھوڑی دیر میں ایک گاڑی شورکوٹ جا رہی تھی پولیس کے تعاقب سے بچنے کے لئے ہم اُس میں سوار ہو گئے رات نو بجے شورکوٹ پہنچے معلوم ہوا کہ کوئی دو بجے لاہور کے لئے گاڑی ملے گی، کیا کریں؟ شورکوٹ کا اسٹیشن تو بڑا ہے لیکن باہر ویرانہ تھا ہم ایک تنور یے کی دکان پر آ بیٹھے دو دو روٹیاں لیں ایک ایک آنے کی دال، پیٹ بھر گیا کرایہ پر دو چارپائیاں لیں اور لیٹ گئے نیند کیا آتی؟ کچھ دیر سستا لیا اچانک سفید کپڑوں میں ایک کنسٹیبل آگیا پوچھنے لگا،

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"ملتان" میرے منہ سے نکل گیا۔

ملتان کی گاڑی میں دو گھنٹے اور لاہور کی گاڑی میں چار گھنٹے باقی تھے ذبیح نے بعض وجوہ کی بنا پر ملتان ہی کا فیصلہ کر لیا۔ کنسٹیبل بولا"

"آپ ملتان میں رہتے ہیں؟"

"جی نہیں۔ کاروبار کے لئے جا رہے ہیں۔"

"کیا کام کرتے ہیں آپ؟"

"مسلم انشورنش کمپنی میں انسپکٹر ہیں۔ وہاں ہمیں میجر عاشق حسین سے ملنا ہے"۔

اِسی طرح کے دو چار سوال کر کے ٹل گیا اور ہم ملتان کے لئے سوار ہو کر خانیوال چلے گئے خانیوال سے گاڑی بدلی اور صبح سویرے ملتان پہنچ گئے۔

ملتان کا معرکہ

ملتان میں حافظ یار محمد صدر مجلس احرار اسلام کے مکان پر قیام کیا دوستوں نے جلسہ عام منعقد کرنے کا فیصلہ کیا کوئی چار بجے شام احرار کا مقامی سالار لال دین عاصی بھی شریک راز ہو گیا ایک اور نوجوان جو میرا ذاتی دوست تھا ڈھونڈتے ڈھانڈتے حافظ جی کے مکان پر آن نکلا۔ صلاح یہ ٹھہری کہ اثنائے تقریر میں کسی نہ کسی بہانے مجھے نکل جانا چاہیئے جلسہ حسین آگاہی میں ہو رہا تھا اسٹیج حافظ جی کے مکان کے پہلو میں بنایا گیا۔ طے یہ کیا کہ تقریر ختم کرنے سے پہلے کسی کتاب کا حوالہ دوں پھر کتاب لانے کا بہانہ کر کے حافظ جی کے مکان میں چلا جاؤں اور وہاں عقبی دروازے سے نکل جاؤں۔ میرے دوست کا اپنا موٹر تھا اُس نے کہا مَیں خود ڈرائیو کروں گا اور اس طرح ہم راتوں رات لاہور پہنچ جائیں گے ذبیح صدر جلسہ قرار پائے کیونکہ ملتانی احباب پولیس کے

تیور دیکھ کر مدارت کرنے سے گھبرا رہے تھے۔

بہیمانہ تشدّد

لال الدین عاصی پولیس کا دوست نکلا اُس نے حرم دروازے کے تھانیدار لیکھراج کو تمام کوائف سے آگاہ کر دیا حافظ جی کا مکان بھول بھلیاں سے کم نہ تھا نمازِ عشاء کے بعد جلسہ شروع ہوا بیس تیس ہزار کے لگ بھگ حاضری تھی مکانوں کی چھتوں پر لوگ ہی لوگ اور چھتوں کے پیچھے عورتیں ہی عورتیں، پولیس تاک میں تھی لیکن میں ایک تحتانی دروازے سے اسٹیج پر آ گیا ٹیل ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ارالٹون ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس ایون سٹی انسپکٹر اور لیکھ راج سب انسپکٹر پولیس کی بھاری جمعیت لے کر جلسہ گاہ میں موجود تھے چاروں طرف سے جلسہ گھرا ہوا تھا مجھے یقین ہو گیا کہ اب یہاں سے بھاگنا مشکل ہے گرفتاری ہو کے رہے گی۔ لال دین عاصی نے پولیس کو پکا کر دیا تھا چنانچہ حافظ جی کے مکان کا صدر عقبی اور تحتانی دروازہ پولیس کے قبضہ میں تھا اسٹیج کے پیچھے میری نشست سے ایک گز کے فاصلہ پر پولیس کے قد آور جوان لمبی لمبی ڈانگیں لئے کھڑے تھے۔

تقریر نقطۂ عروج کو پہنچ چکی تھی میں بیان کر رہا تھا کہ جاپان نے منچوریا کی سرحد پر انگریز عورتوں کے ساتھ جو بدسلوکی کی ہے اگر وہ بدسلوکی یا اس کا عشرِ عشیر حجاز و ایران یا ترکی و ہندوستان میں ہوتا تو برطانوی سامراج اپنی تاریخی روایتوں کے مطابق بستیوں کی بستیاں پھونک دیتا لیکن جاپان کے سامنے چوں تک نہیں کی کیوں کہ وہ ایک مقابل کی طاقت ہے اور اسی کا نام ہے جس کی لاٹھی اس کی بھینس؛ بس پھر کیا تھا ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے مجمع کو منتشر ہونے کا حکم دیئے بغیر ارالٹون اور ایون کو لاٹھی چارج کا اشارہ کیا پھر جو بیتی قلم بیان کرنے سے قاصر ہے چاروں طرف سے عوام کو مار پڑنے لگی لوگ جوتے پگڑیاں اور ٹوپیاں چھوڑ کر بھاگ اُٹھے، ذبیح اسٹیج کے نیچے چھپ گیا ایون باؤلے کتّے کی

طرح بھونکتا اور مارتا رہا میں اسٹیج ہی پر کھڑا رہا اس وقت بھاگنا جوانمردی کے خلاف تھا اور نہ کوئی فرار کا راستہ ہی تھا میں نے پولیس کو للکار کر کہا: لوگوں کو نہ ماریئے میں حاضر ہوں، مجھے پکڑیئے اور تکا بوٹی کر ڈالیئے ایون لوگوں کو ڈنڈے اور ٹھڈے مارتا ہوا حافظ جی کے مکان تک چلا گیا چلایا: او سور کا بچہ حافظ کدھر ہے، نکلو، اندر سے عورتوں نے قفل چڑھا لیا جن دوستوں نے ڈٹ کر مار کھائی ان میں مظفر گڑھ کے ایک بزرگ قاضی محمد مسعود انصاری اور دوسرے ملتان کے سید عبدالوہاب شاہ تھے۔ باقی تمام لوگ بھاگ نکلے۔ ٹیل مجمع کو چیرتا پھاڑتا اسٹیج تک پہنچا مجھے بازو سے پکڑ کر نیچے گرا لیا۔ بے تحاشا بید مارے، بے اندازہ ٹھڈے لگائے دو چار دفعہ اٹھا کر پٹخا ایک تھانیدار کو حکم دیا کہ اسے الٹی ہتھکڑی لگا دو پندرہ منٹ تک بیدوں اور تھپڑوں کی مشق کرتا رہا ایک رخسار پر دھول دوسرے پر دھپا جسم پر بید گھٹنوں پر ٹھڈے میں دو دفعہ بے ہوش ہو کر گرا مکان کے اندر سے عورتوں نے سسکیاں بھرنی شروع کیں ایون کا پارہ چڑھ گیا واہی تباہی بکنے لگا۔ غرض چاروں طرف پولیس کا غلغلہ تھا۔ میرا اچکن پھٹ کر تار تار ہو گیا۔ قمیض کے کئی ٹکڑے ہو گئے پھر مجھے سڑک پر دور تک گھسیٹا گیا، سر کی ٹوپی اور پاؤں کا جوتا دونوں غائب ہو گئے، ایک جھتہ دار کنسٹیبل بار بار اپنے وحشیانہ گھونسے جماتا رہا۔ ایک اسسٹنٹ سب انسپکٹر نے جو بظاہر مسلمان ہی تھا اسے ٹوکا اور روکا بھلے مانس انگریزوں کے گھر میں تو آگ لگی ہے تم کیوں مارتے ہو جھتہ دار باز نہ آیا پیٹتا رہا اور کہتا رہا بڑے آئے مولوی صاحب داڑھی نہ مونچھ قرآن سناتے ہو، کہاں لکھا ہے وقت کے حاکم کی نافرمانی کرو اور دے گھونسہ پہ گھونسہ، ایون عورتوں کو گالیاں دے کر پلٹا تو میرے گرد ہو گیا کنسٹیبل اور بھی تیز ہوا اس شریف زادے نے وہ گالیاں بکیں کہ پناہ بخدا ماں بہن بیٹی کی فحش اور فاش گالیاں لوگ اپنے اپنے مکانوں میں بتیاں گل کئے دم بخود بیٹھے تھے اکیلا میں ہی تھا جو اس بہیمت کے ہتھے چڑھا ہوا تھا آخر گھسیٹ گھساٹ کے مجھے حرم دروازے کے تھانے میں لے گئے اسسٹنٹ سب انسپکٹر

نے مجھے سرگوشی کے انداز میں کہا جیب میں کوئی چیز ہو تو مجھے دیدو۔ ایک ذاتی خط اور کچھ روپے میرے پاس تھے۔ میں نے اس نیک سرشت انسان کے حوالے کئے۔ اُس نے حوالات کھلوائی اور ارٹون و ایون کے آنے سے پہلے مقفل کر دیا تھوڑی دیر بعد وہ لوگ بھی آ گئے۔ مجھے دفتر میں طلب کیا میرا جسم اُس وقت زخموں سے چور ہو رہا تھا۔ ٹیل نے کہا —— "مجھے پہچانتے ہو؟"

"جی نہیں"۔

"پہچانو۔ سور کا بچہ"۔

پیچ و تاب کھا کر خاموش ہو رہا حافظہ پر زور دیا تو یاد آگیا کہ ٹیل ہے جس نے شہید گنج کی تحریک میں مجھے ڈھائی سال قید کیا تھا اور وہاں میں نے عدالت میں نعرے لگائے تھے تو سپرنٹنڈنٹ جیل کو بید لگانے کے لئے لکھا تھا میں نے کہا:

"آپ کا نام ٹیل (Tail) ہے"۔

"ٹیل (Tail) انگریزی میں دُم کو کہتے ہیں اُس کا نام Teal تھا"

"بکومت" ایون نے کہا۔

"حرام زادہ جانتا نہیں مسٹر ٹیل (Teal.) ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ہیں" ٹیل کی طرح ارٹون بھی اینگلو انڈین تھا البتہ ایون گورہ تھا اس زناٹے کا طمانچہ مارا کہ میں بلبلا اُٹھا ارٹون نے کہا۔

"اِدھر بڑا نرمی ہے یہ حرام زادہ کسی اور ملک میں ہوتا تو گولی سے اُڑا دیا جاتا"۔

ایک بھاری بھر کم تھانیدار جس کا نام غالباً صالح محمد تھا لیکن چہرہ کسی سؤر سے مشابہ تھا بھنّا کر اُٹھا دو چار ٹکے میری کنپٹی پر جمائے کنسٹیبل سے کہا اس کا پاجامہ اُتار دو اور جوتے لگاؤ میں نے مزاحمت کی، ایون نے میرا دایاں ہاتھ اپنی کرسی تلے دبا دیا میری چیخیں نکل گئیں سب کھکھلا اُٹھے ٹیل نے کہا، معلوم ہوا "سور کا بچہ تقریر کا مزہ" صالح محمد نے میرے منہ میں کپڑا ٹھونسوا دیا چار بدنہاد سپاہیوں

نے مجھے اُلٹا لٹا کر اُزار بند کھلوا دیا۔ صالح محمد میرے سر کو فرش پر پٹختا رہا۔ لیکھ راج چوتڑوں پر جوتے مارتا رہا بیس پچیس منٹ یہ شغل جاری رہا جب اُن کی طبیعت سیر ہو گئی تو خالی حوالات میں بند کر دیا چٹائی نہ کمبل کمرے میں التزاماً پیشاب کا چھڑکاؤ کرایا گیا جس سے دماغ پھٹا جا رہا تھا جسم ضربوں سے نڈھال تھا نیند آ ہی گئی۔ رات دو ڈھائی بجے کا عمل ہوگا کہ پہریدار کنسٹیبل نے جگا دیا مولانا ظفر علی خان کے خادم حافظ محمد یعقوب بڑے ہی دل شکستہ کھڑے تھے۔ کہنے لگے :

"ہم نے سارا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور سخت دُکھ ہوا ہے فرش پر ننگے پڑے ہو میری چادر لے لو"——

چوری کی ملاقات میں یہ ممکن نہ تھا۔ میں نے شکریہ ادا کیا۔

کنسٹیبل ہندو تھا اس کا حوصلہ تھا کہ اُس نے حافظ جی کو ملاقات کا موقع دیا حافظ جی نے کہا: کسی کے نام کوئی پیغام دینا ہو تو میں صبح لاہور جا رہا ہوں۔

"کوئی پیغام نہیں مولانا سے سلام کہیئے گا اور گھر میں اباجی کو خیر خیریت پہنچا دیجئے" کنسٹیبل بولا خیریت کیسی؟ گھر میں کہلا بھیجو کہ پولیس افسروں پر مقدمہ کریں انہیں مارنے کا کوئی حق نہ تھا"

میں چپ ہو رہا آنکھیں بھیگ گئیں۔ کنسٹیبل نے کئی سوال کر ڈالے مثلاً والدین زندہ ہیں؟ کاروبار کیا ہے؟ لواحقین مضبوط ہیں؟ وغیرہ۔

ملتان کا ضمیر

ملتان کا ضمیر ہی سرکاری رہا ہے کاسہ لیسی کے اس پشتینی مرکز سے کیا توقع ہو سکتی تھی؟ اپنی بے بسی کا مجھے پورا پورا احساس تھا مسلمانوں میں جان نہ تھی وہ من حیث الجماعت بزدل تھے احرار مقامی طور پر کمزور تھے۔ کانگریس کے دولت مند راہنما ضلعی افسروں کی مٹھی میں تھے چنانچہ

مشہور مقامی ایڈووکیٹ منشی ہری لال جو ضلع کانگریس کمیٹی کے صدر بھی تھے اور ایسوسی ایٹڈ پریس کی مقامی شاخ کے انچارج بھی اس واقعہ کو گول کر گئے انہوں نے ڈپٹی کمشنر مسٹر ہینڈرسن کے اشارے پر خبر تک روک لی رہا مسلمان پریس تو وہ سرکار کا تابع تھا ——— "ٹریبون" لاہور بھی خبر کو ڈکار گیا مقامی نامہ نگار پولیس کی جیبی گھڑی نکلے نتیجۃً پولیس نے اگلے روز اُن تمام دوستوں کو پکڑ لیا جنہوں نے اِسکے خیال میں مجھے بلایا اور ٹھہرایا تھا حافظ یار محمد۔ قاضی محمد مسعود انصاری۔ سید عبدالوہاب شاہ۔ سید ولایت شاہ شیخ اقبال احمد یہ سب مجھے بلانے اور ٹھہرانے کے الزام میں پکڑے گئے۔ اقبال پر جلسہ کے منتظم ہونے کا الزام لگا اور یہ سب لال دین عاصی کی "برکات حسنہ" کا نتیجہ تھا جو لکھراج سب انسپکٹر کو مطلع کر آیا تھا۔ میری گرفتاری کے بعد ضلع بھر میں تشدد شروع ہو گیا۔ سوشلسٹ، احرار، کانگرس کے جتنے بھی سیاسی کارکن ہو سکتے تھے گرفتار ہونے لگے بوریوالہ کے مولانا شیخ احمد، میاں چنوں کے مولوی ہدایت اللہ۔ جہانیاں کے کامریڈ عطاء اللہ گرفتار ہو کر آئے ملک عبدالغفور انوری احرار اور کانگرس دونوں کے جنرل سیکرٹری تھے انہیں بھی کسی تقریر میں ماخوذ کر لیا گیا۔ لائلپور سے کامریڈ کلبیر سنگھ کو گرفتار کر کے لایا گیا۔ آپ شہید وطن بھگت سنگھ کے چھوٹے بھائی تھے۔ ٹیکا رام سخن کو لاہور سے لایا گیا، رنجیت سنگھ مستانہ پہلے آچکے تھے حکیم منا سنگھ گوجرہ سے پکڑے گئے۔ غرض جنگل میں منگل" ہو گیا۔ منا سنگھ بڑا ہی بہادر ساتھی تھا میں اُس سے بالکل ناواقف تھا۔ اُس نے پولیس کے مظالم سنے تو اسٹیشن سے لے کر ضلع کچہری اور ضلع کچہری سے لے کر جیل خانے کے دروازے تک شورش کاشمیری زندہ باد پکارتا رہا۔ پنجابی کا زبردست شاعر اور خوش آواز تھا۔ انقلابی نظمیں پڑھتا اور شورش زندہ باد کہتا ہوا جیل پہنچا بڑا قدآور اور انتہائی خوش فطرت انسان تھا۔ بھگت سنگھ کی ماں کا نوحہ کے عنوان سے اُس نے ایک طویل پنجابی نظم لکھی تھی، اپنی دردبھری آواز میں پڑھتا تو دل دہل جاتے اُس کی اہلیہ کا انتقال ہو چکا تھا اُسے یاد کر کے عموماً پریشان ہو جاتا دو سال کی سزا ہوئی پھر کسی جیل میں

حکام کی سختیوں کے خلاف بھوک ہڑتال کی، وہاں کسی مرض کا شکار ہو کر چتا کا شعلہ ہو گیا ——

اسمٰعیل ذبیح جلسہ کی ویرانی کے وقت اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ ملتان سے بھاگے تو کار میں بیٹھ کر منٹگمری چلے گئے۔ وہاں سے لاہور، لاہور سے دہلی۔ دلی سے پھر لاہور۔ آخر اپنوں ہی کی مخبری سے پکڑے گئے اور دو سال کی سزا ہو گئی۔

اس قسم کی تحریکوں میں کم ہی لوگ حوصلہ کا ثبوت دیتے ہیں، میزبان نے گلا کیا کہ ہم لوگ ملتان پہنچ کر اس کی مصیبت کا باعث بنے ہیں، انہوں نے ملک عزت بخش کو اپنا وکیل کیا مقامی کارکنوں کی طرف سے منشی ہری لال پیش ہوئے، مقدمہ شروع ہوا تو عدالت نے تمام ملزموں کی طرف سے منشی ہری لال کا نام ایڈووکیٹ کے طور پر لکھا، منشی جی نے فوراً ہی تصحیح کرادی کہ میں شورش کی طرف سے وکیل نہیں۔ یہی بات دوسرے وکلاء نے کہی جو مفت یا فیس پر آتے تھے میں نے دوستوں کے حلقہ سے نکل کر عدالت سے کہا "مجھے اس مقدمہ میں اپنے بیان کے سوا اور کچھ نہیں کہنا۔ میرا کوئی وکیل نہیں نہ میں نے کسی وکیل کو بلایا ہے۔ نہ میں ان کی اعانت چاہتا ہوں۔ یہ لوگ فیس لیکر آئے اور اپنی مرضی کے مختار ہیں میں نے بلاشبہ لوگوں کو حصولِ آزادی کی دعوت دی ہے۔ غلامی کی زنجیریں توڑنا اور آزادی چاہنا ہمارا قومی فرض ہے مقدمہ کی کارروائی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں اور نہ اس میں کوئی حصہ لوں گا میں پولیس کے تشدد سے مضمحل ہوں، کھڑا نہیں ہو سکتا بیٹھنا چاہتا ہوں یہ کہہ کر خود ہی کرسی پر بیٹھ گیا اور بے نیازی سے کتاب پڑھنے لگا۔

منشی ہری لال اپنا سا منہ لے کر رہ گئے دوسرے وکیلوں کو بھی شرم سی آگئی عدالت نے میرا مقدمہ ہی الگ کر دیا۔ مجھے منٹگمری کے وارنٹوں کی بنا پر گرفتار کیا گیا تھا لیکن جب مجھے بُری طرح زخمی پایا اور پولیس کو خوف محسوس ہوا مبادا باہر جانے سے کوئی احتجاج پیدا ہو تو آپسمیں صلاح مشورہ کر کے ملتان میں بھی ۳۸ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت مقدمہ چلانے کا فیصلہ کر لیا۔

ناخدا جن کا نہ ہو اُن کا خدا ہوتا ہے ـــــــ اللہ کی قدرت دیکھئے کہ دوسرے یا تیسرے روز ٹیل (اے ڈی ایم)، اراٹون (ڈی۔ ایس پی) اور ایون (انسپکٹر پولیس) فوج میں واپس بلا لئے گئے یہ تینوں جنگ عظیم میں فوج کے ملازم رہے تھے۔ ٹیل کا جانشین سنت رام مینی تھا کچھ دنوں بعد اُس نے بتایا کہ جس جہاز سے وہ جا رہے تھے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا اور وہ تینوں ہلاک ہو گئے ہیں۔ مینی کے اپنے الفاظ میں یہ خدا کی بے آواز لاٹھی کا انتقام تھا۔" سنت رام تھا تو اے ڈی ایم۔ اور کچھ تُرش رو بھی، لیکن اس کے اندر ایک انسان ضرور تھا۔ وہ میری مدد کرنا چاہتا تھا لیکن مجبور تھا ڈپٹی کمشنر ہنڈرسن بڑا باؤلا تھا مینی اس سے ڈرتا تھا مقدمہ چلا تو استغاثہ کے سبھی گواہ بحمد اللہ مسلمان تھے ہر ایک نے ڈٹ کر جھوٹ بولا سچ بھی بولا لیکن تکلفاً اِن میں اٹھارہ انیس سال کا ایک خوش شکل نوجوان بھی تھا مَیں نے اُس کے شاعرانہ چہرے مہرے پر طنز کیا تو بھنا اُٹھا، اُس نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ پولیس نے کوئی تشدد نہیں کیا، یہ ایک ایسا جھوٹ تھا جو اُس دن کا سب سے بڑا جھوٹ تھا، خود اے ڈی ایم کے چہرے پر خندہ استہزاء آ گیا مَیں نے کرُسی سے اُٹھ کر دو چار لطیف سے سوال کئے" ـــــــ وہ شرما گیا۔ عدالت نے بھی اِس کا لطف لیا۔

ہر پیشی پر عدالت کو لکھنا پڑتا کہ ملزم کرسی پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا اور مقدمہ میں کوئی حصہ نہیں لے رہا ہے، مَیں جان بوجھ کر اس قسم کا رویّہ اختیار کرتا جس سے عدالت کو یہ احساس ہو کہ مجھے مقدمہ سے کوئی دلچسپی نہیں اور جو کچھ ہو رہا ہے مجھے اسکی ذرہ بھر پرواہ نہیں ہے: ایک مرحلہ میں گواہوں کے جھُوٹ سے چڑ کر خود عدالت نے منشی ہری لال سے کہا کر اس پر جرح کرو۔ منشی ہری لال کنی کترا گئے۔

لائل پور میں

یہ مقدمہ چل ہی رہا تھا کہ لائل پور سے بھی ۳۸ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے وارنٹ آ گئے

چنانچہ اگلے روز مجھے لائلپور بھیج دیا گیا وہاں پہنچا تو بہت سے احرار رضا کار گرفتار ہو چکے تھے شاہ جی کے معتمد حکیم غوث محمد جام پوری بھی تاندلیانوالہ کی کسی تقریر میں پکڑے ہوتے موجود تھے ایک خوش رو سکھ نوجوان (نام یاد نہیں آرہا) مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا میں نے بغیر کارروائی اعتراف جرم کر لیا۔ مجسٹریٹ نے کہا: اس وقت مقدمہ کی فائل میرے سامنے نہیں، نہ استغاثہ کے گواہ آئے ہیں، کل سماعت ہوگی مجھے مقامی جیل بھیج دیا گیا مشہور انقلابی نوجوان سحر گل یہیں نظر بند تھے وہ خیالات کے اعتبار سے سوشلسٹ تھے اگلے روز مقدمات شروع ہو گئے سب سے پہلے حکیم غوث محمد کو بلایا گیا انہوں نے عدالت سے کہا کہ میں نے برطانوی فوج میں بھرتی ہونے کو واقعی حرام اور خلاف اسلام قرار دیا ہے میں اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہوں۔ جب تک میرا ملک آزاد نہیں ہوگا میں انگریزوں کی جنگ کو اپنی جنگ نہیں کہہ سکتا اور نہ یہ میری جنگ ہی ہے عدالت نے حکیم صاحب کو دو سال قید با مشقت کا حکم دیا رضا کاروں میں سے دو نے معافی مانگ لی، کہنے لگے ہم نے حکومت کے خلاف کچھ نہیں کہا، ہم نے صرف یہ کہا تھا لینی اے نہ لین دینی اے" (نہ لینی ہے نہ لینے دینی ہے) عدالت میں زبردست قہقہہ پڑا۔ کورٹ انسپکٹر نے کہا ان کی مراد اس سے فوجی بھرتی تھی۔ مجسٹریٹ نے مجھے کہا انہیں سمجھاؤ۔ معافی نہ مانگیں تحریک شروع ہوئی ہے۔ ابتدا خراب ہو گئی تو جماعت کی عزت اور تحریک کی ہمت کو نقصان پہنچے گا میں ایسا فیصلہ لکھے دیتا ہوں جو اپیل پر ان کی رہائی کا باعث ہوگا" میں نے بہتیرا سمجھایا۔ تاندلیانوالہ کے جانگلو تھے نہ مانے سیاسی شعور تھا نہیں شاہ جی کے عشق میں نعرے لگا کر گرفتار ہو گئے تھے مجسٹریٹ نے فیصلہ میں لکھا کہ معافی مانگنے سے جرم ہلکا نہیں ہوتا اس قسم کے لوگ پہلے قانون شکنی کر کے فضا کو مکدر کرتے پھر معافی مانگنے لگتے ہیں میں اس معافی نامہ کو قبول نہیں کرتا تین سال قید با مشقت دو سو روپے جرمانہ اور عدم ادائیگی جرمانہ مزید چھ ماہ قید! —— میرا مقدمہ سنا میں نے جرم کو تسلیم کیا۔ مجسٹریٹ نے مختصر سا فیصلہ لکھا کہ ملزم نے اقرار جرم کیا ہے۔ اس کے نزدیک تقریر کا پیش کردہ

متن رپورٹر کی معمولی غلطیوں سے قطع نظر معانی ومطالب کے لحاظ سے درست ہے۔ اُس نے اپنے اس فعل کو حب الوطنی سے تعبیر کیا ہے وہ کہتا ہے کہ میں غلامی کی زنجیریں توڑنا اپنا فرض سمجھتا ہوں مادرِ وطن کا مجھ پر حق ہے کہ میں اس کی فریادسنوں اور انگریزی حکومت کی موجودہ مشکلات سے فائدہ اٹھاؤں ملزم کو دوسال قید بامشقت کا حکم دیا جاتا ہے ——— !

"اپیل ضرور کرنا آپ بری ہو سکتے ہیں"۔

یہ اُس کے رخصتی الفاظ تھے۔ لائل پور میں ان دنوں کوئی ہندو یا سکھ سیشن جج تھا اس کا عام رجحان یہ تھا کہ جو اپیل کرتا اُسے چھوڑ دیتا دوستوں نے اصرار کیا مختارنامہ لے کر آگئے لیکن میں نے اپیل کو جماعتی فیصلہ کے خلاف سمجھا اپنے مؤقف پر ڈٹا رہا ان حالات میں جب کہ ہم خود سول نافرمانی کر رہے تھے اپیل کرنا اصولاً ٹھیک نہ تھا۔ چنانچہ باقاعدہ قیدی ہو کر میں ملتان واپس ہو گیا۔

لاہور میں

وہاں پہنچا تو لاہور کا بلاوا موجود تھا لاہور میں ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کو جلسہ عام میں پیٹنے کا مقدمہ چل رہا تھا یہ مقدمہ درست تھا لیکن مجھے خواہ مخواہ پھنسالیا تھا یہ بھی پولیس کا ایک کارنامہ تھا واقعہ یہ تھا کہ امرتسر کے ضمنی انتخاب میں یونی نسٹ امیدوار شیخ صادق حسن کے مقابلہ میں چودھری افضل حق کھڑے تھے۔ سردار سکندر حیات کی شہ پر ڈاکٹر گوپی چند بھارگو نے جو ہندو مہاسبھائی ذہنیت کے کانگرسی تھے ڈاکٹر کچلو کو کھڑا کر دیا۔ اس طرح حریت پسندوں کے ووٹ تقسیم ہوتے تھے نتیجتہً یونی نسٹ امیدوار کی کامیابی کے امکانات روشن ہو گئے احرار رضا کاروں کو اپنے طور پر غصہ آیا انہوں نے موری دروازہ کے باہر کانگرس کا جلسہ عام اُلٹ ڈالا ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کو پیٹا سکندر حیات نے پولیس کو حکم دیکر مقدمہ درج کروا دیا پولیس نے میرا نام بلاوجہ ملوث کر لیا مقصود یہ تھا کہ مجھے کسی مرحلہ میں صوبائی اپوزیشن کی حمایت حاصل

نہ ہو اور جو مار پٹائی ملتان میں ہوئی ہے اس کا نوٹس نہ لیا جائے یہ چیز بھی میری قید و بند کو سنگین بنانے کا باعث ہوئی اصل واقعہ یہ تھا کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کو رضاکاروں کے چنگل سے چھڑایا تھا میں نہ ہوتا تو وہ مارے جاتے یا شاید زخمی ہوتے انہوں نے اس کا اعتراف خود مولانا حبیب الرحمٰن سے کیا عدالت میں کبھی نہ آئے لکھ بھیجا کہ اس مقدمہ سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں ہے پولیس نے یہ مقدمہ خود درج کیا ہے شورش کاشمیری کا میری پٹائی سے کوئی واسطہ نہیں تاہم وزارت نے جو شوشہ چھوڑا تھا کامیاب رہا تمام احرار کانگرس کے چھوٹے بڑے راہنماؤں کی اخلاقی اعانت سے محروم ہو گئے صوبہ کے کانگرسی لیڈر احرار کو کھلم کھلا فرقہ پرست کہتے اُن کا نظریہ تھا کہ مجلس احرار ہی مسلمانوں کی ایک تنظیم ہے جو برطانوی حکومت اور ہندو نیشنلزم دونوں سے دست و گریبان رہتی ہے۔ یونی نسٹ وزارت کو احرار پر ظلم کرنے کا کھلا موقع ہاتھ آگیا دو چار لیڈروں کو چھوڑ کر تمام احراری سی کلاس اور قید تنہائی میں رکھے گئے اور اخلاقی قیدیوں سے بھی بدتر سلوک کیا گیا۔

لاہور کے سفر سے مجھے یہ فائدہ ضرور پہنچا کہ عزیزوں سے ملاقات ہو گئی۔ عبداللہ ملک منہ اندھیرے پلیٹ فارم پر موجود تھا ہم دونوں ایک دوسرے کے فدائی اور جگری دوست تھے سید عطاء اللہ شاہ ہاشمی کے والد سید عنایت شاہ اخلاص کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ میں نے پولیس کو راضی کیا اور انکے مکان محلہ دار اشکوہ میں جا پہنچا ابھی سو رہے تھے انہیں جگوایا حیران رہ گئے تواضع کی وہاں سے ہمشیرہ کے ہاں گیا عزیزوں سے ملا پیسہ اخبار کے تھانے میں کچہری کے وقت تک قیام کیا کچہری میں دوستوں کا جمگھٹا رہا۔ عبداللہ ملک نے دوستوں کو خبر کر دی دن بھر چہل پہل رہی شام کی گاڑی سے واپس ملتان چلا گیا۔

ملتان واپسی

ملتان ڈسٹرکٹ جیل کے سپرنٹنڈنٹ شیخ محمد سعید تھے، لالہ دوارکا داس جیلر —— اور

لالہ پنڈی داس (دھون) اسینئر اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ۔ ایک چھوٹی سی بارک تھی جہاں زیادہ سے زیادہ چھ آدمی رہ سکتے تھے اور ہم دس ساتھی رہ رہے تھے۔ بارک کا حال بھی اچھا نہ تھا پانی نہ ہوا کبوتر شام ہی سے غٹر غوں کرتے سوتے وقت ان کی بیٹھیں ہمارے چہروں پر پڑتیں جیلر سے بارک بدلنے کے لئے کہا وہ شرابی کبابی آدمی تھا رات گئے راؤنڈ پر آیا تو ہمارے بعض ساتھیوں سے بھڑ گیا۔ صبح ہوتے ہی ہم نے بڑی بارک کا مطالبہ کیا۔ عطاء اللہ جہانیاں کو ترجمان بناکر بھیجا جیلر نے ذرا تیزی دکھائی جہانیاں نے لڑنا مناسب نہ سمجھا چلا آیا ساتھیوں نے سُنا تو بھڑک اُٹھے ایکا ایکی جیل والوں سے ٹھن گئی آخر ہم جیت گئے ڈیوڑھی سے قریب ہمیں ایک کھُلی بارک مل گئی سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کی دو پارٹیاں تھیں کلبیر سنگھ سوشلسٹ تھے ٹیکارام سخن کمیونسٹ دونوں سے تعلق خاطر تھا لیکن کلبیر سنگھ سے واسطہ گہرا ہوتا گیا ہم نے ایک سٹڈی سرکل قائم کیا جس میں ٹیکارام سخن نے لیکچروں کا سلسلہ شروع کیا کئی روز اس سوال پر بحث ہوتی رہی کہ آزادی سے متعین مراد کیا ہے ؛

رفتہ رفتہ کچھ دوست رہا ہونے لگے حافظ جی سید عبدالوہاب شاہ سید ولایت شاہ اور شیخ اقبال احمد مقدمہ کا ناکافی مواد ہونے کے باعث رہا ہو گئے۔ عبدالغفور انوری سال بھر کی سزا پا گئے۔ ٹیکارام سخن، رنجیت سنگھ مستانہ، قاضی مسعود احمد انصاری، مولوی شیخ احمد اور مولوی ہدایت اللہ اپیل کرکے نکل گئے۔ ٹیکارام سخن اور رنجیت سنگھ مستانہ کل وقتی سیاسی کارکن تھے عمر کا ایک بڑا حصہ جیل ہی میں گذرا تھا۔ قید ہونا اور رہا ہونا اُن کا روزمرہ تھا۔ ع

خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

انداز بیاں اپنا

اب تک خورشید کا ذکر موقوف رہا گجرات کی سزا یابی کے بعد خورشید کے خطوط متواتر آتے رہے۔ شروع ۱۹۳۹ء میں رہا ہوا تو ملاقات کا راستہ کھل گیا۔ یہی ملاقاتیں رفتہ رفتہ شاعری کا عنوان بن گئیں، جس سے حکایتیں نکلیں، کہانیاں اُٹھیں، داستانیں بنیں، حتٰی کہ سیاسی شورش کا مزاج غزل کا مزاج ہو گیا ——

مارچ کے آخری دنوں کا گلابی جاڑا تھا جب ہم شملہ پہاڑی پر ایک دوسرے سے ملے سرخ و سپید رنگ، سرمئی آنکھیں، چہرہ پھول، ہونٹ گلابی، پلکیں گھنی، نکہت و نغمہ کے سانچہ میں ڈھلا ہوا نورانی پیکر، جو عمر خیام کے تخیلی افق سے وارث شاہ کے دیس میں اُتر آیا تھا دونوں طرف دس منٹ سکوت رہا چاہا کچھ کہوں، کچھ نہ کہہ سکا خطیب اپنے الفاظ کھو بیٹھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میری زندگی میں کسی دوشیزہ نے قدم رکھا ناصیہ فرسائی کا حوصلہ، دل بغاوت آشنا کا ولولہ، اور عرض و نیاز کا سلسلہ، سب منقطع ہو چکے تھے خورشید نے خود ہی حجاب توڑا اور ہم دیکھتی آنکھوں اس طرح بے تکلف ہو گئے جیسے برسوں سے اکٹھے ہوں صرف تیس منٹ میں ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کا سفر پورا کیا کیسی کیسی تصویریں اُبھرتی اور نکلتی گئیں عہد و پیمان کا ایک دفتر تیار ہو تا رہا غرض اس پہلی ملاقات کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ شملہ پہاڑی، نور جہان کا مزار، جہانگیر کا مقبرہ، شالیمار باغ، لارنس گارڈن یہ سب ہماری ملاقاتوں کے راز دار اور پردہ دار ہوتے گئے۔ خورشید کے اجداد کشمیری نسل کے وائیں تھے۔ دادا گجرات میں آباد ہوتے۔ والد لاہور میں ٹک گئے یہیں دو مکان بنائے جو کرایہ پر دے رکھے تھے پچاس سال کی عمر میں انتقال کیا اولاد صرف دو لڑکیاں تھیں، خورشید اور ثریا خورشید نے ادیب عالم کے علاوہ سیکنڈ ڈویژن میں میٹرک کیا اور اب منشی فاضل کی تیاری کر رہی تھی کچھ دنوں بعد اُس نے والدہ کو راضی کر لیا اور میں

اُن کے ہاں بے تکلفی سے آنے جانے لگا۔ اُس کی والدہ مجھے بیٹا کہتی بہن بھیا اور وہ آغاجی ہم اتنی جلدی گھل مِل گئے کہ زندگی بسر کرنے میں صرف شرعی فاصلہ رہ گیا اسکی والدہ کا خیال تھا کہ وہ اس فرض سے سبکدوش ہو جائے خورشید بھی یہی چاہتی تھی لیکن زبان سے کیونکر کہتی؟ دل کہہ رہا تھا۔ اس میں ایک دوشیزہ کی حیاء کا شدید احساس تھا اُس نے گاہے ماہے بعض بے نظیر خطوط لکھے جو میرے پاس آج بھی محفوظ ہیں وہ نہ ادیب تھی اور نہ اُسکو انشاپردازی کا ملکہ تھا تاہم ایک انشاپرداز اور ادیب کے آثار کا عکس اس میں ضرور تھا ذوقِ شعر بھی تھا اختر شیرانی اور غالب قریب قریب اسے حفظ تھے۔ ان دو کے علاوہ قدیم و جدید اساتذہ میں شاید ہی کوئی شاعر ہو جس کے تیرونشتر اس کے حافظہ میں نہ ہوں کسی عورت میں شعر و شاعری کے اعتبار سے اتنا بلند ذوق اور اتنا مضبوط حافظہ میں نے نہیں پایا، فی الجملہ اس کا وجود ادبی دلآویزیوں کا مجموعہ تھا اپنے خطوط میں شعر کو اس حسن و خوبی سے کھپاتی، جیسے کسی انگوٹھی میں نگینے جڑ دیئے ہوں عام عورتوں کی طرح اس کی بھی خواہش تھی کہ میں سیاسی جھنجھٹ سے نکل جاؤں یا کم از کم اس وقت تک حصہ نہ لوں جب تک ہماری زندگی باقاعدہ نہیں ہو جاتی، اُس نے مجھے بہت روکا، بلکہ روز کی ملاقاتوں کے باوجود خطوط کا ایک انبار لگا دیا عورت کی فطری حیا ہر وقت اس کے ساتھ رہتی ہے وہ کھُل کے کبھی کچھ نہ کہتی مگر لکھتی اور لکھتی ہی چلی جاتی۔ اس کے دل میں یہ چاہ بھی تھی کہ سیاسی تحریکوں میں شریک ہو اور اُس نے کہا بھی کہ شادی کے بعد حصّہ لے گی لیکن بہرحال وہ ان مسلمان لڑکیوں ہی کی طرح تھی جنہیں سیاسی تحریکوں میں حصّہ لینے کا مذاق نہ تھا نہ مسلمان عورتیں اس کوچہ سے آشنا تھیں۔ نہ مسلمان عوام اپنی معاشری پابندیوں کے باعث عورتوں کو یہ حق دینے کے لئے تیار تھے۔ حالت یہ تھی کہ مسلمان مرد تک انقلابی تحریکوں سے بچتے تھے وہ بھلا اپنی عورتوں کو کیونکر اجازت دے سکتے تھے جو عورت یہ قیود توڑتی اُس کا افسانہ ساز زبانوں سے بچنا مشکل تھا خورشید کے لئے ازدواجی زندگی کے بعد شریک جہد ہونا مشکل نہ تھا۔ لیکن حالات کو منظور ہی نہ تھا کہ ہم اکٹھے

سفر کریں چنانچہ ابھی یہ مرحلے طے ہی ہو رہے تھے کہ دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو گیا اگر ایک ماہ تک جنگ نہ چھڑتی تو ممکن تھا کہ میں سیاست ہی سے سبکدوش ہو جاتا اور میری راہ کچھ اور ہوتی کیونکہ خورشید سے الگ رہنا میرے لئے ناممکن ہو رہا تھا۔

جنگ چھڑ گئی۔ میں مجلس احرار کا جنرل سیکرٹری ہو گیا گرفتاری لازم تھی خورشید کا چہرہ پہلے روز ہی اُتر گیا۔ اُس نے بہت کچھ کہا سنا۔ منتیں کیں۔ واسطے ڈالے' سینکڑوں جتن کئے مگر بے سود' تیر کمان سے نکل چکا تھا اور میں منتخب شدہ راستہ پر تھا پھر میرے ساتھ جو سلوک ملتان میں ہوا اُس نے خورشید کو ہلکان کر دیا وہ کملا اور مرجھا گئی اُس کے خطوں کا ایک تانتا بندھ گیا جب مجھے پانچ سال قید کا حکم ہوا اور منٹگمری سنٹرل جیل بھیجدیا گیا تو اُس کا دل بیٹھ گیا اس سے پہلے میں اسے دوسرے تیسرے روز چوری چھپے ایک آدھ خط لکھ دیتا اور اُس کے دو تین خط مجھے ہر روز مل جاتے تھے مگر اب یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا میرے ذرائع بند ہو گئے اس کے خطوط جیل کے حکام "ڈکار" جاتے ملاقاتوں کا یہ سلسلہ حکام کی ایذار سانیوں سے ٹوٹ گیا اِن صدمات کی تاب نہ لا کر وہ ایک آہ نارسا ہو گئی اور یہی غم اُسے کھا گیا وہ اندر ہی اندر گھلنے لگی موم بتی کی طرح پگھلتی رہی چراغ کی طرح جلتی رہی جیتے جی ایک چتا ہو گئی' میری قید کی طرح اس کی بیماری نے طول کھینچا میں اس صورتحال سے کاملاً بے خبر تھا یہ معلوم تھا کہ وہ بیمار ہے اور اس کا قلق تھا کہ اس کے خطوط ہر روز ہضم کئے جاتے ہیں مگر قید نام ہی اس بے بسی کا ہے اور میں اس معاملہ میں قطعاً بے بس تھا۔

میں نے کوئی جرم نہیں کیا

اواخر دسمبر میں ملتان کا مقدمہ بھی ختم ہو گیا۔ سرکاری گواہوں نے طوطے کی طرح رٹی ہوئی کہانیاں بیان کیں۔ کچھ سچ بولا زیادہ جھوٹ۔ عدالت نے فرد جرم لگا دی۔ مجسٹریٹ نے پوچھا آپ نے یہ جُرم

کیا ہے؛ میں نے کہا"میں نے کوئی جرم نہیں کیا کیونکہ جرم کا لفظ بجائے خود قبیح ہے۔ میں نے اپنے ملک کی عزت و آبرو کے تحفظ کا مطالبہ کیا اور لوگوں سے یہ کہا ہے کہ وہ ملک کی آزادی کے لئے کمربستہ ہو جائیں کیونکہ یہ جنگ فیصلہ کن جنگ ہے امپیریلزم اس کے بعد عالم نزع میں ہوگا کمزور قومیں اس وقت بھی خواب غفلت میں پڑی رہیں تو مدۃ العمر اُن کی آزادی کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوگا جب تک ہندوستان کی آزادی تسلیم نہیں کی جاتی فوج میں بھرتی ہونا قطعی حرام ہے یہ کہنا اگر جرم ہے تو میں واقعی مجرم ہوں ورنہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔"

"آپ کوئی صفائی دینا چاہتے ہیں؟ عدالت نے پوچھا

"صفائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ جو کچھ پیش آیا اور جو کچھ ہو تا رہا پھر جو کچھ گواہوں نے کہا اور جو کچھ سرکار کر رہی ہے اِس بارے میں ایک بیان دینا چاہتا ہوں ——"

اگلے روز بیان شروع ہوا۔ کمرۂ عدالت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ملتان کے دوست اور لاہور کے بعض احباب بھی کمرہ عدالت میں موجود تھے۔ میں نے عدالت سے کہا:

"میرا ارادہ تھا کہ ایک تحریری بیان داخل کروں۔ میں نے کچھ حصہ قلمبند بھی کیا ہے۔ آپ اسے مثل میں شامل کرلیں۔ مطالعہ فرمائیں اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اس پر غور کریں کہ ایک غیر ملکی غلامی نے ہمیں کہاں تک شرف انسانی سے محروم کر رکھا ہے؛ اس عہد استبداد کا یہ پہلو کس قدر خوفناک ہے کہ ہماری غلامی کی زنجیریں ڈھالنے کے لئے ہمارے ہی بھائی بندوں کو مقرر کیا گیا ہے یہ شرمناک تماشا صرف ہندوستان ہی کی سرزمین میں کھیلا جا رہا ہے کہ جو لوگ اپنے ملک کی آزادی چاہتے ہیں ان کا گلا کاٹنے کے لئے اسی ملک کے باشندوں کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ پولیس کے سپاہی، استغاثہ کے گواہ، پراسیکیوٹنگ انسپکٹر، غور کیجئے یہ کون ہیں؟ ہمارے ہی بھائی بند! آپ انصاف کی کرسی پر، میں ملزموں کے کٹہرے میں؛ کیا ہم ایک ہی مادر وطن کے فرزند نہیں؟" عدالت نے ٹوکا کہ اپنے بیان کو مقدمہ کی

شہادتوں تک محدود رکھیے تقریر نہ کیجیے میں نے کہا آپ کے سامنے ہے کہ میں نے مقدمہ کی کارروائی میں کوئی حصہ نہیں لیا وجوہ بھی آپ کو معلوم ہیں میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ عدالت کا ضمیر تسلیم کرتا ہوگا کہ استغاثہ کے گواہوں نے جھوٹ بولا ہے پولیس نے دھاندلی کی ہے اور یہ ڈرامہ جو یہاں رچایا گیا اس کی بنیاد میں ظلم کے سوا کچھ نہیں میں نے کسی گواہ پر جرح نہیں کی میں جانتا ہوں کہ اُن کے ایمان سلب ہو چکے ہیں ان کی حمیت دفن ہو گئی ہے ان کی غیرتوں کو قضا چاٹ گئی ہے اُن کے ضمائر ساقط ہیں یہ لوگ جھوٹ بولتے رہے میں مسکراتا رہا میرے نزدیک یہ سب پولیس کے طوطے ہیں میں انہیں معاف کرتا اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ بھی انہیں معاف کر دیں مجھے اُن مسلمان گواہوں کے چہروں کی شرمندگی پر حیا آتی رہی ہے جو اپنے رب کی قسم کھا کر گواہوں کے کٹہرے میں جھوٹ بولنے کے لئے کھڑے کئے گئے اور وہ کھڑے ہو گئے۔ جب میں یہ سوچتا ہوں کہ انہوں نے اپنے ایک مسلمان بھائی کے خلاف انگریزی استبداد کی حمایت میں جھوٹ بولا تو میرا سر ندامت سے جھک جاتا ہے میں سوچتا ہوں کہ حشر کے دن وہ اللہ کے روبرو کیا جواب دیں گے؟ کس منہ سے یہ کہہ سکیں گے کہ وہ ان سرورِ کائناتؐ کی شفاعت کے طلب گار ہیں جو تمام غلامیوں سے نجات دلانے کے لئے مبعوث ہوتے تھے۔

"میں ذاتی طور پر اس عدالت کا شکر گزار ہوں کہ اُس نے اثنائے مقدمہ میں اپنے شریفانہ اخلاق کو قائم رکھا اور ایسی کوئی بات نہ ہونے دی جس سے جانبین کو گلے شکوے کا موقع ملتا۔ البتہ مجھے یہ کہنے کی اجازت ہونی چاہیئے کہ آپ سے کہوں کہ اِس کرسی کو ملک کی غلامی کے خلاف بطور احتجاج چھوڑ دیں، برطانوی استعمار سے تعاون و اشتراک گناہ ہے اور اس کے خلاف بغاوت و انقلاب ایک قومی فریضہ"!!

عدالت نے پھر ٹوکا۔

"مجھے احساس ہے کہ عدالت ٹوکنے پر مجبور ہے۔ وہ اسی غرض سے اِس کرسی پر بیٹھی ہے۔

مَیں اس سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے یہ سب کچھ کہہ لینے دے اور جو کچھ مَیں کہہ رہا ہوں وہ ریکارڈ ہو جائے۔ ممکن ہے مقدمہ کا یہ فائل آئندہ کسی تاریخ کا حصّہ ہو استغاثہ نے جو کچھ کہا ہے اگر ریکارڈ پر وہی رہا تو اس سے تاریخ اُدھوری رہے گی۔ مَیں اپنے "جرم" سے منحرف نہیں ہو رہا۔ مَیں نے اپنے "جرم" کا اعتراف کیا ہے۔ میرے اس بیان کا مقصد یہ ہے کہ پولیس نے جو جھوٹ بولا ہے اس کی تردید کروں اُس نے میرا جرم پیش کر دیا لیکن اپنا جرم پیش نہیں کیا اس سے مُکر گئی اگر وہ شیوۂ مردانگی رکھتی ہے تو اسے عدالت میں تسلیم کرنا چاہیئے تھا کہ اُس نے جلسہ عام میں ظالمانہ تشدّد روا رکھا اور حوالات میں بہیمانہ سلوک کیا تعجب ہے کہ اُس نے ایک شریف زادی کا روپ دھار لیا ہے"۔ اِس فقرہ پر پراسیکیوٹنگ انسپکٹر بھڑک اُٹھا "جناب یہ توہین آمیز الفاظ ہیں ملزم کو یہ کہنے کی اجازت نہ ہونی چاہیئے"۔ عدالت نے پھر ٹوکا۔ مَیں نے پھر عرض کیا۔

"جناب پولیس کو اپنے معصوم عن الخطا ہونے کا کیوں کر یقین ہو گیا ہے۔ میرے دوست پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کو اتنا سریع الحس نہیں ہونا چاہیئے۔ کیا وہ ختم ہو جانے والے اقتدار کے زعم میں ایک ایسے انسان کو فریاد کرنے کا حق بھی دینا نہیں چاہتے جو پولیس کے قہر و غضب کا شکار ہوا ہے جس کو عصمت مریم کی دعویدار پولیس نے اس سنگدلی کا نشانہ بنایا کہ موت و حیات کے درمیان برائے نام فاصلہ رہ گیا تھا جناب! جو کچھ پولیس نے بھرے جلسہ میں کیا اور اس کے بعد جو سلوک تھانہ میں روا رکھا اس کی روحانی اور جسمانی ضربیں اتنی مہلک ہیں کہ مَیں اپنے دل میں پولیس کے لئے کوئی عزت و احترام نہیں رکھتا مَیں یہی کہوں گا خواہ مجھے اس کے لئے اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے جان کوئی چیز نہیں عزت بڑی چیز ہے مجھے افسوس ہے کہ پولیس نے انسان کی عزت کے مسئلہ پر کبھی غور نہیں کیا ہے؟

عدالت کے ریکارڈ پر نہ سہی لیکن آپ نے سنا ہو گا کہ پولیس نے میرے ساتھ کیا کیا جلسہ گاہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا لٹھ بند پولیس نے ہر طرف سے ناکہ بندی کر لی اراتون، ایون اور ٹیل نے

انتباہ کئے بغیر نہتے عوام پر اس طرح حملہ کر دیا جس طرح دشمن غیر ملکیوں پر چڑھ دوڑتا ہے عوام کو بُری طرح بے عزت کیا گیا ہزاروں آدمی اپنے جوتے اور پگڑیاں چھوڑ کر بھاگ نکلے مجھے اسٹیج سے کھینچ کر زمین پر گرا لیا اتنا پیٹا کہ پناہ بخدا ڈنڈے، مُکے، ٹھڈے، گھونسے، طمانچے، گالیاں، بعض کنسٹیبل مجھ پر اس طرح ٹوٹ پڑے جیسے چیل جھپٹا مار رہی ہو، ایون ہلکایا ہو گیا۔ لوگوں کو پیٹ کر پلٹا تو مجھے پیٹنے لگتا چھڑی اور ہاتھ کے کرتب دکھاتا رہا ایک رخسار پر چھڑی مارتا دوسرے پر طمانچہ۔ حرم دروازے کے تھانہ میں اس کا یہ ظلم انتہا کو پہنچ گیا۔ اراٹون، ٹیل، اور ایون، اِن تینوں نے حوالات سے نکلوایا اور حکم دیا کہ الٹا لٹا دو مشٹنڈے کنسٹیبلوں نے مجھے فرش پر پٹخا ایک نے ازار بند کھول ڈالا دو نے بازو دبائے، لیکھ راج سب انسپکٹر اور صالح محمد (نام صحیح یاد نہیں آرہا) سب انسپکٹر نے چوتڑوں پر جوتے مارنا شروع کئے یہ تماشا کوئی آدھ گھنٹہ تک رہا آخر جب میں حواس کھو بیٹھا تو مجھے اُٹھا کر حوالات کے ایک علیحدہ حصہ میں بند کر دیا گیا جہاں فرش پر پیشاب کا چھڑکاؤ کروایا گیا اور چٹائی نکال لی گئی تھی۔

اِدھر میں یہ بیان دے رہا تھا اُدھر دوستوں کے چہرے اشکبار تھے میں نے جلسہ میں کہا تھا کہ میری بہن کی شادی میں ہفتہ عشرہ باقی ہے میں گھر سے نکلا تو اُسکو صدمہ ہوا۔ اُس نے کہا

"کہاں جا رہے ہو بھیا؟ میں نے کہا "جیل خانے"

مغموم ہو گئی پھر ایک لحظہ توقف کے بعد کہا" تو اب اُس وقت آنا جب انگریز جا چکا ہو ملک آزاد ہو گیا ہو یہ آئے دن کا آنا جانا ٹھیک نہیں"

میرے یہ لفظ ایون کے کان میں پڑ چکے تھے اُس نے اپنے قہر و غضب کو مار پٹائی میں ڈھالتے ہوئے کہا

"حرام زادہ! ہم اِدھر تھانے میں تمہاری بہن کو بلائے گا۔ ننگا کر کے اس کی فرج پر بید لگائے گا۔" میں بیان کر رہا تھا کہ لالہ سنت رام مینی (رائے ڈی ایم) کی آنکھوں میں بھی نمی آگئی لیکن

فوراً ہی سنبھل گیا کورٹ انسپکٹر نے کچھ کہنا چاہا اُس نے روکا کہ یہ تو واقعہ ہے ملزم کے ساتھ یقیناً تشدد ہوا ہے اور جب مَیں بیان دے چکا تو عدالت میں دیر تک سناٹا چھایا رہا۔ بہت سے دوست آبدیدہ تھے۔ آخری الفاظ یہ تھے۔

"جناب مجھے ان زہرہ گداز واقعات کے باوجود کسی کے خلاف کوئی شکایت نہیں۔ ہر شخص اپنا فرض پورا کر رہا ہے کوئی ضمیر کے تقاضے پر کوئی پیٹ کے تقاضے پر ع

سبو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا

"تاہم اس عدالت سے یہ کہنے کی دوبارہ اجازت چاہتا ہوں کہ آیئے ہم سب مل کر ملک کی آزادی کے مطالبہ میں شریک ہو جائیں۔ آپ کا یہ قلم جو میری سزایابی کا فیصلہ لکھے گا انگریزی استعمار کی تقویت کا باعث ہوگا اس کو توڑ دیجئے یہ ہتھکڑی جو مَیں نے پہن رکھی ہے آپ سے قومی جدوجہد میں شریک ہونے کا مطالبہ کرتی ہے اور اگر کورٹ انسپکٹر کانوں سے پردے ہٹادیں تو اسکی آواز اُن کے دل میں بھی اُتر سکتی ہے برطانوی امپیریلزم کی ناؤ میں سوراخ کرنا آج انسانیت عظمیٰ کی سب سے بڑی خدمت ہے تاریخ نے جو کروٹ لی ہے اس سے یقین ہوتا ہے کہ ظالموں کا یوم حساب قریب آ گیا ہے میرا خیال تھا کہ پی ڈی ایس پی یا کورٹ انسپکٹر پولیس کے مجرمانہ فعل پر اظہار افسوس کریں گے عدالت میں نہ سہی پرائیویٹ طور پر، لیکن افسوس ہے کہ وہ پولیس کی چنگیزیت کے مدافع بن گئے ہیں حالانکہ پولیس کا یہ فعل ایک ظالم کے انجام کی آخری شکل ہے اور قانون و انصاف کے چہرے کی کالک ——— مَیں معاف کرتا ہوں۔ ان تمام کانسٹیبلوں کو جنہوں نے کلمہ پڑھ کر مجھے زدوکوب کیا۔ مَیں معاف کرتا ہوں صالح محمد تھانیدار کو جس نے اپنے نام کو رسوا کیا۔ مَیں معاف کرتا ہوں لیکھراج کو جس نے نرک کا ایندھن بننا منظور کیا۔ رہ گئے ایون، ارائون، اور ٹیل، تو اُن کی حادثاتی موت ان لوگوں کے لئے تازیانہ عبرت ہے جو ظلم کے انجام سے بے خبر ہیں جن کی ماؤں نے انہیں برطانوی استعمار کے لئے پیدا کیا ہے جو

انگریزی استبداد کی مشینری کے کل پُرزے ہیں" ——

—— مَیں تثلیث کے ان فرزندوں یعنی ایون، اراٹون اور ٹیل کا معاملہ خدا کے سپرد کرتا ہوں کہ وہ حاکم الحاکمین ہے مَیں اس کٹہرے میں کھڑا ہوں وہ خدا کے کٹہرے میں چلے گئے ہیں۔ آپ میرا فیصلہ لکھیے۔ خدا اپنا فیصلہ لکھوا رہا ہے بلکہ لکھوا چکا ہے وہ تمام ضربیں جن کے نشانات میرے جسم پر موجود ہیں اس حکومت کے تابوت کی میخ ثابت ہوں گے اور جن لوگوں کو اپنی غلامی پر فخر ہے وہ ایک دن عوام کے انقلاب کی زد میں ہوں گے تب انہیں معلوم ہوگا کہ وہ آنے والی صبح کے باغی تھے اور ایک مٹ جانیوالی رات کے پرستار —— یہ سب کچھ میری آنکھیں دیکھ رہی ہیں انقلاب اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ آ رہا ہے جنگ کوئی جیتے ملک آزاد ہو کر رہے گا۔

—— انقلاب زندہ باد"

پانچ سال قید

بیان ختم ہو چکا تو مسٹر مینی نے تین سال قید بامشقت کا حکم سنایا۔ دو سال کی سزا لائلپور سے ہو چکی تھی کل پانچسال —— مجسٹریٹ نے فیصلہ میں لکھا کہ ملزم نے عدالت کے روبرو اپنے باغیانہ خیالات کا اظہار کیا ہے لہٰذا پانچسال قید اس کے جرم کی سنگینی کے پیش نظر کچھ زیادہ نہیں۔ مَیں اِس کے لئے کسی بہتر کلاس کی سفارش نہیں کرتا کیونکہ وہ کسی خاص معاشی اور سماجی حیثیت کا مالک نہیں ہے۔

مَیں نے فیصلہ سُن کر عدالت کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ مَیں اس سے زیادہ سزا کا متوقع تھا مینی نے میرے ایک دوست کو جو اُس کا بھی دوست تھا اپنی کوٹھی پر بلوایا اور کہا کہ شورش کے ساتھ جو کچھ پولیس نے کیا ہے بلاشبہ وہ پولیس کا کمینہ فعل تھا مجھے خود اس کا ملال ہے لیکن مَیں بے بس ہوں سزا ہینڈرسن (ڈپٹی کمشنر) کے ایما پر دی ہے البتہ فیصلہ میں اپیل کی گنجائش رکھ دی ہے شورش کی

اپیل کردو سردار تیجا سنگھ سیشن جج ہیں لازماً چھوڑ دیں گے اُنہیں خود بھی اس واقعہ کا علم اور صدمہ ہے۔

میں نے اپیل کرنے سے انکار کر دیا۔ احباب مختار نامے کر آئے اور لوٹ گئے۔ اس سے اگلے روز سردار تیجا سنگھ ڈسٹرکٹ جیل میں آئے۔ اشارۃً کہا بھی اور کہلوایا بھی میں تیار نہ ہوا۔ کوئی سال ڈیڑھ سال بعد تقریباً سبھی دوست اپیلیں کر کے رہا ہو گئے حتیٰ کہ شیخ صاحب بھی چلے گئے مگر میں کسی مرحلے میں اپیل کے لئے راضی نہ ہوا یہ جماعتی قرارداد کے منافی تھا بلکہ اس فیصلہ کے سراسر خلاف جو ہم نے شروع میں کیا تھا فیصلہ کیونکر بدلا کیسے بدلا کب بدلا مجھے معلوم نہ تھا۔

کم لوگ واقف ہیں کہ

۱۔ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ میں جو دو چار آدمی پہلا شکار ہوئے ان میں سرفہرست میں ہی تھا وارنٹ سب سے پہلے میرے نکلے گرفتاری کا نمبر تیسرا تھا۔

۲۔ سب سے زیادہ سزا ملک بھر میں مجھی کو ہوئی کسی شخص کو تقریر میں پانچ سال قید نہ ہوئی اور نہ کسی نے تمام سزا بھگتی۔

۳۔ مجھ پر بیک وقت چار مقدمے چلائے گئے لائلپور، ملتان، لاہور اور منٹگمری کوئی شخص اس طرح ماخوذ نہ ہوا۔

—— ملتان جیل سے نکلا تو وہاں کی سبھا ہی اُجڑ گئی ابھی دو مقدمے منٹگمری اور لاہور میں باقی تھے میرا چالان لاہور ہو گیا یہ مقدموں کی کھینچا تانی کا زمانہ تھا ؏

دن کہیں رات کہیں صبح کہیں شام کہیں

احرار لیڈر تو خیر بہتر کلاس میں تھے لیکن احرار نوجوانوں کے ساتھ اخلاقی قیدیوں کا سلوک ہو رہا تھا ان کے لئے سخت مصیبتیں تھیں ہوم ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ہدایات تھیں کہ ان کے ساتھ ترجیحی سلوک نہ کیا جائے سیاسی قیدیوں سے علیحدہ رکھا جائے یہ دوہرا عذاب تھا —— میرے بارے

میں لطف و کرم اور بھی زیادہ تھا۔

دوبارہ لاہور میں

لاہور پہنچا تو مجھے اخلاقی قیدیوں کے ساتھ سیاست خانہ میں رکھا گیا بان بٹنے کی مشقت دی گئی بان تو میں بٹ ہی لیتا تھا لیکن کامریڈ حسین بخش نے گوارا نہ کیا کہ اس کی موجودگی میں بان بٹوں میرا بان وہی بٹتا رہا۔

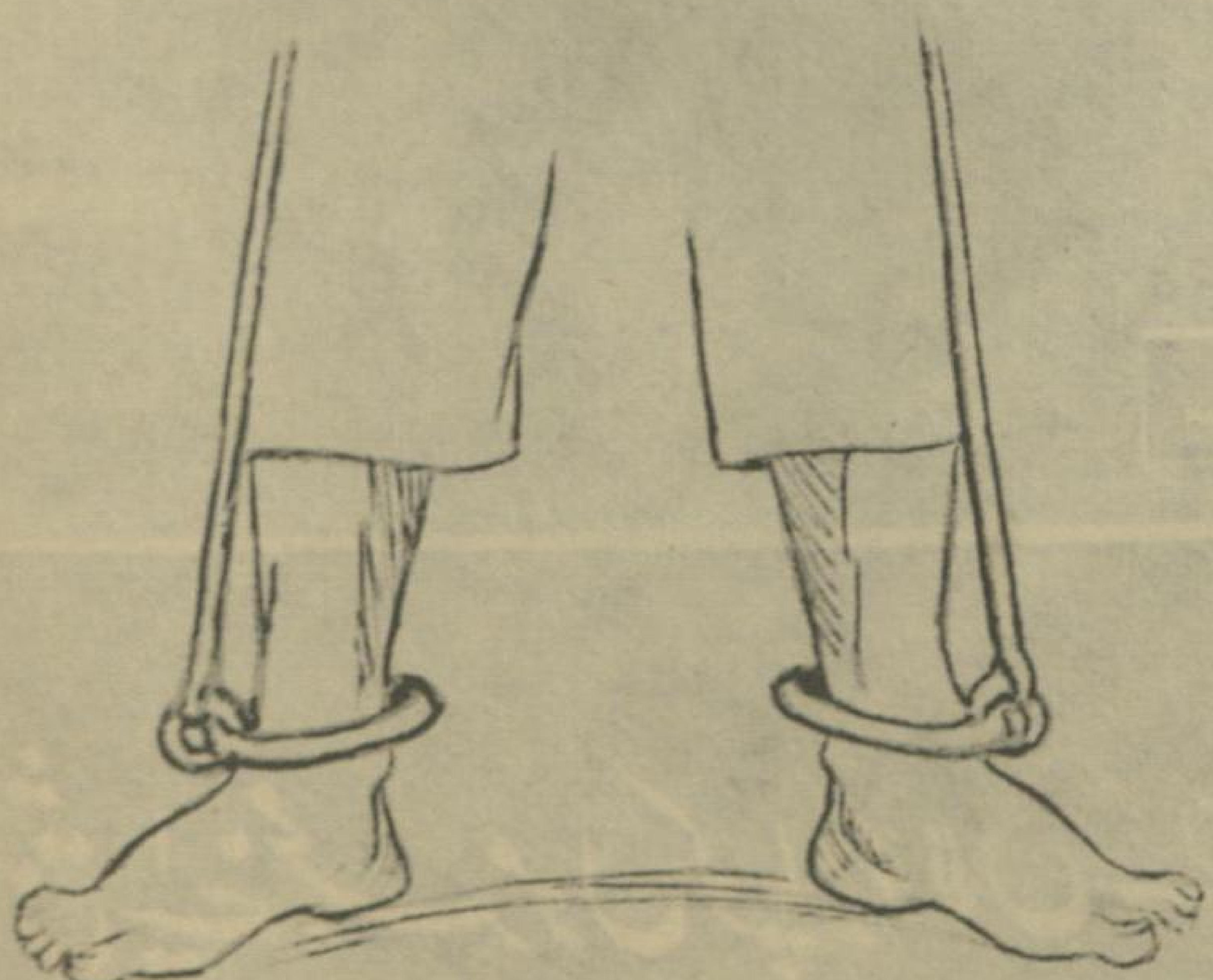
سی کلاس، کالی کوٹھڑی، ایک طرف مٹی کی کھڈی (چبوترہ) دوسری طرف چکی، اِدھر بول و براز کا برتن، اُدھر مٹی کی جھجھر، طبیعت یکسو نہ تھی اور نہ یہ معلوم تھا کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا یا اب مجھے کہاں جانا ہوگا منٹگمری کا مقدمہ ابھی لٹک رہا تھا کتابیں ساتھ نہ تھیں جو دو چار کتابیں ساتھ تھیں انہیں پڑھ چکا تھا اور اب انہی کو بار بار پڑھنے میں کچھ مزہ نہ آ رہا تھا انہی دنوں ارمغان حجاز کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا جو میاں قمرالدین (رئیس اچھرہ) نے بھجوا دیا۔ کلام اقبال کے دوسرے مجموعے بھی خرید کئے۔ ترجمان القرآن منگوایا مکتوبات امام ربّانی ہاتھ آ گئے الہلال کا فائل مل گیا بعض تاریخی اور سیاسی کتابیں آ گئیں غرض پانچ سالہ قید کا بہلاوا جمع کرتا رہا مسعود اختر ''پینگوئن سیریز'' ———— کی بہت سی کتابیں دے گیا اس طرح پچاس ساٹھ کتابوں کا ایک ذخیرہ اکٹھا ہو گیا لیکن مطالعہ میں ابھی جی نہیں لگتا تھا ———— شیخ حسام الدین اسی جیل میں تھے میں پہنچا تو وہ میو ہسپتال جا چکے تھے انہیں عمر بھر گھٹنوں کا درد رہا، اور اس درد نے ایام قید میں انہیں خاصا فائدہ پہنچایا جب بھی قید ہوئے درد عود کر آیا اور وہ جیل سے منتقل ہو کر ہسپتال چلے گئے۔ میں جتنے دنوں لاہور سنٹرل جیل میں رہا وہ ہسپتال سے لوٹے نہیں کرنل سوندھی (سپرنٹنڈنٹ) محاذ جنگ پر چلا گیا اسکی جگہ کوئی اور صاحب آ گئے۔

جیلر ایک سکھ تھا اُس سے تو تکار ہوگئی مجھے دیکھتے ہی پولیس سے کہا اِس بلا کو کہاں رکھوں؛ چونکہ اُس کے لہجہ میں حقارت تھی لہذا مجھے سخت غصہ آیا میں نے کہا اپنے لفظ واپس لیجئے' اور ان احمقوں سے پوچھئے جنھوں نے یہاں بھجوایا ہے میرا منہ تکنے لگا ایک قیدی سے — دوٹوک جواب کی توقع کہاں؛ عجب نہ تھا کہ تلخی بڑھ جاتی لیکن سردار جی فوراً برفاب ہوگئے۔ سردار ہرچرن سنگھ سینئر اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پرانے واقف تھے انہوں نے جیلر کو سمجھا دیا۔ چند دنوں کا قیام تھا کٹ گیا۔



سنٹرل جیل منٹگمری

عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لے چلا



منٹگمری جیل روانہ ہوا تو بیڑیاں پہنادی گئیں پہلے یہ کبھی نہ ہوا تھا میں نے بہر حال کوئی عذر نہ کیا، اس کا عادی تھا پہلے کئی دفعہ بیڑیاں پہن چکا تھا۔ لاہور اسٹیشن پر خاصی رونق ہوگئی بے شمار دوستوں نے الوداع کہی جنگ کا زمانہ تھا ہر طرف گما گہمی نظر آرہی تھی گاڑیوں کا یہ حال تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ بے شمار گاڑیاں اِدھر اُدھر چلتی تھیں۔ فوج کی نقل و حرکت نے اور بھی ہنگامہ پیدا کر رکھا تھا۔

دوستوں نے محبت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ رخصت کیا۔ انجن نے وسل دی گاڑی حرکت میں آگئی

"ہم کب واپس آئیں گے؟"

"یہ جنگ کب ختم ہوگی"؟

"پانچ سال کی مدت بڑی مدت ہے"

"انگریز کو شکست ہوگئی تو زندہ نہیں چھوڑے گا"

"قیدیوں کو مروا دینا کوئی مشکل نہیں؟"

"خوش قسمت ہے انگریز کہ اُسے یہاں بے شمار صالح محمدُ لیکھراجُ اور بنتا سنگھ ملے ہوئے ہیں جنہیں وفاداری بشرط استواری نے پیدا کیا جو انگریزوں کے لئے جنے گئے اور انگریزوں ہی کے لئے مریں گے"۔

مَیں خوابوں کے چمنستان میں چلا گیا۔ مجھے کچھ یاد نہ رہا کہ گاڑی کس رفتار سے جا رہی ہے اور مَیں کہاں ہوں؟ دل بہر حال مطمئن تھا خیالات خود بخود اُبھرتے چلے آ رہے تھے، پانچ سال

ع دور تک یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو

بال بھارت سبھا کا زمانہ یاد آ گیا کچھ دیر تصوّر میں ادم پرکاش سے باتیں کرتا رہا کم سن راجپال سے ملا جسے پولیس نے اغلام کے بعد ہلاک کر کے رتن چند کے تالاب میں پھینک دیا تھا شہید گنج کا زمانہ سامنے آ گیا۔ نوجوانوں کے حوصلے، شہیدوں کے ولولے، قید و بند کے مرحلے، اور سیاسی پیچ و خم کے سلسلے، آنکھوں میں گھومنے چلے گئے پھر اپنی عادات اسیری پر سوچنا شروع کیا ۱۹۳۵ء سے اب تک تمام عیدیں جیل میں آتی تھیں ہم گویا عیدین کے لئے پیدا ہی نہیں ہوئے تھے ہماری کتاب زندگی سے عیدیں خارج ہو چکی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد میری آنکھ لگ گئی مَیں نے خواب میں دیکھا: ——

"خورشید بیمار پڑی ہے۔ اُس کا شہابی رنگ گھُل گھُل کر زرد ہو رہا ہے اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ہیں۔ وہ مجھ سے کہہ رہی ہے آغا جی! آپ نے مجھ سے وفا نہیں کی دغا کی ہے عشق کو آپ سے گلا ہے"۔

اور مَیں یکایک بڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا گاڑی رُکی تو ہم منٹگمری کے اسٹیشن پر تھے۔

۱۹۴۰ء کا زمانہ شروع جنوری کے دن، منٹگمری سنٹرل جیل کا چھوٹا دروازہ کھُلا اور بند ہو گیا

رات کے ساڑھے گیارہ بج رہے تھے دربان نے کہا: ابھی تھوڑی دیر میں آپ کا جمعدار غلام حسین شاہ آتا ہے۔ وہ آپ کو "وصول" کرے گا۔ آپ کی اطلاع آچکی ہے آدھ گھنٹہ میں غلام حسین شاہ آگیا۔ گورا رنگ، داڑھی مونچھیں صاف، چھنٹہ دار بال، میانوالی کے کسی گاؤں کا رہنے والا لب ولہجہ ٹھیٹھ، بول چال میں مٹھاس لیکن چھری کی طرح بے آواز کہنے لگا آپ کے پاس جو کچھ ہے دے دیجئے۔ میں نے کہا: کتابیں ہیں کاغذ ہے پنسل ہے اور یہ کلام پاک ہے اُس نے کہا کلام پاک تو آپ لے جا سکتے ہیں باقی یہاں رکھ دیجئے صبح انشاء اللہ یہ سب کچھ آپ کو پہنچا دیا جائے گا میں نے کہا: جو چیز صبح پہنچانا ہے ابھی دیدیجئے کہنے لگا نہیں یہ بات نہیں ڈپٹی صاحب ملاحظہ فرمائیں گے تو آپ کو یہ چیزیں مل جائیں گی میں نے کہا: ان میں کوئی چیز خطرناک نہیں جیل ہی سے آرہا ہوں افسروں کے دستخط موجود ہیں نہ مانا کہنے لگا یہاں کے افسر بھی دیکھ لیں تو ہرج کیا ہے؟۔ بھروسہ رکھئے تمام چیزیں آپ کو صبح مل جائیں گی ناچار چپ ہو رہا اُس نے پہنے ہوئے کپڑوں کی تلاشی لی، بوٹ اُتروا کر دیکھے قرآن مجید کو غلاف میں سے نکلوا کر ورق ورق دیکھا اس حرکت پر مجھے سخت غصہ آیا لیکن پی گیا۔

"کیا آپ کو میرے کہے کا یقین نہیں؟۔ ایک مسلمان کو کم از کم کلام اللہ کی تلاشی نہ لینی چاہیئے"

"جی نہیں! ڈیوٹی ہے یہ کلام پاک کی تلاشی نہیں۔ بعض قیدی اللہ کی اس کتاب میں بھی بدمعاشی چھپا کر لے آتے ہیں"۔

"لاحول ولا قوۃ" قرآن پاک میں بدمعاشی؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

"جی ہاں، مثلاً ناجائز خطوط، نوٹ، بلیڈ، افیون وغیرہ اور یہ سب چیزیں جیل میں بدمعاشی ہیں"

ہولناک دیواریں اندھے دروازے

منٹگمری سنٹرل جیل کے دو حصے ہیں ایک سنٹرل جیل دوسرا ڈسٹرکٹ جیل مجھے ڈسٹرکٹ جیل

ہیں رکھا گیا رات کا وقت تھا کوٹ موقع (جیل کی چار دیواری) کے ساتھ ساتھ بجلیوں کے کھمبے روشن تھے یا قیدی نمبردار پہرہ چلا رہے تھے اونچی نیچی دیواروں کا ایک پیچدار سلسلہ تھا۔ کئی چھوٹے بڑے پھاٹک کھلے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر تالے کھلتے اور بند ہوتے گئے۔ آخر دیواروں سلاخوں اور تالوں کا ایک طویل چکر ختم ہو گیا مجھے پہلے احاطہ کی ایک کوٹھری میں بند کر دیا گیا غلام حسین شاہ نے کہا اُزار بند نکال دو میں نے سختی سے انکار کیا وہ چپ چاپ چلا گیا قیدی نمبردار سے پانی مانگا وہ مٹی کا آبخورہ لایا اور کہا کہ اوک سے پی لو کیونکہ آبخورہ سلاخوں میں سے گزر نہیں سکتا اس کی اسلامی شکل دیکھ کر میں نے پوچھا ہمارے دوسرے ساتھی کہاں ہیں؟ کہا مجھے معلوم نہیں یہاں کون بند ہے؟ یہاں آپ کے ساتھ کی چکیوں میں کم سن بچے بند ہیں میں خاموش ہو رہا وہ چٹائی بچھا کر نماز پڑھنے لگا خدا معلوم کس وقت کی نماز؟ عشاء؟ تہجد؟ اشراق؟ میں یہ سوچ کر کہ قید اب شروع ہوئی ہے اپنی کھڈی پر سو رہا منہ اندھیرے ایک خنائی ریش چیف ہیڈ وارڈر نے آ جگایا کہا میرے ساتھ چلو۔ نام عبدالکریم تھا یعنی میرا ہمنام لیکن تھا حاجی۔ دوسری تمام چکیوں کے دروازے بند کر دیئے گئے۔ وہاں سے نکالا اور چھ چکی میں لے گیا جو ڈسٹرکٹ جیل کا کالا پانی تھا۔ یہاں کوئی اور قیدی نہ تھا۔ ایک چکی میں مجھے بند کر دیا گیا ——

اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ شیر سنگھ

پھر جب صبح اچھی طرح روشن ہو گئی تو سفید سوٹ میں ایک کالا بھجنگ سکھ نمبرداروں کا لاؤ لشکر لئے غلام حسین شاہ ہیڈ وارڈر، عبدالکریم چیف ہیڈ وارڈر اور دو چار ملازم وارڈروں کی معیت میں آ گیا۔ میں اپنی چھوٹی سی جگہ میں ٹہل رہا تھا پہلے تو بے نیازی سے آگے نکل گیا۔ پھر پلٹا اور رک گیا پوچھا۔

"آپ کا نام؟"

"میرا نام؟ - آپ کو معلوم ہونا چاہیئے"۔

"تاڑ گیا کہ آدمی ٹیڑھا ہے فوراً بولا شورش کاشمیری؟

"جی ہاں ___ اور آپ کا نام" - مَیں نے دریافت کیا۔

"مَیں یہاں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ہوں"۔

"جی - مَیں نے آپ کا نام پوچھا ہے؟"۔

جواب دیئے بغیر چلا گیا لیکن وارڈروں کو اشارہ کر گیا کھلا کیوں چھوٹا ہے؟ بند کر دو بعد میں جمعدار نے بتایا کہ شیر سنگھ نام ہے اِس کا والد یہاں وارڈر تھا مذہبی سکھ ہے کسی ہندو یا سکھ پر اعتبار نہیں کرتا اس کے تمام اردلی جمعدار اور ہیڈ جمعدار مسلمان ہیں پرلے درجے کا ظالم اور شقی ہے قیدیوں کو پٹوانا اس کا طبعی مشغلہ ہے جیل کے قصوری نبدی اور سیاسی قیدی اِسی کے سپرد ہیں۔ کسی سے مروت نہیں کرتا سی آئی ڈی کے ساتھ تعلقات ہیں۔ جی ہیں سپرنٹنڈنٹ جیل بھی اس سے ڈرتا ہے ___

سپرنٹنڈنٹ ایک کشمیری پنڈت، من موہن ناتھ تھا جو بذات خود انتہائی رحم دل لیکن خود رائے نہ تھا عملاً اِس کے ہاتھ میں کٹ پتلی تھا۔ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ (جیلر) پنڈت کا لٹو تھا جو اپنی رائے بھی رکھتا تھا لیکن تبدیل ہو رہا تھا اُس کی جگہ چودھری مرید احمد آ گیا جو ایک خوش مزاج افسر تھا نیک سرشت، نیک خو، صوم وصلوٰۃ کا پابند کچھ دنوں وہ بھی شیر سنگھ کے ہاتھوں عاجز رہا۔

اِسی صبح میری پیشی تھی۔ یہاں میرے خلاف شہزادہ عالم گیر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں ۱۲۴ - الف کا مقدمہ شروع ہو رہا تھا۔ مَیں نے جیلر کو کہلا بھیجا کہ مجھے ساتھیوں سے الگ رکھا تو میں تاریخ پر نہیں جاؤں گا خواہ آپ کچھ ہی کر لیں ___ جیلر نے فوراً ہی بلا بھیجا۔

شیر سنگھ نے کہا:

"یہاں کوئی پولیٹیکل قیدی نہیں ہے؟"

"جی نہیں یہاں پولیٹیکل قیدی ہیں" مَیں نے اصرار کیا حالانکہ مجھے کچھ علم نہ تھا

"صرف دو پاگل قیدی ہیں" شیر سنگھ بولا

"تو آپ نے یہاں کیوں رکھا ہے؟ پاگل خانے بھجوایئے ممکن ہو تو آپ بھی ساتھ تشریف لے جایئے۔"

"شیر سنگھ اس جواب سے قدرے بلبلایا لیکن کالجو نے کہا: اچھا آپ عدالت سے ہو آئیں آپ کو واپسی پر ساتھیوں میں بھیج دیا جائے گا"——

پہلا دن تھا برائے نام سماعت ہوئی لیکن جو دوست لاہور سے آئے تھے اُن سے ملاقات ہو گئی دس روز کی تاریخ پڑی واپس جیل آیا تو کالجو نے مجھے ساتھیوں میں بھجوا دیا یہ وہی جگہ تھی جہاں مجھے پہلی رات بند کیا گیا اور قیدی نمبردار نے جھوٹ بولا تھا کہ یہاں بچے رہتے ہیں مَیں نے غلام حسین شاہ اور حاجی عبدالکریم سے گلہ کیا کہ آپ لوگ بے لذت جھوٹ بولتے ہیں دونو کھسیانے ہو کر بولے۔ کیا کریں ملازمت ہی ایسی ہے۔

بہادر ساتھی

اس بلاک میں مولانا محمد گلشیر (دو سال) مولانا احسن عثمانی (دو سال) صوفی عنایت محمدؐ پسروری (تین سال) حکیم غوث محمد (اڑھائی سال) سیتا رام عرف بندے ماترم (دو سال) کامریڈ نظام الدین (دو سال) کامریڈ راجندر سنگھ آتش (دو سال) کامریڈ لیا سنگھ (دو سال) اور میر داد خان (دو سال) یعنی کل نو قیدی رہ رہے تھے۔ پہلے چار احراری تھے۔ باقی سوشلسٹ اور کمیونسٹ۔

یہ معلوم کر کے شدید صدمہ ہوا کہ اِن کے ساتھ انسانوں سے مختلف برتاؤ کیا جا رہا ہے انہیں حیوان فرض کر لیا گیا اور جب سے یہاں آئے ہیں سخت قسم کی تکالیف کا سامنا کر رہے ہیں۔ ان کے سر پر ہر وقت نمبر دار سوار رہتا اور بیچ بیٹھ کر ان کی باتیں سنتا ہے۔ آج تک کوئی احتجاج کارگر نہیں ہوا دن بھر یہ لوگ بند رہتے ہیں صرف ایک گھنٹہ صبح اور ایک گھنٹہ شام کھولا جاتا ہے۔ ہر روز ان کی مجرمانہ طریق سے تلاشی لی جاتی ہے شیر سنگھ بلاناغہ شام کو نمبرداروں کی کھیپ لے کر آتا اور اِن کے بستر وغیرہ اُٹھا پٹخ کر چلا جاتا ہے یہ تمام چکی پیستے ہیں شیر سنگھ کا طرزِ مخاطبت انتہائی گستاخانہ ہے۔

پہلی جھڑپ

میں نے سب سے پہلے نمبر دار کو ٹوکا سر پر کیوں کھڑے ہو؟ پرے ہٹ جاؤ۔ یہ حجر کرنے لگا۔ میں نے ڈانٹ کر ہٹا دیا بلکہ دھتکارتے ہوئے کہا جاؤ شیر سنگھ سے بولو۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا وہ چلا گیا اور واپس نہ آیا ہم نے اس اثنا میں احتجاج کا طریق کار طے کر لیا میں تو بھوک ہڑتال کے حق میں تھا لیکن مولانا محمد گل شیرؒ شرعی عذر کی بنا پر راضی نہ ہوئے طے یہ پایا کہ آج شام جب شیر سنگھ بستر وغیرہ کی تلاشی لے تو اُس کے فوراً بعد بستر اُٹھا کر باہر پھینک دیئے جائیں اور اعلان کر دیا جائے کہ ہم اِن ٹھٹھرتی ہوئی سردیوں میں "بستر چھوڑ" ہڑتال کر رہے ہیں جاڑے میں مر جانا منظور ہے لیکن روزمرہ کی یہ ہتک ایک لحظہ کے لئے بھی گوارا نہیں حسب معمول شیر سنگھ آیا۔ تلاشی لی نمبرداروں نے میرا بستر ٹٹولنا شروع کیا کپڑوں کی گٹھڑی کھولی۔ میں نے کہا: ؎

سوائے حسرتِ تعمیر کوئی چیز نہیں

شیر سنگھ کی سمجھ میں کیا آتا۔ کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا بولا: مہاراج ہم تو ضابطہ پورا کرتے ہیں میں نے کہا؛ جی ہاں۔ ضابطہ نسوانی آبرو کی طرح نازک ہوتا ہے کچھ نہ سمجھا شراب میں دُھت تھا

سامنے چکی پر ترجمان القرآن (مولانا آزاد کا ترجمہ) پڑا تھا اُٹھانے لگا میں نے جھٹک دیا معاف کیجئے آپ اس کو ہاتھ نہیں لگا سکتے یہ ہماری مقدس کتاب ہے اور آپ اس وقت نشہ میں ہیں۔

"غلام حسین شاہ تم دیکھ لو۔" اس نے کہا

غلام حسین نے جزدان آتارا۔ ترجمان القرآن از ابوالکلام آزاد کے الفاظ سے چونکا۔

شیر سنگھ:۔ "یہ مولانا صاحب کا قرآن ہے؟"۔

میں:۔ "جی نہیں۔ اللہ کا قرآن ہے۔ مولانا آزاد نے اس کا ترجمہ کیا ہے"۔

شیر سنگھ:۔ "وہ تو کانگریس کے صدر ہیں"

میں:۔ "جی ہاں"۔

شیر سنگھ:۔ "اس میں حکومت کے خلاف تو کوئی بات نہیں؟"

مجھے ہنسی آگئی اجی سردار صاحب یہ کتاب ہی حکومت کے خلاف ہے اس چھیڑ چھاڑ کے بعد وہ نکل گیا ہم نے بستر اُٹھا کر سلاخوں کے باہر پھینک دیے اور متحد ہو کر اپنی اپنی کوٹھڑی سے انقلاب زندہ باد کا نعرہ بلند کیا ——— یہ جیل والوں کے لیے ایک انتباہ تھا کہ ہم لوگ جاگ اٹھے ہیں جیلر آیا سپرنٹنڈنٹ پہنچا۔

"یہ کیا"؟ سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا

"شیر سنگھ کے مظالم کے خلاف احتجاج"۔ میں نے جواب دیا

بہتیری کوشش کی گئی کہ ہم میں پھوٹ پڑ جائے یا ایک دو ساتھی ہی مان جائیں لیکن ہر ایک نے جواب دیا کہ حتمی بات شورش ہی کر سکتا ہے وہی ہمارا ترجمان ہے اور اگر ہم میں سے کسی کو الگ کیا گیا یا سب ایک دوسرے سے جدا کیے گئے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ہم سب بھوک ہڑتال کر دیں گے ——— گنتی بند ہو چکی تھی سب اچھا بھی ہو گیا تھا جب کوئی چارہ کار نہ رہا تو جیل کے افسر ہر اکڑا کر کے گھروں کو چلے

گئے ہر کوٹھری کے سامنے لالٹین رکھ دی گئی ڈاکٹروں کی ڈیوٹی لگا دی گئی کہ رات بھر جیل کے اندر ہسپتال میں رہیں اور پھیرا ڈالتے رہیں افسروں نے گشت شروع کی خود سپرنٹنڈنٹ کئی دفعہ آیا ساتھیوں میں ہر کوئی اپنی کھڈی پر اکڑوں بیٹھا تھا میں رات بھر ٹہلتا رہا مولانا محمد گل شیر نے رات کا اکثر حصہ نماز میں گذارا۔ سیتارام بندے ماترم نے خاصی رونق پیدا کی اُس نے اپنے انقلابی گیتوں سے جیل کو ہلا ڈالا صوفی عنایت محمد پسروری بھی مناجات پڑھتے رہے حکیم غوث محمد نے قرآن پاک پڑھنا شروع کیا تو صبح ہونے تک کئی پارے پڑھ ڈالے راجندر سنگھ آتش جپ جی کا پاٹھ کرتا رہا میں نے سینکڑوں عنوانوں پر سوچ ڈالا آنکھوں میں رات کٹ گئی کئی جمعدار اور کئی افسر آتے جاتے رہے اُن سے کیا بات کرتا میں نے ڈاکٹر کو بھی رسید نہ دی نور کے تڑکے ہمیں کھول دیا گیا میرے پاس سپرنٹنڈنٹ کا اردلی آیا اور کہا کہ صاحب بہادر یاد کرتے ہیں ساتھیوں نے منع کیا کہ جاؤ نہیں شاید تمہیں الگ کر دیں سوچ و چار کے بعد طے پایا کہ سپرنٹنڈنٹ کو یہاں بلا لیں اردلی سے کہا کہ صاحب سے کہو کہ یہاں تشریف لے آئیں تھوڑی دیر بعد سپرنٹنڈنٹ، داروغہ اور شیر سنگھ، ایک لاؤ لشکر سمیت وارد ہو گئے۔ پہلے تو انہوں نے ایک چلتی ہوئی نگاہ سے سب کو دیکھا پھر رُک گئے مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے!

"لڑکے! آپ نے فتور مچا دیا ہے"۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر کہا:

"یہ آپ نے کیا کیا؟ ہم نے آپ کو ساتھیوں میں اس لئے نہیں بھیجا تھا کہ آپ انہیں اُکسائیں اور اس راستہ پر لگا دیں"۔

میں نے کہا: پنڈت جی آپ مجھ سے واقف ہیں میں لاہور میں آپ کے پاس قید کاٹ چکا ہوں آپ ہی نے وہاں مجھے چودہ نمبر سے نکالا تھا یہاں جو کچھ ہوا ناگزیر ہے میں نے تو احتجاج کو نرم کیا ہے ورنہ یہ سب جان کی بازی لگانے کا تہیہ کر چکے تھے ہم لوگ اخلاقی نہیں سیاسی قیدی ہیں کسی کو نقصان پہنچا کر

نہیں آئے ملک کی آزادی کے لئے آئے ہیں آپ کا یہ اسسٹنٹ شیر سنگھ اس سارے فتور کا اصل بانی ہے اُس نے اب تک کسی کو انسان نہیں سمجھا مولانا گل شیر ہمارے دینی پیشوا ہیں مسلمانوں میں ان کا بڑا مرتبہ ہے یہ شخص انہیں بھی 'اوئے گل شیرا کی حال اے ترا' کہہ کر پکارتا ہے۔ احسن عثمانی وسیوں اخباروں کے ایڈیٹر رہے ہیں یہ اُن سے اِس طرح بولتا ہے جیسے کوئی تھانیدار نسلی چور سے مخاطب ہو غرض ہر شخص کے ساتھ اس کا یہی سلوک ہے مولانا گل شیر اور دوسرے ساتھی چکی پیستے ہیں احسن لاغر ہو کر بان بٹتا ہے صوفی بیمار ہیں چرخہ کاتتے ہیں۔

گنتی بند ہونے کے بعد شیر سنگھ غراتا ہوا آتا ہر ایک کے بستر کو اُتھل پتھل کرتا بلا وجہ تلاشی لیتا اور وندناتا ہوا نکل جاتا ہے اس کو ایذا رسانی میں مزہ آتا ہے اِس جاڑے میں بھی پریڈ کے دن جوتے اُتروا کر باہر رکھوا لئے جاتے ہیں گھنٹوں سپرنٹنڈنٹ کا انتظار کرنا پڑتا اور پیر ٹھٹھرتے رہتے ہیں یہ بے ڈھنگے پاجامے جو ہم نے پہن رکھے ہیں اس کے ناڑے نہیں شیر سنگھ نے نکلوا لئے ہیں ہماری ہیئت کذائی ہی بدل دی ہے۔

"یہ قاعدہ ہے" ——— شیر سنگھ نے لقمہ دیا۔

"کوئی قاعدہ نہیں ہے ——— آپ غلط کہہ رہے ہیں"۔ میں نے غصہ میں جواب دیا ———

"قیدی ناڑے سے گلا گھونٹ لیتے ہیں"۔ شیر سنگھ نے کہا۔

"آپ خاموش رہیئے ہم آپ سے مخاطب نہیں ہیں۔ یہ آگ آپ کی لگائی ہوئی ہے ہم لوگ پھانسی لینے والے نہیں آپ یہ کہہ کر ہماری توہین کر رہے ہیں اور اگر جیل کے بدمعاش قیدیوں کے لئے اِس قسم کا کوئی قاعدہ ہے تو ہمارے بارے میں یہ کیوں سوچا گیا؟"

سپرنٹنڈنٹ کو معلوم ہو گیا کہ یہ لوگ اب بگڑ گئے ہیں نرمی سے کہا ——— "میں تمام

شکایات کا ازالہ کر دوں گا جیل تو بہر حال جیل ہے۔"

"جی ہاں لیکن یہ سفلہ پن تو جیل کے قواعد میں نہیں ہے"۔

"صبر کیجئے غصہ میں آنے کی ضرورت نہیں۔ سب باتیں درست ہو جائیں گی۔"

"یہ ستم ناقابل برداشت ہے کہ ہمیں دن بھر بند رکھا جائے۔ ہم دن بھر کھلا رہنا چاہتے ہیں اس خوفناک تنہائی میں بھی ہمیں تمام دن الگ الگ بند رکھنا اور کھولنا تو ایک گھنٹہ صبح اور ایک گھنٹہ شام کسی طرح بھی برداشت کے قابل نہیں ہے"

"سب شکایات ایک منٹ میں رفع ہو سکتی ہیں بشرطیکہ آپ شیر سنگھ کی جگہ کسی اور شریف آدمی کو لگا دیں۔"

شیر سنگھ دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا لیکن بظاہر مسکراتا رہا۔ سپرنٹنڈنٹ یہ کہہ کر چلا کہ آپ میں سے دو کو دفتر میں بلاتا ہوں مگر دوستوں نے زور دیا یہیں فیصلہ کر دیجئے سپرنٹنڈنٹ بولا مطمئن رہئے کوئی دھوکہ نہیں ہوگا کسی ساتھی کو الگ نہیں کیا جائے گا۔

نتیجہ کیا نکلا

سپرنٹنڈنٹ نے دفتر میں ہمیں چائے پلائی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا اس وقت تنہا تھا کہنے لگا شیر سنگھ سی آئی ڈی کے مُنہ لگا ہوا ہے ہوم ڈیپارٹمنٹ سے ہدایات ہیں کہ اسی کو آپ پر لگایا جائے۔ آپ اس کی تبدیلی کا مطالبہ نہ کریں۔ باقی آپ کے سبھی مطالبات تقریباً تسلیم کر لیے جاتے ہیں وہ آپ سے اچھی طرح بولے گا دن بھر آپ کھُلے رہیں گے مشقت کیجئے نہ کیجئے آپ کی مرضی پر ہے چرخہ کات لیا کیجئے کوئی نمبردار آپ کے سر پہ سوار نہیں ہوگا کھانا بہتر ملے گا ازار بند آپ کو ابھی مل جاتے ہیں آپ کہیں تو میں گھر سے چھاچھ بھجوا دیا کروں ہم مان گئے پہلا ٹکراؤ تھا سپرنٹنڈنٹ کا شکریہ ادا کیا اور

شیر سنگھ پر جو ڈیوڑھی میں کھڑا تھا ایک طنزیہ مسکراہٹ ڈالتے ہوئے واپس آگئے ساتھیوں کو مطلع کیا سب نے رات کے اِس یدھ کی کامیابی پر اظہار اطمینان کیا اور دوستانہ لہجہ میں میرے اس نوایجاد احتجاجی نسخہ کی داد دی ———

زمین جلبند نہ جنبند

دوپہر کے وقت غلام حسین شاہ چابیوں کا گچھا لئے وارد ہو گیا گھنٹہ بھر کے لئے بند ہو جانے کا عام قاعدہ ہے ہم نے اِس سے بھی انکار کیا منت کرتا رہا ہم کہاں مانتے چلا گیا دس منٹ گزرے ہوں گے کہ شیر سنگھ کو ساتھ لے کر آگیا ہم نے شیر سنگھ کو رسید تک نہ دی پہلے کھڑے ہو جایا کرتے تھے اب کھڑے بھی نہ ہوئے، خود ہی بولا "دوپہر کو ایک گھنٹہ کے لئے سارے جیل کی گنتی بند ہو جاتی ہے آپ بھی بند ہو جایئے باقی دن بھر کھلے رہیئے"

"ہم پہلے ہی بند ہیں اِس احاطہ ہی کے تین دروازے اور تین تالے ہیں کسی کوٹھڑی میں کوئی روشندان نہیں یہ مختصر سا احاطہ ہے آپ اِس میں بھی ہمیں بند رکھنا چاہتے ہیں؟" میرداد نے کہا۔

تھوڑی دیر تکرار رہی۔ آخر سپر انداز ہو کر چلا گیا۔

مشقِ ستم اور

اب اُس نے پریشان کرنے کا ایک نیا طریقہ نکالا۔ ہمارے ساتھ کے بلاک CELLS میں اِس قسم کے قیدی رکھنے شروع کئے جو صبح و شام پٹتے تھے جنہیں جیل کی اصطلاح میں قصوری (بدمعاش) کہتے ہیں درمیان میں ایک بہت اونچی اور پختہ دیوار تھی اِن قیدیوں کی چیخیں اُڑ اُڑ کر پہنچتیں اور یہ واویلا

دن بھر رہتا انہیں اتنا مارا جاتا کہ دیواریں کانپ کانپ جاتیں کوے یا کتے کی آواز سننے کو تو کان ترس گئے تھے مگر قیدیوں کو جوتے پڑنے کی آوازیں لگاتار آتی تھیں۔ وقت کا بڑا حصہ بدمزہ ہو جاتا۔ ایک دن کسی قیدی کو اتنا مارا گیا جیسے وہ مر ہی گیا ہو۔ ہم تھوڑی دیر تک تو اس کے نالہ ہائے درد سنتے رہے لیکن جب اُس نے آخری چیخ ماری کہ مر گیا اور پھر اس کے بعد کوئی نالہ نہ اُٹھا تو ہم بے چین ہو گئے میر داد خان نے اندر ہی سے چلا کر کہا:

او حرامزادو! کیوں مارتے ہو؟

میر داد نے للکارا تو جمعدار غلام حسین دوڑا ہوا آیا ہم نے شور مچا دیا کہ تم لوگوں نے قیدی قتل کر دیا ہے نعرے لگانے شروع کئے شیر سنگھ بھی آپہنچا جیلر آ گیا سپرنٹنڈنٹ کو بھی آنا پڑا۔

میر داد خان نے کہا "جب تک دیکھ نہ لوں مجھے چین نہیں آ سکتا قیدی ضرور مارا گیا ہے" دیر تک جھگڑا رہا میر داد نے احاطہ دیکھا تو وہاں کوئی قیدی نہ تھا ظاہر ہے کہ مجروح یا مقتول کو غائب کر دیا ہو گا نتیجہ یہ نکلا کہ چکی نمبر ۲ میں سے اس قسم کے سبھی قیدی نکال دیئے گئے اس کے بعد نہ کبھی مار کٹائی کی آواز آئی نہ شور ہوا اور نہ ہم نے احتجاج کیا۔

خطوط کی ضبطی

شیر سنگھ دل ہی دل میں بس گھولتا رہا اب اُس نے یہ وار کیا کہ ہماری ڈاک بند کر دی جو خط ہم اعزہ و اقربا کو لکھتے وہ بھیجتا نہیں جو خط باہر سے آتا وہ دیتا نہیں ہم پوچھ رہے ہیں وہ انکار کر رہا ہے تقاضا کرتے ہیں تو کہتا ہے کہ کہاں سے لاؤں؟ خود لکھ کر ڈال دوں ملاقات نہ پیام، دعا نہ سلام، ایسی کوئی وجہ نہ تھی کہ ہمارے اعزّہ ہمیں خط نہ لکھیں۔ اس سے پہلے میرے خطوط کی رفتار یہ تھی کہ خورشید دن میں دو تین خط لکھتی۔ عبداللہ ملک بھی دو ایک خط لکھتا مسعود اختر روز ایک خط لکھتا سید عنایت شاہ بھی

ہفتہ میں دو خط لکھتے والد بھی ایک آدھ خط بھیج دیتے مگر شیر سنگھ پٹھے پر ہاتھ ہی نہ دھرنے دیتا تھا۔ عبداللہ ملک تاریخ پر ملتا تو کہتا کئی خط لکھ چکا ہوں جواب نہیں آرہا شیر سنگھ کا ایک ہی جواب تھا میرے پاس کوئی خط نہیں کوئی لکھتا ہے تو مجھے نہیں ملتا آپ لوگوں کی ڈاک سنسر ہوتی ہے ممکن ہے سی آئی ڈی قبضہ کر لیتی ہو۔ ایک دن میں کچہری سے آکر ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو پوسٹ مین دربان کو قیدیوں کی ڈاک دے رہا تھا میں نے بنڈل چھین لیا میرے دو خط نکلے ایک خورشید کا دوسرا عبداللہ ملک کا۔ دفتر سے شیر سنگھ بھی برآمد ہو گیا اُس نے دیکھا تو سٹپٹایا دربان کو ڈانٹنے لگا میں بھی تلخ ہو گیا بہر حال اس تلخی میں دو خط ہاتھ آگئے اور ساتھ ہی اُس کے غاصب ہونے کا حتمی یقین ہو گیا اُس نے آخری حربہ یہ استعمال کیا کہ راجندر سنگھ آتش کو سکھ دھرم کا واسطہ دیکر اپنے ساتھ ملا لیا وہ کھُل کر تو نہیں لیکن بالواسطہ طرفداری کرنے لگا حکیم غوث محمد ہم میں غریب الطبع انسان تھے انہیں اکثر اپنے گھر کے خط کا انتظار رہتا وہ اپنے اکلوتے بچے کی طرف سے فکر مند تھے جو ابھی عمر کی چھٹی یا ساتویں منزل میں تھا۔ باپ کو اولاد سے پیار ہوتا ہے مگر شیر سنگھ اِن کے خطوط بھی غائب کرتا رہا اس دماغی تشدد کا اُن کے اعصاب پر خاصا اثر پڑا۔ سپرنٹنڈنٹ سے کہا، جیلر سے فریاد کی، شنوائی نہ ہوئی، جواب تھا کوئی خط نہیں آرہا خط آئیگا تو ضرور پہنچا دیا جائے گا آخر ہم نے شیر سنگھ کو بے عزت کرنے کا تہیہ کر لیا تنگ آمد بجنگ آمد وہ مجرموں میں رہ کر مجرم ہو چکا بلکہ بدترین قسم کا مجرم تھا۔ اُس میں شرافت، اخلاق، حیا، رحم اور ایسے ہی دوسرے اوصاف کا شائبہ تک نہ تھا وہ پرلے درجے کا ظالم تھا اس کے ظلم کی داستانیں اخلاقی قیدیوں میں خوف کے ساتھ مشہور تھیں اسکی کالی کلوٹی صورت، بے ڈول جسم، بھدّے نقش ونگار، اتنے مکروہ تھے کہ میں نے اُس کا نام بنبیّ سنگھ رکھ دیا تھا۔ بنبی پنجابی زبان میں اُس کالے ڈوال کو کہتے ہیں جس میں بھنگی بول و براز اُٹھا کر لے جاتے اور پھینکتے ہیں وہ آتا تو ہم آوازے کستے ہم نے قطعی طور پر اس کا بائیکاٹ کر دیا، ڈھیٹ تھا، بے عزتی سہتا، لیکن روز آتا اور خالی کوٹھڑیوں کا منہ تک کے نکل جاتا آخر ایک دن وہ بدلہ لینے میں کامیاب

ہوگیا سپرنٹنڈنٹ کو سی آئی ڈی کے حکام سے اِس مطلب کا ایک خط بھجوادیا کہ جب تک شورش کا عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے اسکو سیاسی قیدیوں سے الگ رکھا جائے اِس طرح ان قیدیوں کی خبریں باہر آتی جاتی ہیں سپرنٹنڈنٹ نے مجھے بلایا خط کا ذکر کیا مَیں نے کہا آپ پابند نہیں ہیں جیل کے نظم ونسق کی ذمہ داری آپ پر ہے سی آئی ڈی والے کون ہوتے ہیں اُس نے مجبوری ظاہر کی یہ مرحلہ ایسا تھا کہ مَیں لڑنا نہیں چاہتا تھا اور نہ اس جھمیلے میں ساتھیوں کو اُلجھانا ہی مناسب تھا کیوں کہ معاملہ بگڑ بھی سکتا تھا مجھے تاریخ سے واپسی پر چھ چکی میں بھیجدیا۔

چھ چکی میں

یہ جگہ اِس جیل میں کالا پانی کہلاتی ہے کُل چھ کوٹھڑیاں ہیں لیکن جہنم' دن بھر یہ کوٹھڑیاں خالی رہتیں یا ورمَیں تنہا ہوتا گنتی بند ہونے کے بعد اُن میں رات کی رات حوالاتی یا قیدی رکھے جاتے انہیں حکم ہوتا کہ حلق سے آواز بھی نہ نکلے بیچارے دم گھٹ رہتے آواز نکلی نہیں اور پٹے نہیں اِس بُری طرح مارا جاتا کہ پناہ بخدا مَیں نے یہاں بھی شیر سنگھ کا بائیکاٹ جاری رکھا نہ کبھی اس کے لئے کھڑا ہوا نہ اس سے بات چیت کی جب آتا مَیں دیوار کی طرف منہ کر کے سوچنے لگتا جیسے اُس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ ساتھیوں کو میرے اس طرح غائب ہوجانے سے حیرت ہوئی شیر سنگھ سے استفسار کیا، جواب دیا کہ لاہور تاریخ پر گیا تھا ابھی لوٹا نہیں وہ متذبذب ہوئے تو جھوٹی قسمیں کھا کھا کر انہیں یقین دلاتا رہا کچھ دنوں بعد اُنہیں آنکھیں دکھانے لگا لیکن اب وہ بھی کچی گولیاں کھیلے ہوئے نہ تھے۔ مولانا گل شیر اور میر داد خان نے اُسے تیر کی طرح سیدھا رکھا البتہ ایک چیز میں وہ کامیاب ہوگیا ہمارے دو ساتھیوں کو اُس نے اپنے ساتھ ملا لیا ایک راجندر سنگھ آتش جو سکھ ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ ہو گیا' دوسرا امر لی دھر جو مہا سبھائی ذہنیت رکھتا تھا۔ ان دونوں کی معرفت اُسے ساتھیوں کی جھوٹی سچی

خبریں مل جاتی تھیں۔ ایک روز سب نے اکٹھا ہو کر ان دونو کو پیٹ ڈالا، اور ایک مخبر کا اِس سے بہتر کوئی علاج نہ تھا۔

۱۲۴۔ الف

۱۲۴۔ الف کا مقدمہ دو تین ماہ چلتا رہا سرکاری رپورٹر ایک ہندو نوجوان تھا میں نے محض شوشہ چھوڑا کہ اس مقدمہ میں بھی لرزہ خیز انکشاف کا امکان ہے پہلا دن تھا کورٹ انسکپٹر گھبرا گیا۔ ان دنوں گجرات میں شاہ جی کا رپورٹر لدھا رام منحرف ہو چکا تھا پولیس کو شبہ ہوا کہ شاید اس مقدمہ میں اسی طرح کا کوئی گل کھلے۔

چنانچہ شہادت کے روز پی ڈی ایس پی عدالت میں موجود رہا شہادت ہو گئی میں نے مذاقاً جرح کی رپورٹر کے بارے میں عدالت سے کہا کہ اس نے کوئی فقرہ بد دیانتی سے شامل نہیں کیا صرف چند الفاظ کا تلفظ اس سے ادا نہیں ہو سکا بعض جگہ فقروں میں سے کچھ الفاظ رہ گئے ہیں یا ایک آدھ جگہ جو لفظ میں نے بولا تھا وہ نہیں دوسرا لفظ آ گیا ہے جس سے فقرے کی ساخت کمزور ہو گئی ہے۔ میرے اس اعتراف سے کہ رپورٹر نے کوئی بد دیانتی نہیں کی اُس نوجوان نے ہلکی سی مسرت محسوس کی لیکن اس کے چہرے سے واضح طور پر پشیمانی کا اظہار ہو رہا تھا باقی تمام سرکاری گواہ مسلمان تھے ہر ایک نے تھوڑا بہت جھوٹ بولا لیکن جہاں تک تقریر کی اجتماعی سپرٹ کا تعلق تھا وہ ٹھیک ہی بیان کی گئی۔

شہزادہ عالم گیر بہت ہنس مکھ تھے اُن کا رویہ عدالت میں بڑا ہی خوشگوار رہا میری طرف سے کوئی وکیل نہ تھا سرکاری گواہوں پر وہ خود ہی جرح کرتے، کورٹ انسکپٹر سے بار بار کہا اب مقدمہ سے فائدہ کیا ہے؟ ملزم کو پہلے ہی پانچ سال کی سزا ہو چکی ہے کورٹ انسکپٹر بھی بُرا آدمی نہ تھا وہ کہتا: جناب ہمارا کیا ہے صوبائی گورنمنٹ نے منظوری دی ہے اسی کے ایمأ پر مقدمہ چل رہا ہے۔

ہر ماہ کے شروع میں ضلعی حکام (ڈی۔ سی اور ایس پی) جیل کا معائنہ کرتے ایک مرہٹہ

نوجوان مسٹر این۔ ایم۔ بُچ ڈپٹی کمشنر تھا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس میاں انور علی تھے۔ جب آنے مزاج پُرسی کرتے میں اللہ کا شکر ہے کہہ کر مسکرا دیتا۔ ایک روز ڈی سی اور ایس پی بے وقت آگئے۔ پنڈت من موہن ناتھ سپرنٹنڈنٹ جیل نے کہا

صرف تمہیں دیکھنے آئے ہیں ـــــ میں نے مسکرا کر کہا:

"ان کی عنایت ہے"

مسٹر بچ نے پوچھا کتنی قید ہے؟"

میں نے کہا ـــ "پانچ سال"

"کلاس کونسی ہے"؟ ـــــ "سی"

"بہتر کلاس کے لئے درخواست نہیں دی۔"

"جی نہیں۔ میری معاشی اور مجلسی زندگی حکومت کے مقررہ معیار سے کمتر ہے۔"

"آپ کا اِس سناٹا میں دل نہیں گھبراتا۔ ہم لوگ تو یہاں کھڑے کھڑے دس منٹ میں گھبرا جاتے ہیں"

میں نے قہقہہ لگایا ـــ "دِل کے گھبرانے کا سوال نہیں مقصد کا شوق اور نصب العین کا سفر آدمی کو مطمئن رکھتا ہے"؟

"آپ اس وحشت کدے میں بھی خوش ہی رہتے ہیں ہم نے آپ کو ہمیشہ ہنستے پایا ہے۔ کبھی غمگین نہیں دیکھا آپ کی عمر کیا ہے؟"

"۲۳-۲۴ برس ہوگی قید رو کر نہیں ہنس کر گزرتی ہے اور اس طرح جلد گزر جاتی ہے۔ قید ہی گزارنا ہے تو رو کر کیوں، ہنس کر کیوں نہیں، انسان کی صحت بھی ٹھیک رہتی ہے"

"آپ کے چہرے پر اطمینان اور خوشی پا کر طبیعت واقعی خوش ہوتی ہے"

"آپ کی مہربانی ہے"

"یہاں کے مقدمہ کا کیا بنا؟"

"ابھی چل رہا ہے"

میاں انور علی کی طرف دیکھا آہستہ سے کچھ کہا میاں صاحب بولے ڈی سی صاحب نے آپ کا مقدمہ واپس لینے کی ہدایت فرمائی ہے وہ آج ہی صوبائی گورنمنٹ کو ڈی او لکھ دیں گے ہفتہ عشرہ تک آپ کا یہ مقدمہ واپس ہو جائے گا۔

"شکریہ" اور ظاہر ہے کہ اس ہمدردی کے جواب میں شکریہ ہی کا ایک لفظ میرے پاس تھا وہ تینوں چلے گئے لیکن میں جج کے اس اخلاقی رویہ پر دیر تک سوچتا رہا رہ کر ایک ہی بات میری سمجھ میں آتی تھی کہ ہندو افسروں میں نیشنلزم کا جذبہ سرایت کر چکا ہے وہ ملازمت کے باوجود ان نوجوانوں کی قدر کرتے ہیں جو ملک کی خاطر قید و بند کو لبیک کہتے ہیں —— ان کے مقابلہ میں مسلمان افسر (الا ماشاءاللہ) زیادہ تر سرکار دولتمدار ہی کے وفادار تھے۔

کوئی ہفتہ بعد مجھے شہزادہ عالم گیر ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے عدالت میں طلب کیا اور مسکرا کر مقدمہ واپس لینے کا حکم سنایا میں نے اُن کے خوشگوار رویہ کا شکریہ ادا کیا دوستوں سے ملا کھلی فضا پر حسرت بھری نگاہ کی اور جیل لوٹ آیا۔ چھ ماہ مقدمہ میں نکل گئے اور اب ساڑھے چار برس تک باہر جانے کا سوال ہی ختم ہو چکا تھا۔

تکرار ہو گئی

آتے ہی شیر سنگھ سے جھڑپ ہو گئی میں نے ڈیوڑھی پہنچ کر مطالبہ کیا کہ اب مجھے ساتھیوں میں بھیج دیا جائے شیر سنگھ نے کہا سوچیں گے؛ میں نے کہا سوچنے کا سوال ہی نہیں اُس نے کہا سوال

موجود ہے میں نے کہا سوال طے ہو چکا ہے جیلر نے کہا آج ہی انسپکٹر جنرل کو لاہور لکھ دیں گے جواب آنے پر اگر منٹگمری میں رکھنے کا حکم ملا تو ساتھیوں میں ملا دیا جائے گا ورنہ جہاں کا حکم ہو گا وہاں بھیج دیں گے ——

"کب تک جواب آئے گا؟"

—— "ہفتہ عشرہ میں فی الحال چھ چکی میں رہو"

ڈیڑھ ہفتہ گزر گیا جواب نہ آیا میں نے تقاضا شروع کیا خیال تھا کہ جواب آ چکا ہے شیر سنگھ شرارت کر رہا ہے اُس نے بہت سی کتابیں روک رکھی تھیں جب مانگو یہی کہتا سی آئی ڈی کے پاس سنسر ہونے گئی ہیں ارمغان حجاز؟ وہ بھی انہی کے پاس ہے ریمائنڈر بھیجا ہے جواب آ رہا ہے مل جائیں گی چودھری مرید احمد (جیلر) نے تاریخ اسلام مصنفہ سید اکبر شاہ نجیب آبادی بھجوائی اُس نے وہ بھی روک لی چودھری صاحب پریڈ پر آئے تو حیران ہوئے کہ اُن کی بھجوائی ہوئی کتاب بھی رُکی پڑی ہے۔ شیر سنگھ سے پوچھا اُس نے آئیں بائیں شائیں کر کے ٹال دیا۔ میں نے کہا

"چودھری صاحب! آپ اس سے اندازہ کر لیجئے کہ اس شخص کا رویہ کیا ہے؟ جب یہ آپ کے ماتحت ہو کر آپ کا حکم نہیں مانتا تو ہم قیدیوں کے ساتھ اس کا سلوک کیا ہو گا" چودھری صاحب سر جھکا کر چلے گئے۔

شیر سنگھ نے ہمیں ویرانے کے سپرد کر رکھا تھا۔ ہر لحظہ ایک خوفناک سناٹا محیط رہتا کئی طرح کے خیالات پیدا ہوتے ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ باہر کیا ہو رہا ہے جنگ کدھر جا رہی ہے کون جیت رہا اور کون ہار رہا ہے بس اُڑتی ہوئی خبریں چلی آتی تھیں کہ ہٹلر تاخت و تاراج کرتا ہوا بڑھ رہا ہے انگریز ہار رہے ہیں یورپ کے بہت سے ملک سپر انداز ہو گئے ہیں روس پر تول رہا ہے۔

سوئیٹزرلینڈ بچا ہوا ہے ترکی جنگ کے دہانے پر ہے۔

اخبارات ہمارے لئے شجر ممنوعہ کا درجہ رکھتے تھے ظاہر ہے کہ اس قسم کی تنہائی سے انسان میں دو طرح کے جذبات پیدا ہوتے ہیں یا تو بزدل ہو کر ہمت ہار دیتا ہے بحمد للہ اپنی چمڑی میں خوف ہی نہیں تھا یا پھر انتہائی دلیر ہو جاتا ہے۔ غصہ بھی آتا ہے اور وحشت بھی ہوتی ہے اللہ والے لوگ اس سے تزکیہ نفس کی برکات حاصل کرتے ہیں خال خال لوگ سلوک و طریقت کی منزلیں طے کر جاتے ہیں۔

شیر سنگھ نے ایک دن میرے سامنے اٹھارہ سیر گندم رکھوا دی میں بھلا کہاں پیستا اور کیوں پیستا؟ لکڑی کا ڈرام جس طرح آیا تھا اُسی طرح پڑا رہا شیر سنگھ نے دن ڈھلے استفسار کیا میں نے رسید تک نہ دی وہ ذرا جھنجلا کے بولا مجھے تاؤ آگیا جھڑپ ہو گئی تو تو میں میں تک نوبت جا پہنچی میں نے غصہ میں آکر بُرا بھلا کہا اُس نے نتھنے پھُلانے شروع کئے میں نے انقلاب زندہ باد اور ہندوستان آزاد کے نعرے بلند کئے وہ بکتا بکتا چلا گیا اگلی صبح پھر اٹھارہ سیر گندم کا ڈرام رکھوا دیا مجھے اب سخت غصہ آیا میں نے حاجی عبدالکریم چیف ہیڈ وارڈر سے کہا آپ سمجھتے ہیں کہ یہ ہاتھ جو قلم و قرطاس کے لئے ہیں اٹھارہ سیر گندم بھی پیس سکتے ہیں؟

وہ کچھ کہے بغیر چلا گیا شیر سنگھ آگیا مہاراج پیسئے نا کیا سوچ رہے ہیں آپ؟

"مہاراج یہ نہیں پسے گی"

"یہ تو پیسنی پڑے گی"

"تو آپ خود تکلیف کر لیجئے"

"SHUT UP!" شیر سنگھ نے بھنا کر کہا۔

"YOU SHUT UP!" میں نے منہ توڑ جواب دیا

اُلٹے پاؤں واپس چلا گیا۔

مار کٹائی

دو چار منٹ ہی میں میانوالی اور ڈیرہ غازی خان کے قیدی نمبرداروں کا ایک جتھہ وارد ہو گیا، تالہ کھولا مجھ پر کمبل ڈالا اور "گدڑکٹ" شروع کر دی "گدڑکٹ" پنجاب کے جیلوں کی اصطلاح میں اُس ظالم مار کو کہتے ہیں جو کسی عاجز یا خودسر قیدی کو پڑتی ہے کوئی دس بارہ نمبردار قیدی پر کمبل ڈال دیتے پھر اُسے ڈنڈوں، جوتوں، ٹھڈوں، اور مکوں سے پیٹتے ہیں جب قیدی مار کھاتے کھاتے بے ہوش ہو جاتا تو اسے تنہائی میں پھینک کر چلے جاتے ہیں ان چھ سات قدآور قیدی نمبرداروں نے پندرہ بیس منٹ مجھے خوب پیٹا حتیٰ کہ مَیں ہلکان ہو گیا ایک نے میرا منہ بند کیا دو نے بازو پکڑ لئے تیسرے نے پاؤں باندھے باقی پیٹتے رہے نکسیر نہ پھوٹتی تو شاید اور مارتے لیکن ادھ مُوا چھوڑ کر چلے گئے کوئی دس منٹ بعد ہوش آیا تو سب اسسٹنٹ سرجن موجود تھا دیکھ داکھ کر چلا گیا ——— کچھ ٹکیاں بھیجیں کچھ ٹنکچر، مَیں نے ٹکیاں اور ٹنکچر لینے سے انکار کر دیا شیر سنگھ پھر آیا مَیں نے پانی کی جھجھر اُٹھا کر سلاخی دروازے سے دے ماری۔ اُس کے سوٹ پر کچھ چھینٹے پڑے بھاگ نکلا مَیں غصہ سے آگ بگولا ہو گیا جو منہ میں آیا کہہ ڈالا ایسے کلمات کہے کہ جیل کے درودیوار گونج اُٹھے جیلر دوڑا دوڑا آیا سپرنٹنڈنٹ بھی آ گیا مَیں نے اُن کو بھی نشانے پر رکھا منہ تکنے لگے مَیں نے چلّا کر کہا تم لوگ اس ظلم میں برابر شریک ہو شیر سنگھ پھر داخل ہوا مَیں دیکھتے ہی آگ بھبھوکا ہو گیا۔

"نکل جاؤ سُور کے بچے"

مَیں نے چکی کا پاٹ اُٹھا لیا تھوڑی ہی دیر میں گارد آ گئی سپرنٹنڈنٹ نے منت سماجت کی جیلر نے ٹھنڈا کیا میرا مطالبہ تھا شیر سنگھ کو یہاں سے نکال دو سپرنٹنڈنٹ نے اشارہ کیا اور وہ نکل گیا مَیں نے غلام حسین شاہ کو بھی آڑے ہاتھوں لیا کہ اس شیطان کو بھی رخصت کر دو وہ بھی چلتا ہوا حاجی عبدالکریم کو

بھی نکلوایا سپرنٹنڈنٹ اور جیلر دونو میرے کمرے میں داخل ہوئے منتیں کیں معافیاں مانگیں اور چند دنوں کے لئے ہسپتال بھجوادیا کچھ کتابیں بھی آگئیں یہاں شیر سنگھ انچارج نہیں تھا بلکہ ایک دوسرا شخص انچارج تھا جو سکھ ہی تھا لیکن شرافت و اخلاق کا پتلا میرے اعتماد کو بحال کرنے کے لئے اُس نے دلجوئی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا شیر سنگھ ہسپتال کے راستہ ہی سے اپنے احاطہ میں جاتا میں نے دو ایک دفعہ آوازے کسے تو راستہ چھوڑ دیا ـــــ آخر میرے اصرار پر مجھے ساتھیوں میں بھیج دیا گیا وہاں ابھی تک شیر سنگھ ہی تھا۔

ہم نہیں چاہتے تھے کہ ہمارا انچارج رہے لیکن اس تمام کٹا چھنی کے باوجود وہ تبدیل نہیں ہوتا تھا سپرنٹنڈنٹ اور جیلر دونوں اُس کے خلاف تھے لیکن بدلتے نہیں تھے خود اس میں غیرت نہ تھی ہم گالی پہ گالی دیئے جاتے، مذاق اڑاتے، علانیہ "منبی سنگھ" کہتے مگر سب کچھ سنتا اور مگن رہتا۔

کامریڈ برہمانند

انہی دنوں کچھ اور ساتھی بھی آگئے۔ علیٰی خیل (میانوالی) کے کامریڈ برہمانند جواب اوکاڑہ میں رہ رہے تھے اور سیالکوٹ کے ودیا ساگر، دونوں بڑے ہی وجیہہ نوجوان تھے برہمانند کے پتّا ایک فقیر منش انسان تھے خان عبدالغفار خان جب پہلی دفعہ علیٰی خیل گئے تو حکومت کے خوف سے کوئی شخص انہیں اپنے ہاں ٹھہرانے کے لئے تیار نہ تھا اس فقیر منش نے جگہ دی نتیجہ یہ نکلا کہ جب بادشاہ خان چلے گئے تو نہ صرف اس کا مکان علاقہ کے خوانین نے جلوا دیا بلکہ ـــ مار مار کر ضلع سے نکال دیا۔ وہ اوکاڑہ میں آکر مقیم ہو گئے برہمانند اس وقت بچہ تھا اور گورو کل میں پڑھ رہا تھا فارغ ہوا تو آبائی وطن دیکھنے کی خواہش میں علیٰی خیل چلا گیا نوجوان خون تھا تقریر جھاڑ ڈالی خوانین نے نہ صرف برہمانند کو پٹوایا بلکہ چوری میں رکھوا دیا ہائیکورٹ نے جاں بخشی کی اس کے بعد اُس نے علیٰی خیل کا کبھی رخ نہ کیا اب وہ اوکاڑہ سے

ایک تقریر میں ماخوذ ہو کر آیا دو سال سزا ہوئی تھی انتہائی دلیر اور بہادر تھا اسی اثنا میں شیر سنگھ نے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت چھ ماہ کا ایک اور قیدی ہم میں لا ڈالا فتح محمد نام تھا کس جماعت سے تھا نہ ہمیں معلوم ہو سکا نہ وہی بتاتا تھا ایسا پڑھا لکھا بھی نہ تھا شکل وصورت سے مشتبہ معلوم ہوتا خیال یہ تھا کہ سی آئی ڈی نے بھجوایا ہے دوستوں سے ہاتھا پائی اس کا شعار ہو گیا۔ بہر حال ہم اُسے منہ نہ لگاتے جب تک میر داد رہا وہ بھی رہا جونہی میر داد کا چالان ہو گیا وہ بھی چلا گیا کچھ معلوم نہ ہو سکا کون تھا؟ کیوں آیا؟ کیسے آیا؟ کہاں چلا گیا؟ ——— کام وام ہم کچھ نہیں کرتے تھے تمام دن خوش گپیوں میں کٹتا کتابوں کے حصول کی کوششیں جاری تھیں لیکن کامیابی کے آثار مفقود تھے۔ اخبارات کا مطالبہ بھی جاری تھا بلکہ ہم نے تو لکھائی کے سامان کا مطالبہ بھی کر رکھا تھا جواب یہ ملتا کہ لاہور سے کوئی جواب نہیں آرہا ہے—— بتیری کوشش کی کسی کھیل کی اجازت ہو جائے مثلاً والی بال کے لئے درخواست کی لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ ہر درخواست معلق ہو جاتی۔ دستی کھیلوں (IN DOOR GAMES) کے لئے ہزار جتن کئے نہ شطرنج ملی نہ تاش نہ لڈو۔ ہر روز آج کل پر ٹالا جا رہا تھا آخر ہم نے کبڈی کھیلنا شروع کی میر داد اور میں اچھے کھلاڑی تھے مگر مولانا گل شیر سب کو مات دے گئے دوسرے درجے پر برہمانند تھا مولانا سے کچھ کچھ لگا کھاتا ایک دو بار اُن کی پکڑ سے بھی نکل آیا تھا اور کسی کے قابو میں نہیں آتا تھا قد چھوٹا عمر کم مگر سب میں دلیر کیمبلپور کا نوجوان نظام الدین بھی کبڈی میں اُتارو تھا مولانا گل شیر ایک متقی، پرہیز گار، غیرت مند، صالح، عبادت گذار، تہجد خوان، کم آمیز، باحیا اور جسور و غیور انسان تھے لیکن کبڈی کھیلتے وقت شیر معلوم ہوتے تھے۔

عطا اللہ شاہ، ڈگلس ینگ، سکندر حیات

شاہ جی کے خلاف گجرات میں ۱۲۱۔ الف کا جو مقدمہ بنایا گیا اس کا سرکاری رپورٹر لدھا رام منحرف

ہو گیا اُس نے عدالت میں بیان دیا کہ میں نے یہ تقریر صوبائی حکومت کی ہدایات پر مقامی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے اشارے سے تیار کی ہے اب میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے کہ میں ایک بے گناہ انسان کے خلاف جھوٹ بولوں اس بیان سے تہلکہ مچ گیا میاں عبدالعزیز اور دیوان چمن لال نے مقدمہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے ڈاکٹر عبدالقوی کی معیت میں پنجاب ہائیکورٹ کے چیف جسٹس سر ڈگلس ینگ سے ملاقات کی تمام قصہ سنایا اُس نے کہا اگر یہ سچ ہے کہ آپ کے خلاف جھوٹے مقدمات بنائے جا رہے ہیں اور سکندر حیات اپنی ذاتی عداوت کے باعث آپ لوگوں کو پھنسا رہے ہیں، تو مطمئن رہیے انصاف مجروح نہیں ہو گا لیکن آپ لوگ بھی تو فوجی بھرتی کے خلاف ڈٹے ہوئے ہیں۔

"اس قسم کے خوفناک مقدموں میں پھنسنے کی بجائے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ میں ایک دو برس قید ہو جانا زیادہ بہتر ہے۔" مولانا نے سوال کو لپیٹ کر جواب دیا ینگ کو یہ بات قدرے دل لگی اُس نے مزید کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا مقدمہ ہائی کورٹ میں منتقل کر لیا۔

سکندر حیات اور ڈگلس ینگ میں کسی وجہ سے کھچاؤ تھا گورنر نے دیکھا کہ نقشہ بگڑ رہا ہے اور اس سے ایک ایسی جماعت کو فائدہ پہنچے گا جو مزاجاً انگریزوں کی دشمن ہے تو اُس نے ینگ کو بلا کر کہا کہ جنگ کے اِن ایام میں سکندر حیات کی رسوائی کا مطلب ہے ایک جگری دوست کی رسوائی، صوبہ بھر میں جنگی مساعی اس کے دم قدم سے ہیں اس کا نقصان اس وقت ہمارا نقصان ہے احرار فطرتاً ہمارے دشمن ہیں اور ان کی تاریخ ہی یہی ہے۔

ینگ "سرانداز" ہو گیا لیکن اُس نے دونوں "وعدے" پورے کئے۔ شاہ جی کو بھی چھوڑ دیا اور سکندر حیات کا دامن بھی داغدار ہونے سے بچا لیا۔ البتہ لدھا رام قید ہو گیا۔

سر ڈگلس ینگ ایک دن منٹگمری سنٹرل جیل میں آنکلا چھ ماہ سے ہماری داڑھیاں بڑھی

ہوئی تھیں بال بھی لٹک گئے تھے کہنے لگا کچھ کہنا چاہتے ہو؟ —— ہم نے کہا جی نہیں کوئی خاص بات نہیں البتہ بال بنوانے کی سخت تکلیف ہے دیکھئے داڑھی کے بال بھی بڑھ گئے ہیں شیو کا انتظام ہونا چاہیئے ینگ نے سپرنٹنڈنٹ کی طرف دیکھا سپرنٹنڈنٹ نے کہا سی کلاس قیدیوں کے لئے کوئی انتظام نہیں بال تو نائی کاٹ جاتا ہے شیو مشکل ہے انسپکٹر جنرل سے اجازت لینی پڑتی ہے ہم نے انہیں لکھا ہے ابھی تک جواب نہیں آیا ینگ نے رُخ پلٹ کر سوال کیا۔

"آپ لوگ جنگی کوششوں کے خلاف ہیں اور اسی لئے قید ہوتے ہیں؟"

"ہم اپنی آزادی کے لئے قید ہوتے ہیں۔"

"آپ کو معلوم ہے یہ جنگ جمہوریت اور فسطائیت کے درمیان ہے ہٹلر جیتا تو تہذیب فنا ہو جائے گی فسطائیت میں پولٹیکل قیدیوں کو گولی ماردی جاتی ہے"

"مارا ازیں چہ قصہ گاؤ آمد و خر رفت"

میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ینگ کے استفسار پر سپرنٹنڈنٹ نے ترجمہ کر ڈالا لال بھبوکا ہو گیا جانے لگا تو ہم نے جواب چاہا بھڑک کر بولا "ہٹلر اُسترا لے کر آرہا ہے بہترین شیو کر دے گا" ہم کھِلکھلا کر ہنس پڑے جاتی دفعہ آفیشل وزیٹر بک میں لکھ گیا کہ پولٹیکل قیدی شوخ اور گستاخ ہیں۔

بدفطرت شیر سنگھ

اُس کے یہ ریمارکس شیر سنگھ کی فطرت کے لئے مہمیز ہو گئے وہ اور بھی شیر ہو گیا اپنی فطرت بدلنے کے لئے نہ وہ تیار ہوا نہ ہم زِچ ہوتے نتیجہ یہ نکلا کہ جانبین میں پہلے کی طرح چونچیں شروع ہو گئیں وہ رعونت دکھاتا ہم اہانت کرتے ہر شخص کی عزتِ نفس کو صدمہ پہنچانا اُس نے اپنے اوپر فرض کر لیا تھا دو چار روز کی چھٹی پر لاہور گیا واپس آیا تو مولانا محمد گل شیر نے

رسماً پوچھا

"لاہور کیسا ہے؟"

"بڑی گہما گہمی ہے دفتر احرار کا بورڈ اور جھنڈا دونو اُتر چکے ہیں مالکوں نے وہاں شراب کی دوکان کھلوا دی ہے۔"

ظاہر ہے کہ شیر سنگھ تحقیر کر رہا تھا۔ مولانا نے احرار کا نہیں لاہور کا پوچھا تھا حکیم غوث محمد کو غصہ آیا ڈانٹ دیا لیکن شیر سنگھ کے لئے اِسی میں مزہ تھا کہ دوسروں کی اہانت کرتا رہے اور خود بے عزت ہو ہم کئی دفعہ ہرا کر بھی اُس کے شکنجے میں تھے عجب عذاب کے دن تھے کتابیں نہ رسالے خط نہ پتر۔ ملاقاتی نہ ملاقاتیں ہم پوچھتے کوئی خط آیا ہے؟ جواب ملتا بالکل نہیں کوئی لکھے تو آئے۔ ملاقاتی؟ ہنستا اور کہتا کس سے ملاقات کو کوئی آتا ہی نہیں؟ قرون مظلمہ کے سے قیدیوں کا حال تھا گویا بلیک ہول میں پڑے تھے قمیصیں ناف تک بازو کہنیوں تک گلے تنگ پاجامے گھٹنوں سے ذرا نیچے اور ٹخنوں سے ڈھیر اُونچے موری چھوٹی جوتا ٹوٹ جائے تو موچی ندارد موچھیں بڑھی ہوئیں داڑھی لٹکی ہوئی بال پھیلے ہوئے اپنی ہی نگاہوں میں کارٹون نظر آرہے تھے سپرنٹنڈنٹ کے وعدے دوشیزہ کی کہہ مکرنیاں ہو گئے تھے۔ تنگ آمد بجنگ آمد ہم نے ایک دفعہ پھر لڑائی کرنے کی ٹھانی فیصلہ کیا کہ سیاسی قیدیوں کے لئے جو روائتیں اور رعائتیں چلی آتی ہیں انہیں حاصل کریں۔ منٹگمری سنٹرل جیل عادی مجرموں کے لئے ہے ہمیں صوبہ بھر کے سیاسی قیدیوں سے الگ رکھا گیا اور جو سلوک یہاں ہو رہا تھا بہیمانہ تھا۔ کوئی سوال کرتے جواب ملتا جیل مینول اس کی اجازت نہیں دیتا ہم کہتے جیل مینول ایک بوسیدہ کتاب ہے جس اندھے شخص نے پون صدی پہلے ترتیب دی تھی وہ لازماً صاحب اولاد نہیں تھا اب اس زمانے میں اسے کہاں لئے پھرتے ہو؟ حکام کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی شیر سنگھ بن بنچھلے پتنگ کی طرح اُڑا پھرتا جب پانی سر سے گذر

گیا اور ہم متفقہ طور پر اس نتیجہ پر پہنچے کہ

(۱) ہمارے ساتھ غایت درجہ بہیمانہ اور وحشیانہ سلوک ہو رہا ہے

(۲) افسران مجاز ہماری جائز باتوں کو بھی قبول نہیں کرتے ہیں

(۳) موجودہ قید تنہائی بلا میعاد ہے

(۴) شیر سنگھ "بیرونی ہدایات" کے تحت ہمیں پریشان کر رہا ہے سپرنٹنڈنٹ اور داروغہ اس کے سامنے بے بس ہیں۔

(۵) ہم بہر حال پڑھے لکھے لوگ ہیں ہمیں نوشت و خواند کے سامان سے محروم کر کے ہم پر وحشت مسلط کر دی گئی ہے۔

تو ہم نے "جرأت رندانہ" کا فیصلہ کیا ہم یہاں تقریباً اسّی فیصد مسلمان تھے باقی اب تین ہندو اور دو سکھ تھے دو میں ایک اکالی تھا۔ کئی روز سوچ بچار کے بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ بھوک ہڑتال کریں۔ مولانا گل شیر مذہباً بھوک ہڑتال کے خلاف تھے صوفی عنایت محمد سہروری نے خرابیٔ صحت کی بنا پر عذر کیا طے یہ پایا کہ سب سے پہلے میں تین دن تک علامتی بھوک ہڑتال کروں اگر جیل کے حکام مطالبات تسلیم کر لیں فبہا نہ تسلیم کریں تو باقی دوست جو بھوک ہڑتال میں شریک ہونا چاہیں ایک ساتھ شامل ہو جائیں۔

بھوک ہڑتال

جیل کے حکام نے پہلے تین دن بظاہر کوئی نوٹس نہ لیا چوتھے روز میر داد خان، احسن عثمانی، برہمانند، عبدالعزیز، غوث محمد، ستیا رام عرف بندے ماترم بھی بھوک ہڑتال میں شامل ہو گئے شرما حضوری میں راجندر سنگھ آتش بھی شریک ہو گیا اب افسروں نے بھی تہلکہ محسوس کیا اور

اُٹھاکر ہمیں چھ چکی میں بند کر دیا "یدھ" ہی ایسا تھا کہ جیل کے حکام لرز اُٹھے اُن کے سان گمان میں نہ تھا کہ بھوک ہڑتال اس طرح چلے گی اور ہم آخر کار جان کی بازی لگا دیں گے سپرنٹنڈنٹ صبح وشام آکر چلا جاتا جیلر منتیں کرتا شیر سنگھ کو ہم گھسنے نہ دیتے ہم نے اُسے ایک گالی بنا دیا تھا۔

وہ اپنے داؤں پر لگا رہا راجندر سنگھ کے بارے میں ہمارا خیال تھا کہ شرما حضوری میں ساتھ ہو گیا ہے لیکن معلوم ہوا کہ شیر سنگھ کے ایما سے بھوک ہڑتال تڑوانے کے لئے شامل ہوا ہے اُس نے ایک آدھ ساتھی کو ورغلانا چاہا مگر کوئی سا ہتھکنڈا نہ چلا شیر سنگھ نے پہلے دن یہ کیا کہ پانی بند کر ڈالا اور کوٹھڑیوں میں سے جھجھریاں نکلوالیں مئی جون کے دن تھے حکیم غوث محمد بیمار چلے آرہے تھے انہوں نے بار بار پانی مانگا لیکن فرات پر یزید کا پہرہ تھا غلام حسین (جمعدار) مُسکرا کے نکل جاتا نمبردار بہرے ہو گئے چوبیس گھنٹے پانی بند رکھا دوسرے روز صبح سویرے سول سرجن اپنے ساتھ دو ڈاکٹر اور نمبرداروں کی ایک کھیپ لے کر آپہنچا شیر سنگھ کا خیال تھا کہ ہم پانی سے گھبرا کر بھوک ہڑتال چھوڑ دیں گے دیکھا کہ وار خطا گیا اور ہمارے حوصلے پہلے سے بھی زیادہ جوان ہیں تو خود ہی جھجھریاں رکھوا دیں ڈاکٹروں نے ربڑ کی باریک نالی کے ذریعے ناک سے دودھ دینا شروع کیا صبح وشام دو سیر دودھ دیا جاتا دودھ میں انڈے ملے ہوتے۔

اِس میں خطرہ بھی ہوتا ہے بھوک ہڑتالی مزاحمت کریں تو بعض دفعہ ناک سے خون آنے لگتا اور اندر زخم ہو کر آدمی موت کے دروازے تک پہنچ جاتا ہے مزاحمت کو روکنے کے لئے قیدی نمبردار بھوک ہڑتالی کو چت لٹا دیتے اور ہاتھ پاؤں پکڑ کے دودھ دیتے ہیں ہفتہ عشرہ بعد بھوک ہڑتال کی خبر شہر میں چلی گئی اخباروں میں چھپا تو حکام پریشان ہوئے سپرنٹنڈنٹ نے دن میں کئی دفعہ پھیرے ڈالنا شروع کئے مطالبہ صرف یہ تھا کہ ہمارے ساتھ انسانی سلوک ہو اور ہمیں وہ تمام مراعات دی جائیں جو سیاسی قیدی کو حاصل ہیں ہم شیر سنگھ کے تبادلے پر زور دیتے

اور کھلی بارک میں رہنا چاہتے تھے۔ بظاہر یہ مطالبات ایسے نہ تھے کہ حکام ضد کرتے لیکن حکام بھی ضد پر تھے اور ہم بھی ہٹ کے پکے تھے دنوں تک کٹا چھنی رہی میں ذاتی طور پر بھوک ہڑتال کو سخت کرکے نہ صرف نتیجہ کو جلد قریب لانے کا متمنی تھا بلکہ جان دینے پر تلا بیٹھا تھا ڈاکٹر بمشکل تمام میرے حلق میں دودھ ڈالتے میں مزاحمت کرتا دیر تک کشمکش رہتی آخر ایک نمبردار مجھے پاؤں سے پکڑتا ایک بازوؤں سے تیسرا دھڑ سے چوتھا چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں بھینچ لیتا نالی ناک میں جاتی اُدھر وہ دودھ دے چکتے اِدھر میں دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو حلق میں پہنچا کر عاعو، عاعو کرتا دودھ باہر آجاتا ڈاکٹر پریشان اور حکام عاجز آچکے تھے بالآخر حکام کو سپر انداز ہونا پڑا کوئی پندرہ دن بھوک ہڑتال رہی تمام جیل گونج اُٹھا۔ باہر تہلکہ مچ گیا سپرنٹنڈنٹ نے تقریباً سبھی مطالبات تسلیم کر لئے۔ شیر سنگھ کو تبدیل کرنے کا فیصلہ ہو رہا تھا کہ راجندر سنگھ آڑے آگیا اس نے کہا آپ محض اس لئے اسے بدلوا رہے ہیں کہ سکھ ہے ہمارے سان گمان میں بھی نہ تھا اب چونکہ ایک سکھ ساتھی سے اُلجھنا مناسب نہ تھا لہٰذا ہم نے اس مطالبہ ہی کو ترک کر دیا لیکن اس کا نتیجہ ہمیں جلد ہی بھگتنا پڑا میری صحت کا حال یہ ہوگیا کہ جیسے مشت استخوان ہو۔ ہوا کا جھونکا سہنا مشکل ہو رہا تھا۔ باقی ساتھی بھی صحت ہار چکے تھے۔ حکیم غوث محمد کی صحت کو بے حد نقصان پہنچا۔ وہ عمر بھر کے لئے دمہ کا شکار ہو گئے۔ افسوس کہ پچھلے دنوں اُن کا انتقال ہو گیا ــــــ اناللہ وانا الیہ راجعون

اب ہم اس حد تک "آزاد" تھے کہ دن رات کھُلا رہتے۔ اخبار بھی آنے لگا لیکن شیر سنگھ عقرب ہی رہا بلاناغہ اخبار کو قینچی سے ذبح کرتا ایک آدھ خبر ضرور کٹی ہوتی۔ بہرکیف لکھنے پڑھنے کا سامان ملنے لگا روٹی اچھی ہوگئی صبح و شام مجلس لگتی آپس میں تبادلہ افکار ہوتا میر داد تمام دنیا میں گھوم آیا تھا روس میں بہت دنوں تک رہا بڑے بڑے انقلابیوں کے ساتھ کام کر چکا تھا اکثر اپنے تجربات سناتا کتابوں کا کیڑا تھا چھ گھنٹے سوتا، سولہ گھنٹے پڑھتا اور دو گھنٹے باقی ضروریات

پر صرف کرتا۔

ایک اور "ساتھی"

ہماری بدقسمتی سے انہی دنوں لدھیانے سے ایک اَور ساتھی کالی چرن شرما آگیا کہنے کو ڈاکٹر لیکن عطائی، ذات کا برہمن لباس کانگرسی ذہن مہاسبھائی چال چلن داغدار، راجندر سنگھ آتش کا ہمنوا! ہم لوگ تو شیر سنگھ سے بولتے نہیں تھے صرف راجندر سنگھ کھسر پھسر کرتا یا اب کالی چرن شریک ہوگیا اپنے برہمن ہونے کی وجہ سے پنڈت من موہن ناتھ سپرنٹنڈنٹ جیل کا معتقد ہوکر معتمد ہونا چاہا پھر جانے کم بخت کو کیا سوجھی ایک دن خود ہی مشقت طلب کی اور چرخہ کاتنے لگا سپرنٹنڈنٹ کے ہفتہ وار معائنہ پر ہم پریڈ نہیں لگاتے تھے اُس نے باقاعدہ پریڈ لگانی شروع کی ٹوکا اور رد کا تو کہا میں آپ کا ساتھی نہیں گاندھی وادی ہوں ہم نے کہا گاندھی وادی یہ نہیں کیا کرتے جو تم کر رہے ہو ہم نے جو کچھ لگاتار جدوجہد سے حاصل کیا اس کو برباد کرنا چاہتے ہو؟ تم نے خوشامد کی ایک نئی راہ کھولی ہے بولا میں برہمن ہوں سپرنٹنڈنٹ جیل بھی برہمن ہیں میں اُن کی خوشامد نہیں تعظیم کرتا ہوں غرض اس قسم کے اشغلے چھوڑنے میں مشّاق تھا ایک دن ہم نے اسکی مرمت کر ڈالی راجندر سنگھ آتش نے ہم سے تیسری دفعہ آنکھیں چار کیں اتفاق سے دو اور سکھ قیدی بھی آچکے تھے انہوں نے ہمارا ساتھ دیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کالی چرن اور راجندر سنگھ کچھ دنوں عیش کرنے کے لئے ہسپتال بھجوا دیئے گئے جہاں انہیں دودھ مکھن ملنے لگا۔ ہم ازسرنو "شیر سنگھی حرکات" کا شکار ہوگئے۔

بہادر دوست

برہمانند کا سرسری ذکر آچکا ہے گورا چٹا رنگ، نین نقش تیکھے، موٹی موٹی آنکھیں، میانہ قد،

چھریرا بدن، گوروکل کانگڑی کا فارغ التحصیل؛ غرض بڑا ہی خوش سلیقہ نوجوان تھا۔ ہم سبھی مل کے روٹی کھاتے وہ سب کے برتن مانجھتا اور کبھی کبھار میرے یا مولانا گل شیر کے کپڑے بھی دھو دیتا۔ یوں بھی کسرتی بدن کا نوجوان تھا کالی چرن اور راجندر سنگھ عمر میں اس سے کہیں بڑے تھے بلکہ قدوقامت میں بھی لیکن دو لٹو اس سے بُری طرح ڈرتے میرے ساتھ اس کا پیار ہو گیا ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے میں نے اُس سے ہندی پڑھنی چاہی نہ پڑھ سکا اُس نے مجھ سے اُردو سیکھی اور کامیاب رہا علامہ اقبال کا کلام مَیں نے اس کے دل و دماغ پر نقش کر دیا تاریخ اسلام پڑھائی مولانا سید سلیمان ندوی کی سیرتی تقریریں (خطبات مدراس) پڑھنے کے لئے دیں۔ مذہبًا وہ آریہ سماجی تھا اور گوروکل کی تعلیم کے باعث ایک سماجی کی عصبتیں بھی اُس میں کسی قدر موجود تھیں لیکن ہماری صحبتوں نے اسے تہذیبی طور پر "مسلمان" کر لیا تھا وہ ہم میں گھل مل گیا اس کی زبان کو ہمارے ہی آداب کی چھاپ لگ گئی تھی۔

شیر سنگھ یا عقربِ جرارہ

شیر سنگھ نے حسبِ معمول مصرع اُٹھانا شروع کیا تو ہم بھی گرہ لگانے لگے ایک دن شراب پی کر آنکلا مولانا گل شیر ٹہل رہے تھے اب کچھ دنوں سے اُنہیں مولانا صاحب کہہ کر پکارتا تھا لیکن آج لہجہ ہی دوسرا تھا۔

"گل شیر اَیدھر آ بھئی" (گل شیر اِدھر آؤ)

مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ مَیں نے بڑھ کے کہا

"سردار جی! مخاطبت کا یہ طریقہ نہیں! مولانا ہم سب کے بزرگ اور ہمارے دینی پیشوا ہیں آپ کم سے کم انہیں خطاب کرتے وقت تو اخلاق سے پیش آئیں۔"

مذہبی سکھ تھا اور پی کے آیا تھا حقارت سے مُسکرایا میں دُرشت ہو گیا اُس نے گالی بکی میں نے تھپڑ دے مارا معاملہ بگڑ گیا جمعداروں کا غول آ پہنچا نمبرداروں نے پرا باندھا وارڈروں نے ڈنڈے اُٹھا لئے داروغہ آ براجا سپرنٹنڈنٹ چلا آیا لیکن یہ لوگ آئے اور چلے گئے کوئی نو بجے شب ہمیں اپنی اپنی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ صبح گنتی کے وقت ہماری چکیاں نہ کھُلیں تو ماتھا ٹھنکا کہ اُفتاد آ رہی ہے تھوڑی سی دیر میں ہر ایک کو ہتھکڑی لگا کر الگ الگ نکالا اور مختلف جگہوں میں بانٹ دیا۔ کوئی پہلے بلاک میں، کوئی دوسرے میں، کوئی تیسرے میں، کوئی چوتھے میں غرض سب کو بکھیر دیا گیا مجھے پہلے نمبر کی چکی میں رکھا گیا جو درجہ اوّل کے بدمعاشوں کے لئے مخصوص تھی اِس اقدام کی نہ کوئی وجہ بیان کی گئی نہ یہ پتہ چلا کہ کون کہاں ہے؟

مَیں نے اپنے آپ کو تنہا پاکر بھوک ہڑتال کی دھمکی دی لیکن شیر سنگھ پر کیا اثر ہوتا؟ پھر کچھ سوچ کر مَیں نے ارادہ ملتوی رکھا اتنے میں نمبردار اُٹھارہ سیر گندم کا بکس اٹھا لایا "پیسو" مَیں نے قہقہہ لگایا اور اپنی کھڈی پر لیٹ رہا دن بھر اِس اچانک اُفتاد پر سوچتا رہا۔ کئی دفعہ جمعدار آیا وارڈر نے ٹوکا نمبردار کہتے رہے کہ لیٹے کیوں ہو؟ چکی پیسو مَیں نے جیسے سنا ہی نہیں شام کو شیر سنگھ پہلے دنوں کی طرح غرّاتا ہوا آیا وہی سوال و جواب

"مہاراج چکی نہیں پیسی"۔

"آج تک نہیں پیسی یہ اخلاقی قیدیوں کا کام ہے"۔

"اچھا تو پھر پاجامے میں سے ناڑہ نکال دیجئے"۔

"یہ نہیں ہو گا۔ آپ خواہ مخواہ اُلجھ رہے ہیں"۔

شیر سنگھ نے نمبرداروں کو حکم دیا کہ ناڑہ نکال لو مَیں نے روکا "خبردار آگے آنے کی ہمت نہ کرنا" شیر سنگھ نے دائیں رخسار پر طمانچہ دے مارا یہ حوصلہ اُس نے پہلی دفعہ کیا تھا حیران رہ گیا معاملہ

کیا ہے؟ میں نے بازو پکڑ کر دھکا دیا نمبر داروں نے فوراً نرغہ میں لے کر مجھے اُلٹی ہتھکڑی پہنا دی شیر سنگھ نے طمانچہ بازی کا شغل شروع کیا میں اُس کی اِس جسارت پہ انگارہ ہو گیا اس کے بھیجے پر ٹکر مارنا چاہی لیکن وہ پھرتی سے دروازہ کے رُخ پر ہو گیا نتیجتہً میرا سر آہنی سلاخوں سے ٹکرا کر پھٹ گیا خون کا فوارہ بہہ نکلا شیر سنگھ اور جمعدار غلام حسین شاہ دونوں باہر نکل گئے نمبردار بھی ہوا ہو گئے نہ کوئی ڈاکٹر آیا نہ کوئی کمپونڈر میں نے خود ہی گیلے پانی کی پٹی باندھ دی تھوڑی دیر خون رِستا رہا پھر بہہ کر خود ہی بند ہو گیا اگلی صبح منہ اندھیرے نمبرداروں کی ایک کھیپ نے مجھے وہاں سے نکالا اور چھ چکی کے کالے پانی میں لے گئے شیر سنگھ بھی آ گیا جمعدار غلام حسین شاہ نے مجھے اُلٹی ہتھکڑی لگا دی نمبرداروں نے کمبل ڈالا اور کچھ کہے سُنے بغیر گدڑ کُٹ شروع کر دی تمام نمبردار ڈیرہ غازیخان کے بلوچ یا میانوالی کے پٹھان تھے میں مار کھا کر ادھ موا ہو گیا ڈاکٹر نے دن بھر اس طرف کا رخ ہی نہ کیا تمام بدن چور چور ہو چکا تھا سارا وقت زخموں سے کراہتا رہا کچھ معلوم نہ تھا کہ باقی ساتھی کہاں ہیں؟ قیاس تھا کہ مختلف احاطوں کی چکیوں میں بند پڑے ہیں غرض یہ دو راتیں اور دو دن تمام قید پر بھاری رہے۔ ملال یہ تھا کہ شیر سنگھ کو اتنی جرأت کیسے ہوئی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا آخر بڑے سوچ بچار کے بعد میں نے بھوک ہڑتال کر دی شیر سنگھ نے حسبِ عادت پانی کی جھجھر اُٹھوالی کھڑی ہتھکڑی لگوا دی اگلے روز ٹاٹ و دری اور اس سے اگلے روز ڈنڈا بیڑی بس صرف حواس کا مجموعہ رہ گیا جیل والے بھی سخت ہوتے گئے سپرنٹنڈنٹ کا پتہ نہ چلا کہاں ہے؟ نہ جیلر آیا ساتویں روز دیکھا کہ میری حالت غیر ہو گئی ہے تو سپرنٹنڈنٹ آ نکلا جیلر بھی آ گیا بیڑیاں وغیرہ اُتروا دیں۔ نالیوں سے دودھ دیا جانے لگا میں نے مزاحمت کی مقابلہ تیز ہو گیا سپرنٹنڈنٹ وہ سپرنٹنڈنٹ ہی نہ رہا تھا اُس کا لہجہ ہی بدلا ہوا تھا کہنے لگا

"اب تم اکیلے ہو اتمہارے ساتھی دوسری جیلوں میں بھجوا دیئے ہیں معافی مانگو گھر جاؤ

غریب آدمی ہو۔ کیا لوگے مدت ہو گئی ہے نہ تمہاری ملاقات کے لئے کوئی آیا نہ کسی نے خط بھیجا جس جماعت سے تمہارا تعلق تھا وہ فنا ہو گئی انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑا تو جن قیدیوں کو گولی سے اڑا دینے کا حکم میرے پاس ہے اُن میں تمہارا نام بھی ہے کیوں حرام موت مرتے ہو؟ مسلمانوں میں تمہیں کوئی پوچھتا نہیں کانگریس کے راہنما تمہارے ویسے ہی خلاف ہیں جان جوکھوں میں ہے "چھٹی لو"

پنڈت من موہن ناتھ کے اس رُوکھے پن پر مجھے رحم آیا کہ آج اس لہجہ میں بول رہا ہے میں نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا صرف اتنا کہا "نصیحت کا شکریہ مجھے مر جانے دیجئے۔"

"تمہاری مرضی"

سپرنٹنڈنٹ یہ کہہ کر چلا گیا۔

گیارہویں یا بارہویں دن جیل والوں نے اپنے فن کی انتہا کر دی میرے دونوں ہاتھ باندھ کر مجھے جنگلے سے لٹکا دیا پاؤں تلے گڑ کا پانی ڈال کر کیڑے مکوڑے چھوڑ دیئے کیوں؟ فرمان خسروی تھا کہ معافی مانگو اور گھر جاؤ۔ میں نے شیر سنگھ کو دوٹوک کہا تمہیں جس نے یہ کہا ہے اس سے کہدو شورش کی لاش یہاں سے نکلے گی معافی نہیں مانگے گا ٹکا سا جواب پا کر واپس ہو گیا تشدد کا زور بندھا تو میں نے قرب و جوار کی اطلاع کے لئے نعرے لگانا شروع کئے بھوک ہڑتال نے آواز کا کرارا پن ختم کر رکھا تھا لیکن دیواریں بولتی تھیں شیر سنگھ نے ایک اور ظلم کیا ایک قیدی کو چھ چکّی میں لاکر غلام حسین شاہ سے اتنا پٹوایا کہ دیواریں لرز گئیں میں نے احتجاج کیا مگر بے سود گرمی کا شباب اور روزوں کے دن قیدی چلاتا رہا۔ شاہ جی! روزے سے ہوں کوئی خطا نہیں کی، مجھے کیوں مارتے ہو مگر شاہ جی شیر سنگھ کی خوشنودی میں جُتتے ہوتے تھے اُس نے واویلا کیا تو اُس کے منہ میں پیشاب ڈالا اُس نے خدا اور رسول کا واسطہ دیا۔ شاہ جی! آل نبی اور اولاد علی ہو روزے

سے ہوں جانے دو رحم کرو، مگر غلام حسین شاہ اس وقت شیر سنگھ کی اولاد بنا ہوا تھا گو میں بھوک ہڑتال سے نڈھال تھا لیکن اس واقعہ نے مجھ میں جان پیدا کر دی میں نے فوراً ہی ہنگامہ برپا کر دیا شاہ جی نے شیر سنگھ کو اطلاع کی وہ دوڑتا ہوا آیا اور حکم دیا کہ اس کے منہ پر بھی توبڑا باندھ دو غلام حسین شاہ نے کھدر کے ایک توبڑے میں گوبر اور براز لپیٹ کر میرے منہ پر بندھوا دیا ہاتھوں میں کھڑی ہتھکڑی، ٹخنوں سے گھٹنوں تک بیڑیاں، منہ پر توبڑا، جی بھوک ہڑتال سے ہلکان، عجیب سماں تھا مہینہ بھر اسی جھمیلے میں نکل گیا خبر باہر چلی گئی خاصا شور مچا احرار نے احتجاجی قرار دادیں شروع کیں سوشلسٹوں نے غل کیا اس بربریت میں بھی قدرت مددگار ہوتی ہے والد سخت پریشان تھے انہیں کسی طرح یہ اطلاع مل گئی کہ میری آنکھیں خراب ہو گئی ہیں پہلے یرقان ہوا پھر آشوب چشم۔ میں نے اطلاع دینا مناسب نہ سمجھا۔ والد کو خط لکھا اس خط میں انہیں حوصلہ دلایا کہ گھبراہٹ کی کوئی وجہ نہیں پانچ سال ہیں بہرحال گذر ہی جائیں گے فرد کی زندگی ملک و قوم کی آزادی کے مقابلہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتی آپ کے دو بیٹے اور ہیں میں نہ رہا تو کوئی بات نہیں سمجھ لیجئے کہ آپ نے فرض کی راہ میں ایک بیٹے کی قربانی دے دی ہے۔

والد سے یہ خط خان غازی کابلی نے لے لیا غازی ان دنوں مہاشہ کرشن کا منشی تھا۔ وہ صبح دم ان کے مکان پر حاضر ہوتا مہاشہ جی ٹہلتے اور لیڈر لکھواتے تھے کابلی نے میرا خط انہیں دکھایا مہاشہ جی بے حد متاثر ہوئے۔ "سکندر حیات خدا سے ڈرو" کے زیر عنوان ایک پرشور شذرہ لکھوایا میرے خط کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ "جب میں نے اس نوجوان کے یہ الفاظ پڑھے تو میرا دل بلیوں اچھلا مجھے مسرت ہوئی کہ اس ملک میں اتنے جری نوجوان بھی ہیں میں سکندر حیات سے کہوں گا کہ خدا سے ڈرو تمہارا بیٹا شوکت حیات اٹلی کی قید میں تھا تو تمہارا خواب و خور حرام ہو رہا تھا تم حال سے بے حال تھے شورش کاشمیری بھی کسی کا بیٹا ہے اس پر یہ ظلم کس لئے اور کب تک؟

سکندر حیات خُدا سے ڈرو"

احرار اور کانگرس

احرار کے معاملہ میں سکندر نے کمال یہ کیا کہ کانگرسی زعماء کی ہمدردیوں سے مجلس کو محروم کر ڈالا۔ کانگرسی زعماء سے کہا احرار راہنما بجائے خود کانگرس کے راستہ میں روک ہیں اور جماعت احرار ایک فرقہ وارانہ تنظیم ہے کانگرس ہائی کمان بھی احرار کو اسی نگاہ سے دیکھتا رہا احرار کے ساتھ اسلام کا لفظ اور تحریک کشمیر یا قادیانیوں کا تعاقب ان کے فرقہ وارانہ ذہن کی دلیل قرار دیا گیا انہی دنوں رائے بہادر مہر چند کھنہ نے جو صوبہ سرحد کی کانگرسی وزارت میں فنانس منسٹر تھا ایک بیان دیا کہ احرار ایک فرقہ وارانہ جماعت ہے اُس نے مہاتما گاندھی کو خط لکھا کہ احرار رضا کاروں کا عسکری نشان کلہاڑی ہے اور کلہاڑی تشدد کا نشان ہے ایک ایسی جماعت کو کانگرس کی اعانت کیونکر حاصل ہو سکتی ہے جبکہ کانگرس کا مؤقف ہی عدم تشدد ہے۔ مہاتماجی نے مہر چند کھنہ کے نقطہ نگاہ کی حمایت کی اس کے نام جو خط لکھا اس نے اخبار میں شائع کرا دیا گوجرانوالہ کے ایک مجسٹریٹ نے انہی دنوں ایک احراری کارکن کے فیصلہ میں لکھا کہ مجلس احرار کے قیدیوں سے پولیٹیکل قیدیوں کا سلوک نہیں کیا جا سکتا وہ ایک مذہبی تحریک ہے اور تشدد پر یقین رکھتی ہے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو پنجاب اسمبلی میں کانگرس کی طرف سے اپوزیشن لیڈر تھے لیکن احرار کے مقابلہ میں سکندر حیات کے دوست، وہ پارٹی کے ذہن پر یہ نقش کرتے رہے کہ احرار کی تحریک مقابلتاً زیادہ خطرناک ہے کیونکہ وہ اسلام کے ذہن سے سیاست میں حصہ لیتی اور کانگرس سے بھی آنکھیں چار کرتی ہے۔ احرار اسلام کو بیچ میں لاکر گفتگو کرتے اور قولاً و فعلاً مذہبی ہیں یہی وجہ تھی کہ جب احرار نے فوجی بھرتی کے مقاطعہ کی تحریک شروع کی تو کانگرس نے اسکی رسوائی اور پٹائی پر چُپ سادھ لی سوشلسٹوں نے ہمنوائی

کی لیکن پنجاب میں وہ کوئی طاقت ہی نہ رکھتے تھے ——————— !

بہرحال مہاشہ کرشن کے تشذرہ نے ہلچل مچا دی سوشلسٹوں نے طوفان کھڑا کر دیا میں نہیں کہہ سکتا اشارہ کہاں سے تھا لیکن جیل کے حکام نے میری بھوک ہڑتال کو فرقہ وارانہ رنگ دینا چاہا تاکہ اُس ہمدردی سے محروم ہو جاؤں جو مجھے اس طرح حاصل ہوئی تھی مسلمانوں کو من حیث القوم اس تحریک ہی سے دلچسپی نہ تھی میں اُن کے لئے کوئی چیز نہ تھا ——— حقیر سا ذرہ

جوابی اقدام

برہمانند نے جب یہ محسوس یا معلوم کیا کہ میری بھوک ہڑتال کو فرقہ وارانہ رنگ دیا جا رہا ہے تو برہم ہو گیا اُس نے جیل کے حکام سے کہا کہ تم لوگ ظلم کر رہے ہو تمہاری فرقہ وارانہ چال مہلک ہو گی میں اس کو کبھی کامیاب نہ ہونے دوں گا اُس نے فوراً ہی بھوک ہڑتال کر دی احسن عثمانی بھی ساتھ ہو گئے جیل خانوں کے انسپکٹر جنرل کرنل پوری نے برہمانند سے بھوک ہڑتال کا سبب پوچھا۔ تو اُس نے جواب دیا میں اس لئے بھوک ہڑتال پر ہوں کہ آپ شورش کی بھوک ہڑتال کو فرقہ وارانہ رنگ نہ دے سکیں میری بھوک ہڑتال اس کے لئے ہے اور اس کی ہم سب کے لئے ہمارے ساتھ جانوروں سے بدتر سلوک ہو رہا ہے شورش اس کا خاتمہ چاہتا ہے وہ بھوک ہڑتال ترک کرے گا تو میں بھی چھوڑ دوں گا۔ اس کے سوا میرا کوئی مطالبہ نہیں احسن عثمانی بھوک ہڑتال کے لئے عرصہ سے پر تول رہا تھا مجبور لاغر ہونے کی وجہ سے رُک گیا شیر سنگھ نے اس کو بھی ذلیل کیا اس کی کتاب "منزل کی طرف" کا مسودہ اُڑا لیا اب وہ مانگ رہا ہے اور شیر سنگھ دے نہیں رہا اُس نے کتاب لکھنے کی اجازت باقاعدہ حاصل کی تھی سی آئی ڈی کو مسودہ بھیجا پاس ہو کر آ گیا مگر شیر سنگھ دبا کر بیٹھا رہا آخر انہی ذلتوں سے تنگ آ کر احسن نے بھی بھوک ہڑتال کر دی۔

بھوک ہڑتال کے چھپن ۵۶ دن

جس روز ان دو نے بھوک ہڑتال شروع کی مَیں ایک مہینہ اور پانچ دن گزار چکا تھا اگلے روز حکیم غوث محمد بھی شریک ہو گئے احسن عثمانی "مدینہ" بجنور کے ادارۂ تحریر میں رہ چکے انصاری دہلی کے ایڈیٹر رہے اور بڑے فاضل انسان تھے اُردو فارسی اور عربی کے عالم تھے انگریزی میں خصوصیت حاصل کر لی تھی شاعر بھی تھے اور خوب شعر کہتے تحریر پر قابو تھا طبیعت میں غصہ نہ تھا لیکن زبان پر تلخ لفظ کبھی نہ لاتے دبلے پتلے لمبے تڑنگے گویا انس پر گوشت کھچا ہوا تھا ہم سب اُن کا احترام کرتے عمر بھی کچھ زیادہ نہ تھی یہی تیس تئیس کے پیٹے میں ہوں گے۔ گھر اُن کا پیلی بھیت کے موضع لکھیم پور کھیری میں تھا کہاں یوپی کہاں پنجاب؟ اور پنجاب میں بھی منٹگمری سنٹرل جیل اُس پر یہ سوہان روح سلوک! ذبیح انہیں دلی سے لاہور کھینچ لائے تھے خیال تھا کہ یہاں اخبار نکالیں گے جنگ چھڑ گئی احرار نے ڈکٹیٹر بنا کر جیل بھجوا دیا۔

ڈاکٹر نے ناک کے راستہ دودھ دینا چاہا معلوم ہوا کہ ناک میں کوئی ہڈی ہے جس سے نالی اندر نہیں جا سکتی اب کیا ہو ڈاکٹر سول سرجن سے مشورہ کرنے چلا گیا شیر سنگھ نے نمبرداروں کو حکم دیا کہ ننگا کر کے نالی مقعد میں دے دو غلام حسین شاہ اور اس کا جھتہ تیار ہو گیا۔ نالی مقعد میں کہاں جاتی زخم ہو گیا لہو نکل آیا احسن نے یہ ظلم کب دیکھا تھا بلکہ جس سانچہ میں وہ ڈھلا تھا اس میں اس کا تصور بھی نہ تھا اس بدسلوکی کے بعد وہ زندہ درگور ہو گیا میری بھوک ہڑتال کو ایک ماہ چھبیس دن ہو گئے احسن عثمانی حکیم غوث محمد اور برہمانند کو بھی اکیس روز ہو چکے تھے۔ آخر صوبائی گورنمنٹ کی ہدایت پر جیل کے حکام سپر انداز ہو گئے ہمارے تمام مطالبات تسلیم کر لئے گئے ہم نے بھوک ہڑتال چھوڑ دی لیکن احسن جب تک جیل میں رہا مرجھایا رہا ہو گیا تو یہ زخم اُس کے دل پر تھا۔ آخر کچھ

دنوں بعد اسی صدمہ اور زخم سے اُس کا انتقال ہو گیا۔ حکیم غوث محمد عوارض کا مجسمہ بن گئے ان کا ایک ہاتھ شل ہو کر ناکارہ ہو گیا پاؤں میں ورم آ گیا اب حال ہی میں اُن کا انتقال ہو گیا ہے بر ہمانند کی مقعد سے کچھ دنوں خون آتا رہا مگر مستقلاً انتڑیوں میں شکایت پیدا ہو گئی پھر پائیوریا نے دانتوں پر چھاپہ مارا مجھے بواسیر ہو گئی مسوں نے سخت تنگ کیا ہر روز پاجامہ خون سے تر ہو جاتا فائدہ یہ پہنچا کہ ہم بہت سی مراعات کے حقدار ہو گئے شیر سنگھ بدلا گیا کتابیں آ گئیں قلم دوات مل گئی لکھا پڑھی کی سہولتیں حاصل ہو گئیں خط آنے جانے لگے ملاقات ہونے لگی رات دن کھُلا رہنے لگے لیکن کچھ دنوں بعد کئی ساتھی اپنے اپنے اضلاع میں چلے گئے چند ساتھی رہ گئے۔ مولانا گل شیر کیمبل پور منتقل کر دیئے گئے کالی چرن لدھیانہ، راجندر سنگھ فیروز پور، صوفی عنایت محمد پسروری راولپنڈی! میر داد خان لاہو بجا رہا تھا کہ چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا کر ہتھکڑی سمیت غائب ہو گیا پولیس نے ہزار جتن کئے ہاتھ نہ آیا۔ جنگ کے دنوں میں انڈر گراونڈ رہا جنگ کے بعد بمبئی میں بحری بیڑے نے بغاوت کی تو اُس میں حصہ لیتا ہوا مارا گیا عقیدتاً کمیونسٹ تھا اشجع، ساونت، انقلابی! کامریڈ بندے ماترم اور رَلیا سنگھ رہا ہو گئے منٹگمری میں ہم پانچ ساتھی رہ گئے۔ احسن عثمانی، حکیم غوث محمد، بر ہمانند، ودیا ساگر اور شورش کاشمیری۔

باہر کی دنیا سے ہم اتنا ہی واقف تھے جتنا سول اینڈ ملٹری گزٹ یا روزنامہ انقلاب سے معلوم ہوتا دونوں اتحادیوں کے پشت پناہ تھے انہی کے نقطہ نگاہ کی خبریں ملتی تھیں اخباروں پر بدستور سنسر تھا صحیح حالات ملنا مشکل تھے۔

منشی احمد دین

اچانک پنجاب سوشلسٹ پارٹی کے مشہور لیڈر اور صوبہ کمیٹی کے جنرل سیکرٹری منشی احمد دین

قید ہو کر ہمارے پاس آ گئے غالباً دو سال قید کی سزا تھی منشی جی نے تحریک خلافت کے زمانے سے سیاسی ہنگاموں میں حصہ لینا شروع کیا تھا تمام سیاسی گوشوں سے واقف تھے قدرت نے خوش آواز بنایا تھا مقرر اعلیٰ درجہ کے تھے بلکہ سوشلسٹوں میں ایک مقرر بھی ان کا ہم پایہ نہ تھا سی کلاس میں اس لئے تھے کہ مسلمان تھے۔ —————— یہاں آ کر انہوں نے سٹڈی سر کل جاری کیا خلافت کی تحریک سے لیکر اس زمانہ تک کی سیاسی تاریخ بیان کر ڈالی جلیانوالہ باغ کے ہنگامہ میں شریک ہوئے تھے چشم دید حالات بیان کئے کانگرس کے نشیب و فراز سمجھاتے بڑے بڑے راہنماؤں کی شخصی سیرت سے آگاہ کیا مہینہ ڈیڑھ مہینہ خاصی رونق رہی ان دنوں عارضی طور پر ہمارے انچارج لاہور کے سید جہانگیر علی شاہ تھے۔ خوش چہرہ خوش خلق خوش مزاج، میں پہلی دفعہ قید ہوا تو وہ بورسٹل جیل میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ تھے۔

اسی دوران پنڈت من موہن کا تبادلہ ہو گیا وہ لاہور بورسٹل جیل کے سپرنٹنڈنٹ ہو کر چلے گئے اُن کی جگہ راجہ گل نواز آ گئے جو مسلمان سپرنٹنڈنٹوں میں سینئر تھے انتہائی خلیق انتہائی شریف اور متشرع، جیلر بدستور چودھری مرید احمد ہی تھے دل اُن کا ہمیشہ ہمارے ساتھ رہا لیکن صدر دفتر سے احکام ہی کچھ ایسے تھے کہ بے بس تھے گل نواز آ گئے تو اُن کی ہمت بھی بڑھ گئی اپنی لائبریری سے کتابیں بھیجنے لگے مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی کی "تاریخ اسلام" پہلے پہل انہی کی عنایت سے پڑھی چودھری صاحب کچھ دنوں بعد سپرنٹنڈنٹ ہو کر گوجرانوالہ چلے گئے جہانگیر علی شاہ بھی تبدیل ہو گئے لیکن شیر سنگھ منٹگمری کے لئے اور منٹگمری اُس کے لئے تھی جس بلاک میں ہم رہ رہے تھے وہ عملاً شیر سنگھ ہی کے چارج میں تھا ان تبادلوں سے دوبارہ وارد ہو گیا کسی قدر پریشانی ہوئی لیکن راجہ گل نواز نے پہلے ہی دن اُسے تنبیہہ کر دی کہ یہ لوگ جس طرح رہ رہے ہیں اس میں کوئی ردوبدل نہ ہو اور تم اپنا پھیرا کم کر دو ہم نے راجہ صاحب کو ملتفت پا کر سارا دکھڑا بیان کیا انہوں نے یقین

دلایا کہ آئندہ کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

مہینہ ڈیڑھ بیتا ہوگا کہ منشی احمد دین کو بی کلاس مِل گئی یہ بی کلاس انہیں راجہ صاحب کی وجہ سے ملی تھی ڈاکٹر گوپی چند بھارگو بعض نظربندوں سے ملنے کے لئے منٹگمری آئے تو راجہ صاحب نے ہمارا ذکر کیا ڈاکٹر صاحب طرح دے گئے۔ البتہ منشی جی کو دفتر میں بلوالیا راجہ صاحب نے منشی جی سے کہا کہ وہ ڈاکٹر صاحب پر زور دیں کہ شورش و احسن کی بی کلاس ہونی چاہیئے ڈاکٹر صاحب نے ان سے وعدہ بھی کیا لیکن لاہور جا کر صرف منشی جی کی سفارش کی ہمیں احرار ہونے کی وجہ سے ترک کر دیا راجہ صاحب نے منشی جی کو ہموار کیا کہ وہ احتجاجاً بی کلاس قبول نہ کریں منشی جی نے ہمارے لئے کلاس مسترد کر دی راجہ صاحب نے ایک تفصیلی نوٹ لکھ کر بھیجا انہیں یقین تھا کہ میری اور احسن کی بی کلاس ہو جائے گی مگر منشی جی نے ایکا ایکی اپنا فیصلہ بدل ڈالا اور بی کلاس قبول کر کے گجرات جیل چلے گئے راجہ صاحب نے ہمیں چکیوں سے نکالا اور آٹھ بارک میں بھجوا دیا یہ ایک کھُلی بارک تھی۔ اس طرح ہم پانچوں اکٹھے ہو گئے اس کا ایک فائدہ یہ پہنچا کہ شیر سنگھ کے چارج سے بھی نکل گئے اب ہمارا انچارج ایک اور سکھ افسر سردار سیوا سنگھ ہو گیا جو بالطبع ایک شریف انسان تھا ماتحت افسر کی آنکھ بھانپ جاتے ہیں ایک تو وہ خود نرم خو تھا دوسرے راجہ صاحب کو مہربان پایا تو اور بھی مہربان ہو گیا جیل تو جیل ہی ہے مگر محسوس یہ ہوا کہ جیسے دماغ سے کوئی بوجھ اُتر گیا ہو راجہ صاحب نے افسر سے زیادہ اِنسان کا ثبوت دیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے ہماری زندگی بچالی۔ عید آئی تو گھر سے کھانا بھجوایا وہ بڑے ہی کم گو انسان تھے بطور سپرنٹنڈنٹ اُن کا بڑا دبدبہ تھا لیکن ہمارے لئے انتہائی شفیق تھے۔

مارکسزم پر کچھ کتابیں ڈپٹی جیلر نے روک لیں۔ راجہ صاحب نے سبب پوچھا اُس نے کہا جناب! یہ لٹریچر کمیونزم سے متعلق ہے کارل مارکس کی تحریریں ہیں راجہ صاحب نے ایک دفعہ

کتابوں کو جستہ جستہ دیکھا کہنے لگے اس میں ہے کیا؛ معاشیات کے مضمون ہیں خیالات ان لوگوں کے جو ہیں سو ہیں ہم انہیں پلٹ نہیں سکتے کتابیں روک لیں تو کیا فرق پڑے گا؛ دماغ ان لوگوں کا مشغول نہ ہو تو جیل میں شرارتیں کرتے ہیں یہی ان کی مشقت ہے کہ پڑھا کریں کتابیں دے دیجئے ان سے کونسی دیواریں ڈھے جائیں گی ڈپٹی جیلر منہ تکتا رہ گیا۔

نیک انسان

مَیں دارالمصنفین اعظم گڑھ اور ندوۃ المصنفین دہلی کی بعض کتابیں پڑھنا چاہتا تھا کوئی پچاس ساٹھ روپے کے لگ بھگ قیمت تھی والد کو لکھا کہ فلاں فلاں کتابیں بھجوا دیں اُدھر وہ بھی اُن دنوں ——— ——— عُسرت کے دن گذار رہے تھے جو کماتے خرچ ہو جاتا۔

والد نے لکھا میرے پاس کونسی ہُنڈی ہے کہاں سے بھیجوں؛ یہ تھوڑا ہے کہ تمہیں قربان کر دیا ہے ڈھائی سال میں ان کا یہ پہلا خط تھا اِدھر انہیں دوہرے تہرے صدمے تھے ایک تو تنگی تُرشی کے دن دوسرا میرا چھوٹا بھائی یورش بیمار تھا تیسرا پولیس والوں نے خاصا پریشان کر رکھا تھا جرم یہ تھا کہ وہ مجھے قابو میں نہیں رکھ سکے طبعاً وہ اس قسم کی کھکھیڑیں اُٹھانے کے عادی نہ تھے۔

راجہ صاحب نے خط پڑھا تو روک لیا اُن کا خیال تھا کہ مجھے صدمہ ہو گا یا مَیں اپنی ہیٹی محسوس کروں گا ہفتہ وار ملاحظہ پہ آتے تو باتوں باتوں میں ان کتابوں کا نام پوچھا دارالمصنفین اور ندوۃ المصنفین کو خط لکھا کہ کتابیں وی پی کر دیں کتابیں آگئیں سیوا سنگھ سے کہا "شورش کو پہنچا دو لیکن اُسے بتانا نہیں کہ مَیں نے منگوائی ہیں یہ کہنا کہ ناشرین کی طرف سے پارسل آیا ہے"۔ ایک روز سیوا سنگھ کے مُنہ سے اصل حقیقت نکل گئی۔

اگلے سال راجہ صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل ہو گئے ہمیں اضطراب ہوا کہ ایک اچھے

افسر سے محروم ہو رہے ہیں۔ یہ تھوڑے سے دن جو شگفتہ ہو گئے تھے ہاتھ سے نکلے جا رہے تھے میں نے راجہ صاحب کے مخفی احسان کا شکریہ ادا کرنا چاہا تو مسکرا کے ٹال گئے پوچھا تمہیں کس نے کہا ہے؟ آخر فرمایا

"گھر والوں کو زندگی بھر کیا دیا ہے قید کا یہ غم! میں نے تمہارا شوق پورا کر دیا ہے" راجہ صاحب چلے گئے لیکن جاتی دفعہ ہمیں آٹھویں بارک سے نکال کر ڈیوڑھی کے ساتھ ایک بلاک میں ڈال گئے۔ یہ بلاک شاہی قیدیوں کے لئے تھا۔ یہاں ہم مقابلتہً "آزاد" تھے۔ مولانا ظفر علی خان جب پہلی دفعہ پانچ سال قید ہوئے تو پہلے آٹھویں بارک میں رہے —— پھر ان کے لئے یہ بلاک بنایا گیا انہوں نے اپنی پانچسالہ قید کے دن یہیں کاٹے تھے یہ ایک طرح کا جذباتی رشتہ تھا جس سے طبیعت مسرت محسوس کرتی —— مولانا سے سیاسی راہیں اب مختلف ہو چکی تھیں تاہم طبیعت پر اُن کی چھاپ موجود تھی اور ذہنی تلمذ بھی تھا قید کی مدت وہی تھی بلاک بھی وہی تھا محسوس ہوتا جیسے مولانا اب بھی ہمارے ساتھ ہیں اس تصور میں بڑی لذت تھی جیل کی لائبریری میں اُن کے وقت کی ایک آدھ کتاب بھی تھی بعض صفحوں کے حاشیہ پر اُن کے قلم سے مصرعے لکھے ہوئے تھے ایک آدھ جگہ سالم شعر بھی تھا ایک کتاب کے تمت بالخیر پر لکھا تھا ؎

بچپن ہی سے لکھی تھی مقدر میں اسیری
ماں باپ کہا کرتے تھے دل بند جگر بند

کرشن لال چوپڑہ

راجہ صاحب کی جگہ فیروزپور ڈسٹرکٹ جیل سے رائے صاحب کرشن لال چوپڑہ آگئے وہ فیروزپور جیل میں پولٹیکل قیدیوں سے اُلجھ چکے اور سرکار سے زیادہ سرکار کے وفادار تھے یہاں

ہمارے بارے میں انہیں علم ہو گیا کہ بڑی بلا ہیں کوئی ہفتہ بھر اِدھر کا رخ ہی نہ کیا پر ڈیڑ پر آئے تو بیورو کریسی کا روایتی غرور ساتھ تھا۔

"تمہارا نام جوان؟"

جیل مینول میں واضح ہدایت ہے کہ قیدیوں کو اس طرح مخاطب کیا جائے کہ وہ مشتعل نہ ہوں جوان کا لفظ اخلاقی قیدیوں کو پکارنے کے لئے بولا جاتا ہے لیکن حاکمانہ غرور نے اس رعنا لفظ کو بھی خوار کر دیا ہے۔

مَیں نے کوئی جواب نہ دیا۔

دوبارہ پوچھا۔

"تمہارا نام جوان؟"

مَیں چپ رہا۔

تیسری دفعہ پوچھا تو مَیں نے کہا

"ٹکٹ پر نام لکھا ہوا ہے"

سپرنٹنڈنٹ کا چہرہ سرخ ہو گیا برہمانند نے کہا

"چوہڑہ صاحب! (یہ اُن کے حاکمانہ غرور پر ایک اور تازیانہ تھا)

یہ بُلانے کا طریقہ نہیں ہم لوگ اِس لب و لہجہ کے عادی نہیں ہیں۔"

چوہڑہ جواب دیئے بغیر چلا گیا۔

سیوا سنگھ نے چوہڑہ سے کہا اِن سے اُلجھنا مناسب نہ ہو گا جس طرح یہ چل رہے ہیں ٹھیک ہے خوامخواہ ایک نیا شوشہ چھوڑنے سے پریشانی ہو گی بات چوہڑہ کی سمجھ میں آگئی نہ ہم اُس

کے لئے "بار" تھے نہ وہ ہمارے لئے بار رہا۔

ساتھیوں کی رہائی

سب سے پہلے احسن عثمانی رہا ہو گئے ان کے جانے سے محسوس ہوا کہ ہم ایک خاص قسم کی علمی فضا سے محروم ہو گئے ہیں۔ وہ ایک منجھے ہوئے ادیب اور شاعر ہونے کے علاوہ سیاسی سوجھ بوجھ کے آدمی تھے ہم انہیں پنجابی میں چھیڑا کرتے یا آپس میں پنجابی بولتے تو وہ سخت احتجاج کرتے اپنی قید کے دن انہوں نے بڑی پامردی سے کاٹے تھے یہی قید ان کے لئے موت کا باعث ہوئی انہیں ہماری تکلیفوں کا احساس تھا باہر جاکر انہوں نے ہمارے حق میں فضا پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن اجنبی تھے بس نہ چلا بھوک ہڑتال نے ان کا سارا ڈھانچہ ہلا دیا تھا۔ مقعد سے خون آتا رہا۔ اپنے گاؤں چلے گئے۔ وہاں جیسا کہ پہلے بیان کیا ہے اس صدمہ کی تاب نہ لاکر واصل بحق ہو گئے۔

ودیا ساگر بھی کچھ دنوں بعد رہا ہو گیا۔ ان دو کی رہائی کے تین ماہ بعد برہمانند کی میعاد قید بھی ختم ہو گئی۔ اب میں اور حکیم صاحب باقی رہ گئے برہمانند کی مفارقت سے جی اُداس ہو گیا ہم دونوں ایک دوسرے کے جذباتی دوست تھے۔ وہ مجھ پر جان چھڑکتا میں اُسے پیار کرتا جس صبح اُسے رہا ہونا تھا وہ رات بھر جاگتا رہا، رہائی کی خوشی فطری ہوتی ہے لیکن مجھ سے بچھڑنے کا اُسے سخت ملال تھا وہ خیال کر رہا تھا کہ جیسے کوئی عظیم صحبت برباد ہو رہی ہے جدا ہوتے وقت اسکی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تھے ہم دونوں ایک دوسرے سے گلے مل کر اس طرح روئے جیسے ساون کی جھڑی لگی ہو۔

یہ ذکر آچکا ہے کہ وہ ایک آریہ سماجی نوجوان تھا۔ گوروکل میں پڑھا اور وہیں نشو ونما پائی تھی۔ اِسلام یا اُردو کے متعلق جو کچھ سیکھا ہم سے سیکھا تھا۔ حضورؐ کی سیرت پر مولانا سید سلیمان ندوی

کے خطبات پڑھ چکا اور ان سے متاثر تھا ارمغان حجاز کا ایک قطعہ عموماً گنگناتا ہے

مسلمان آں فقیرِ کج کلاہے — رمید از سینۂ اُو سوز آہے
دلش نالد چرا نالد نہ دانم — نگاہے یا رسول اللہ نگاہے

"نگاہے یا رسول اللہ نگاہے" اکثر اس کے وردِ زبان رہا یہ مصرع اس کی زبان پر چڑھ گیا تھا۔

اب جو رہا ہونے لگا تو کئی گھنٹہ ہم یکجا رہے یکجا تو پہلے سے تھے مطلب ہے کہ ہاتھ سے نکلتے ہوئے اِن دنوں کو یاد کرتے رہے۔ جیل کی روایت ہے کہ قیدی رہا ہوتے ہی ساتھیوں کو بھول جاتا ہے میں نے یہی اندیشہ ظاہر کیا۔

"یہ کبھی نہیں ہوگا کہ میں تمہیں بھول جاؤں۔"

"کیا اعتبار ہے؟"

"افسوس تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں؟"

"تم پر اعتبار ہے جہاں جا رہے ہو اُس پر اعتبار نہیں۔"

"پاگل ہو گئے ہو۔"

"نہیں وسوسوں کا شکار ہوں"

"اس نے کہا اچھا کان قریب کرو تمہیں اعتماد کی سند دیتا ہوں"۔ میں نے کان قریب کئے تو انتہائی شوق سے کہا "رسول اللہ کی قسم! میں تمہاری یادیں ساتھ لے کر جا رہا ہوں جو کچھ مجھ سے بن پڑیگا کروں گا۔"

"کافر" کی قسم

رسول اللہ کی قسم! "کافر" نے اِس قسم کی لاج رکھی دوستی کا حق ادا کیا پہلے ہی دن اُس نے

ضرورت کی چیزوں کا ڈھیر لگا دیا صابن، تیل، تولیہ، چینی، گڑ، ٹوتھ پیسٹ، برش۔ غرض جو چیزیں سی کلاس کے ایک قیدی کو مل سکتی تھیں اُس نے چھ ماہ کے لئے بھجوا دیں دوسرے تیسرے روز وہ لاہور گیا مسلمان اخباروں کو میری بپتا سنائی انہوں نے ٹال دیا وُہ سرکار کے ساتھی تھے اور جنگی فنڈ سے روپیہ لے رہے تھے۔ زمیندار نے ایک بے ضرر سا نوٹ لکھا البتہ "پرتاپ" اور "ملاپ" نے اِس منتقمانہ سلوک کے خلاف سکندر حیات پر نکتہ چینی کی مہاشہ کرشن نے حسب معمول زور دار شذرہ لکھا برہمانند نے لالہ منوہر لال وزیر جیلخانہ سے ملاقات کرنی چاہی نہ ہو سکی پربھات کے ایڈیٹر مہاشہ نانک چند ناز کو تمام کہانی سنائی وہ تیار ہو گئے چنانچہ برہمانند کو ساتھ لے کر وہ دوسرے یا تیسرے روز لالہ منوہر لال سے ملے اُن سے ماجرا بیان کیا لالہ منوہر لال نے مہاشہ ناز سے کہا کہ شورش کا کیس (CASE) میرے علم میں ہے اخبارات میں جو کچھ لکھا گیا وہ بھی مجھے معلوم ہے لیکن مَیں اس کے معاملہ میں بے بس ہوں آپ سکندر حیات سے مل لیں اس کا معاملہ وزیر اعظم کے ہاتھ میں ہے۔

لالہ منوہر لال نے ہندوؤں سکھوں اور کانگرس کے سیاسی قیدیوں کو ہر طرح کی مراعات دے رکھی تھیں۔ ایک خوانچہ فروش کو بھی اس کی وجہ سے بی کلاس مل گئی تھی کانگرسیوں نے انفرادی ستیہ گرہ کے دنوں میں جیلوں کو بورڈنگ ہاؤس بنا لیا تھا۔ جب چاہا اندر چلے گئے جب چاہا باہر آ گئے۔ فرضی اور حقیقی بیماریوں کی آڑ میں پیرول کا ایک ایسا رواج پڑا کہ جس کا جی چاہا کسی رشتہ دار کی موت کا افسانہ وضع کر کے، یا اپنی بیماری کا نقشہ بنا کر رہا ہو گیا پنجاب میں ایک آدھ مسلمان ہی براہ راست کانگرس میں تھا۔ اُس کو بھی بی کلاس دلوا دی گئی گوپی چند بھارگو سکندر حیات کے چہیتے تھے صرف احرار کو اِن رعائتوں سے محروم رکھا گیا اور اس معاملہ میں دونو متفق تھے مہاشہ ناز نے لالہ منوہر لال سے کہا:

"منٹگمری جیل بدترین قسم کے اخلاقی قیدیوں کے لئے ہے۔ عادی مجرموں کی اس جیل میں کسی سیاسی قیدی کو اس طرح رکھنا زیادتی ہے۔ شورش تین برس سے وہاں ہے اور سی کلاس میں

ہے آخر اس ہولناک تنہائی کو ختم کرنے کے لئے ہی اُسے کسی دوسری جیل میں بھجوادیا جائے لالہ منوہر لال نے انہیں یقین دلایا کہ وہ اس معاملہ میں مجبور ہیں سکندر حیات اشارہ کریں ہر شے ٹھیک ہو جائے گی اُنہیں فی نفسہٖ شورش سے کوئی عناد یا ضد نہیں ہے"

مہاشہ ناز یہ جواب لے کر واپس آگئے۔ بڑے زور کا — اداریہ لکھا۔ برہمانند نے کانگرسی راہنماؤں کو جھنجھوڑا۔ احرار کو آمادہ کیا کہ اپنی کانفرنسوں میں اس کا نوٹس لیں اور حکومت کو مجبور کریں کہ اپنی منتقمانہ ذہنیت کو بدلے غرض اس ایک مخلص نوجوان کی شبانہ روز محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ آب وہوا نے پلٹا کھایا۔

لاہور کی یاد

کوئی تین ماہ بعد ایکا ایکی جیل خانوں کے انسپکٹر جنرل آنکلے معلوم ہوا ہمارے ہی لئے آئے ہیں میرے پاس آکھڑے ہوئے میں حسب معمول چپ تھا پوچھا آپ کا نام؟ میں نے نام بتایا

"آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟"

"جی نہیں"

"کچھ کہنا ہو تو کہہ لو"

میں نے تیوری سے اندازہ کیا۔ غالباً اس لئے آئے ہیں کہ ہمیں کہیں اور بھجوادیں۔ میں نے کہا "یہاں سے بھجوا دیجئے۔"

"کہاں جائیں گے آپ؟"

میرا خیال تھا کہ لاہور تو میرے لئے ممنوع ہو چکا ہے کسی اور جگہ کا نام لوں۔ میں نے سیالکوٹ اور گوجرانوالہ کا ذکر کیا۔ کہنے لگے "ایک دفعہ پھر سوچ لو۔"

میں نے کہا تو پھر لاہور بھجوا دیجئے۔"

کہا بہت اچھا" سر ہلایا اور مسکرا کے چلے گئے

—— بر ہماننند کے بعد چوہڑہ نے ہمیں پہلی چکی میں بھجوا دیا ہم نے عذر کیا چوہڑہ نہ مانا سخت غصہ آیا احتجاج کیا نتیجتہً چکیوں کا ضابطہ ہم پر نہ برتا گیا اور مراعات جو تھیں وہ اسی طرح رہیں پہلی چکی کا وجود ہی دہشت ناک تھا سپرنٹنڈنٹ نے ہمارے خوددارانہ رویے کو اپنی منصبی وجاہت کے منافی سمجھا شیر سنگھ کو پھر سے مسلّط کرنا چاہا ہم نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ ہوا تو ہم جان کی بازی لگا دیں گے سپرنٹنڈنٹ کو جھکنا پڑا شیر سنگھ کے دل میں ان ذلتوں کی وجہ سے گرہ بندھی ہوئی تھی چوہڑہ بھی ہیٹی محسوس کرتا تھا میں ایک دن حوض پر بیٹھا نہا رہا تھا کہ اچانک ایک قیدی نمبردار نے جو سپرنٹنڈنٹ کا اردلی رہا اور ڈیرہ غازی خان کا بلوچ تھا میرے سر پہ ایک موٹا سا ڈنڈا دے مارا میں اس وقت صابن میں "لتھڑا" ہوا تھا۔ میری چیخ نکل گئی اُس نے دوسرا وار کیا۔ میں نے فوراً سنبھالا لیا اور اُس کے تیسرے وار کو اپنے بازو پر روک لیا حکیم صاحب دوڑ کر لپکے

میرے سر سے خون کا فوارہ چھوٹ گیا۔ آن واحد میں شور مچ گیا۔ کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ پس منظر میں سپرنٹنڈنٹ کا ہاتھ تھا شیر سنگھ اور غلام حسین اس شطرنج کے مہرے تھے انہی نے نمبردار کو استعمال کیا تھا میں بھول گیا ان دنوں میانوالی کے ایک اور احرار کارکن خان زمان بھی ہمارے ساتھ آملے تھے انہوں نے نمبردار کو اس بُری طرح پیٹا کہ لہولہان ہو گیا سپرنٹنڈنٹ کو بھی لتاڑا۔ سپرنٹنڈنٹ خوش خوش نظر آرہا تھا اُس نے نمبردار کو ضابطہ کی کوئی سزا دیئے بغیر مظفر گڑھ ڈسٹرکٹ جیل میں بھجوا دیا ہمیں تسلی دینے کے لئے کہتا رہا کہ میں نے اُس کی دو ماہ معافی کاٹ لی اس کی نمبرداری منسوخ کر ڈالی اور اُسے قید تنہائی میں رکھ دیا ہے یہ سفید جھوٹ تھا سازش کا ایک ثبوت یہ تھا کہ جب تک نمبردار حملہ آور رہا کسی جمعدار نے آنا ضروری نہ سمجھا جونہی خان زمان نے نمبردار کو پیٹنا شروع کیا

جمعداروں اور نمبرداروں کا ایک غول آگیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ نمبردار ناک کاٹنے کی فکر میں تھا لیکن اُس کا داؤں نہ لگا۔ یہ ہمیں ایک قیدی حجام نے بتایا جو ہر پندرہویں دن ہمارے بال کاٹنے اور ہر تیسرے روز ہماری شیو بنانے آتا تھا۔ حجام مذکور چوری میں قید تھا لاہور میں میری تقریریں سنتا رہا اور احترام کرتا تھا۔ پہلے اس کو تیار کیا گیا کہ وہ یہ "کارنامہ" سرانجام دے پھر اُس کی ہچکچاہٹ پر اِس نمبردار کو چنا گیا نمبردار نے اس سے دو دفعہ اُسترا لیا لیکن موقعہ نہ ملا پھر سازش کنندگان نے عواقب و نتائج کے خوف یا کسی اور وجہ سے ارادہ بدل لیا غالباً اس صورت میں خود اُن پر ذمہ داری کا بوجھ پڑتا تھا کہ اُسترا آیا کہاں سے؛ چکی میں پہنچا کیونکر؛ نمبردار کی تلاشی کیوں نہ لی گئی؛ وغیرہ اِن چکیوں کا معاملہ اور بھی خطرناک تھا یہ جیل کے اندر جیل تھا اور یہاں ہوا کا جھونکا بھی مشکل سے آتا تھا۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی

ایک دن حجام نے ذکر کیا یا کانوں میں کہیں سے بھنک پڑی کہ افغانستان سے کوئی وزیر قید ہو کر آیا ہے۔ لانبا قد، رنگ گندمی، داڑھی کھچڑی، دراز قبا صبح و شام ساتویں اور آٹھویں بارک میں چہل قدمی کرتا ہے۔ جیل کے حکام اس کا ادب کرتے اور خوف بھی کھاتے ہیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ افغانستان کا وزیر نہیں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ہیں۔ اُن کے علاوہ بہت سے کمیونسٹ اور سوشلسٹ نوجوان بھی نظر بند ہیں۔ مجھ پر نمبردار کے حملہ کی خبر اُن تک پہنچی تو انہوں نے سپرنٹنڈنٹ سے دریافت کیا سپرنٹنڈنٹ مکر گیا مولانا حبیب الرحمٰن اور پریم چند بھسین نہ مانے۔ نظر بندوں نے متفقہ طور پر سپرنٹنڈنٹ کی بات کو ٹھکرا دیا اور اصرار کیا کہ جب تک خود نہ دیکھ لیں اس وقت تک وہ اسکی بات کا اعتبار کرنے کو تیار نہیں۔ وہ تہیہ کر چکے ہیں کہ احتجاجاً بھوک ہڑتال کر دیں گے سپرنٹنڈنٹ پہلے ٹالتا رہا پھر مان گیا مجھے اپنے دفتر میں بلا بھیجا وہاں مولانا حبیب الرحمٰن تھے اور ان کے ساتھ ایک نوجوان جو

فاختئی رنگ کا سوٹ پہنے ہوتے تھا مَیں نے خیال کیا کہ سپرنٹنڈنٹ کا صاحبزادہ ہے لیکن وہ سوشلسٹ پارٹی کے سیکرٹری مسٹر پریم چند بھسین ایم اے تھے۔ مَیں اُن کے چہرے کی شرافت آنکھوں کی سنجیدگی اور لہجہ کی شیرینی سے بے حد متاثر ہوا۔ انہوں نے پوچھا آپ پر جو حملہ ہوا ہے اس میں کسی افسر کا ہاتھ ہے؟ مَیں نے کہا کہ سپرنٹنڈنٹ اور شیر سنگھ دونوں کا ہاتھ محسوس ہوتا ہے۔ اس خیال کی بعد میں تصدیق ہو گئی لیکن مولانا حبیب الرحمٰن چونکہ معاملہ کو طول دینے کے حق میں نہ تھے لہٰذا قصہ ختم کر دیا گیا۔

پریم چند بھسین نے سپرنٹنڈنٹ کو بہت ڈانٹا انہیں یہ بتایا گیا تھا کہ میرا سر بالکل پھٹ گیا ہے اور مَیں مضروب ہو کر ہسپتال میں ہوں! اِس احتساب سے سپرنٹنڈنٹ کو کان ہو گئے اور ہم پہلے سے زیادہ اپنے آپ کو طاقتور سمجھنے لگے۔

تمام نظر بند میری سی کلاس سے پریشان تھے۔ مولانا حبیب الرحمٰن نے گوپی چند بھارگو پر زور دیا کہ اس منتقمانہ ذہنیت کو ختم کرائے لیکن نہ سکندر حیات مانتے تھے نہ گوپی چند بھارگو ہی کو مجھ سے کوئی لگاؤ تھا سپرنٹنڈنٹ (کرشن لال چوپڑہ) میری صاف گوئی پر ناخوش تھا مولانا اور پریم کی ملاقات کے بعد اس کا رویہ مختلف ہو گیا اُس نے ہمارے احاطہ میں آنا چھوڑ دیا مولانا حبیب الرحمٰن بڑے باتدبیر انسان تھے افسروں کو مٹھی میں لے لینا اُن کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا میری صحت دیکھ کر انہیں سخت دھکا لگا سپرنٹنڈنٹ کو مجبور کرتے رہے کہ مجھے دو وقت کھانا بھجوانا چاہتے ہیں سپرنٹنڈنٹ عذر کرتا رہا کہ ایک سی کلاس قیدی کو اے کلاس کا کھانا کیونکر مل سکتا ہے؟ آخر بڑے عذر و انکار کے بعد سپرنٹنڈنٹ مان گیا اچانک بھنا ہوا گوشت اور پراٹھے ملے تو مَیں حیران ہوا مجھے علم نہ تھا بہر حال مَیں نے مولانا کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا سالن اور پراٹھے لوٹا دیئے اور کہلا بھیجا کہ سی کلاس میں رہ کر مَیں ان مراعات کا حقدار نہیں یہ چوری ہو گی اور اگر رعایت دی

جا رہی ہے تو خلاف ضابطہ ہے اور رضاکارانہ قید کے منافی! مَیں نے تین سوا تین برس سی کلاس کی بُری بھلی خوراک کھا کر اپنا ایک ذائقہ بنا لیا ہے۔ اب مَیں اِس خوراک سے اُس ذائقہ کو توڑنا نہیں چاہتا توڑا تو لازماً میرے لئے ایک نئی آفت کا دروازہ کھُل جائے گا آج مولانا یا اُن کے رفقا موجود ہیں کل وہ تبدیل ہو جائیں یا سپرنٹنڈنٹ رعایت واپس لے لے تو میرے لئے پریشان کن ہوگا بہتر یہی ہے کہ جو کلاس اور اس کی خوراک میرے لئے تجویز کی گئی ہے اسی پر اکتفا کروں سپرنٹنڈنٹ میرے اس انکار سے متعجب ہوا اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اپنے ماتحتوں سے کہتا رہا کہ اس کیریکٹر کی مثالیں شاذ ہی ملتی ہیں ہم نے کتنی دِقت سے اجازت دی اور اُس نے کس سرعت سے انکار کر دیا۔

ترنگا لہرایا

ابھی مَیں تبادلہ کے مرحلے میں تھا یعنی لاہور سے تحریری احکام نہیں پہنچے تھے کہ شاہ آباد ضلع کرنال کے بعض ستیہ گرہی چالان ہو کر آ گئے انہوں نے ارادہ کیا کہ دو ایک روز میں چھبیس ۲۶ جنوری آ رہی ہے یوم آزادی منانا چاہیئے یہ کانگرس کی طرف سے آزادی کا دن تھا مَیں نے اختلاف کیا ان کے پاس چھوٹا سا ترنگا جھنڈا تھا جو اپنے کپڑوں میں چھپا کے لائے تھے اُن کا خیال تھا کہ اس روز جھنڈا لہرائیں گیت گائیں اور ممکن ہو تو باہر سے کچھ چیزیں منگوا کر پارٹی کریں مَیں اپنے نقطۂ نگاہ پر قائم رہا اُن سے بہتیرا کہا کہ چوری کا پرچم لہرانا مہاتماجی کی ہدایات کے خلاف ہے افسروں کے علم میں آ گیا تو خواہ مخواہ ایک فساد کھڑا ہو جائے گا لیکن ۲۶ جنوری کو ۹ بجے صبح انہوں نے پرچم لہرا ہی دیا انقلاب زندہ باد کا نعرہ گونجا تو جمعدار بھاگا بھاگا آیا مَیں اُس وقت دھوپ میں بیٹھا قرآن مجید پڑھ رہا تھا اس نے آتے ہی ایک نوجوان سے پرچم چھینا اور پاؤں تلے

روند ڈالا مَیں چونکہ متفق نہ تھا اس لیے علیحدہ رہا تھا اب یہ دیکھا تو مجھے بھی تاؤ آگیا حکیم صاحب جمعدار سے اُلجھ گئے مَیں نے آگے بڑھ کر جمعدار کو دھکا دیا اور اس کے پاؤں تلے سے جھنڈا نکالا فوراً ہی داروغہ آگیا سپرنٹنڈنٹ پہنچا جھنڈا طلب کیا مَیں نے کہا جمعدار نے پرچم کی ہتک کی ہے اب پرچم آپ لوگوں کے حوالے نہیں کیا جا سکتا سپرنٹنڈنٹ نے بہتیرا اصرار کیا ہم نہ مانے بلکہ مَیں نے پرچم کو سینہ سے باندھ لیا سپرنٹنڈنٹ ناکام ہو کر واپس چلا گیا شام کے وقت اُس نے گاندھی بھگتوں کو بلوایا انھوں نے لکھ دیا کہ پرچم حوالے کرنے میں انھیں کوئی اعتراض نہیں مجھے بلوایا اور تحریر دکھائی مَیں حیران رہ گیا سپرنٹنڈنٹ نے کہا حیران یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں مجھے معلوم ہے کہ تم اس کے حق میں نہ تھے لیکن ایسے ساتھیوں کو ساتھ لے کر لڑنا دانائی نہیں۔

القصہ پرچم ان کے کپڑوں میں جمع ہو گیا مالخیرہ شما سلامت' یہ تیسرا تجربہ تھا پہلا تجربہ اسکول کی زندگی میں لالہ لاجپت رائے کے وہھانت پر ہوا اس کا ذکر آچکا ہے دوسرا قید کے آغاز میں ہوا ساتھیوں کو اصرار تھا کہ ہر روز اکٹھے ہو کر انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگایا کریں۔ ہم لوگ جو پہلے ہی کافی تجربے کر چکے تھے اس کے موافق نہ تھے ہم نے کہا جیل جلسہ گاہ نہیں نو وارد ساتھی نہ مانے ہر روز شام کو نعرے لگانے لگے جیل والوں نے بہتیرا سمجھایا کہ یہ چیز ٹھیک نہیں کوئی نہ رُکا ڈپٹی کمشنر نے سپرنٹنڈنٹ کو لکھا کہ ان نعروں کو روکو جب ان کی منت سماجت کام نہ آئی اور ساتھی اپنے سیاسی زعم میں بے قابو ہوتے گئے تو ایک دن صبح سویرے ڈپٹی کمشنر سپرنٹنڈنٹ پولیس اور سپرنٹنڈنٹ جیل مسلح گارد لے کر آ گئے سب کو ایک قطار میں کھڑا کیا سپرنٹنڈنٹ نے للکار کر پوچھا تم میں سے کون نعرہ لگاتا ہے ہر کوئی چپ رہا دوبارہ پوچھا خاموشی کے سوا کوئی جواب نہ تھا دو چار دفعہ دھمکا کر سوال کیا مگر سب یوں تھے جیسے منہ میں زبان نہیں۔ سپرنٹنڈنٹ نے طعنے دینا شروع کیے بس یہی حوصلہ ہے اب بولو، کیوں نہیں بولتے؟ مَیں قطار کے آخر میں کھڑا تھا سپرنٹنڈنٹ کے

اشتعال دلانے سے غصہ میں آگیا قطار سے نکلا اور سپرنٹنڈنٹ کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"جناب میں لگاتا ہوں"

"تم"

"جی ہاں"

سپرنٹنڈنٹ کا رنگ متغیر ہوگیا۔ اُس نے درشتی سے کہا

"تم؟"

"جی میں نعرے لگاتا ہوں"

"پھر لگاؤ گے؟"

"وقت پر لگاؤں یا ابھی؟"

"شاباش! تمہارے حوصلے کی داد دیتا ہوں لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم نعروں کے خلاف ہو اور تم نے کبھی اِن کا ساتھ نہیں دیا محض ساتھیوں کا وقار رکھنے کی خاطر ذمہ داری لے رہے ہو۔"

جیل والوں کے علم میں تھا کہ نعرہ بازی کا لیڈر کون ہے چنانچہ پانچ چھ ساتھیوں کو اُسی وقت بیڑیاں پہنا کر مختلف جیلوں میں بھجوا دیا گیا یہ واقعہ ملتان جیل کا ہے۔

دن کٹ گئے

منٹگمری جیل کے دن ختم ہو رہے تھے میں لاہور کی فکر میں تھا مصیبت کے دن ہمیشہ ہی پہاڑ معلوم ہوتے ہیں اور جب نکل جاتے ہیں ——————— اور معلوم ہوتا ہے جیسے سَن سے نکل گئے ہوں۔ آخر عجیب و غریب سی یادیں رہ جاتی ہیں۔

عام قیدیوں سے میل ملاپ ناممکن تھا اگر بھولے سے کوئی اخلاقی قیدی ہم سے بات کر لیتا تو اُسکی

خیر نہ تھی ہم نے تین سوا تین برس اس طرح کاٹے جیسے اندھے غار میں پڑے ہوں۔ کیا کیا تجربے نہیں ہوئے ؟ کیسے کیسے دکھ نہیں اُٹھاتے ؛ نفس کے واردات عجیب ہوتے ہیں دماغ و دل پر خیالات کے قافلے گذرتے رہے قید کا جو تصور یا تصویر جیل مینول میں ہے یہ دن گویا اُس کا نقطۂ عروج تھے ع

ہم اس طرح تھے جیسے ہمارا خدا نہ تھا

ہم نے بڑے جی گُردے سے مصائب کا مقابلہ کیا کرنل پوری کیمبل پور کا تھا مولانا گل شیر بھی کیمبل پوری تھے ایک دفعہ انہوں نے کرنل پوری سے کہا کہ آپ لوگوں نے ہمیں اِس کالے پانی میں کیوں رکھا ہے ؟

"آپ کو (میری طرف اشارہ کر کے) اس لڑکے کی وجہ سے یہاں رکھا ہے چونکہ وزارت اسے عام سیاسی قیدیوں میں رکھنا نہیں چاہتی لہٰذا اس کی رفاقت کے لئے کچھ ساتھی یہاں رکھ دیئے ہیں"

مولانا نے کچھ اور کہنا سننا مناسب نہ سمجھا اور نہ وہ قید میں سوال و جواب کے عادی ہی تھے۔

مولانا محمدؐ گل شیر

جن علماء کے ایثار و استقامت کا تذکرہ کتابوں میں پڑھا ہے اور ان پر حیرت ہوتی ہے کہ اس جی گردے کے لوگ بھی ہو گزرے ہیں مولانا گل شیر ان کی ہو بہو تصویر تھے تحریک مجاہدین کے شرکاء کی خوں گونیوں سے قربانی و ایثار کی جس عظمت کا احساس ہوتا ہے مولانا گل شیر میں اس عظمت کا یہ وصف بکمال و تمام موجود تھا۔ وہ صحیح معنوں میں صحابہ کی جرأتوں اور جسارتوں کا نمونہ تھے۔ وہ اخلاق، حیا، شرافت، زہد، تقویٰ، عبادت، نیکی، قربانی کی ایک ایسی تصویر تھے کہ چراغِ جستجو لے کر نکلیں

تو بھی اس قسم کے انسان ملنا مشکل ہیں۔ قرآن نے جس صبرِ جمیل کی تلقین کی ہے اور استقامت کا جو نمونہ حضورؐ نے پیش کیا تھا مولانا اُس اسوۂ حسنہ کا عکس تھے جانتے ہی نہیں تھے کہ شکایت کیا ہوتی ہے؟ صوم و صلوٰۃ کی پابندی فطرتِ ثانیہ تھی ایک چوتھائی رات باقی رہتی تو اُٹھ بیٹھتے مصلّیٰ پر چلے جاتے قرآن پاک اس گداز سے پڑھتے کہ حرف حرف دل پر نقش ہوتا چلا جاتا محسوس ہوتا کہ دل کی سنگینی موم کی طرح پگھل رہی ہے بوٹا قد، صاف کھلا رنگ، موٹی موٹی آنکھیں، پٹے دار بال جن میں کنپٹیوں کی طرف کنڈل بنے ہوئے تھے چوڑا چکلا سینہ، بھرواں جسم، کشادہ ماتھا، لہجہ میں مٹھاس، پنجابی بولتے اور اس بانکپن سے بولتے کہ دل موہ لیتے تھے ایک دن احرار میں اپنے شمول کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا "مَیں کیمبل پور اور میانوالی کے عام مولویوں کی طرح ہی کا ایک مولوی تھا وعظ کیا روٹی کمائی اور کھائی مَیں نے مدۃ العمر انگریز دشمن علماء کا تعاقب کیا اور انہیں اپنے علاقہ میں پھیلنے پھولنے نہ دیا شاہ جی یا مولانا حبیب الرحمٰن جب کبھی اس علاقے میں احرار کی دعوت لے کر آتے مَیں مسلسل دورے کر کے ان کے اثر کو زائل کر دیتا جس سال حج کا شرف نصیب ہوا مَیں نے روضۃ النبیؐ پر خواہش کی کہ مَیں کس جماعت یا گروہ میں کام کروں؟" مولانا نے فرمایا "اس دعا کے بعد میری آنکھ لگ گئی دیکھا حضورؐ فرما رہے ہیں احرار میں چلے جاؤ حج سے لوٹا تو احرار میں شمول کا اعلان کر دیا موجودہ قید اس شمول کی پہلی آزمائش ہے" تب سے کیمبل پور اور میانوالی کے خوانین پریشان تھے ایک رات اپنے گھر کی چھت پر سو رہے تھے کسی نے گولی مار کر شہید کر دیا اور اس طرح اس ویرانہ آباد میں استقامت کا ایک چراغ روشن ہوتے ہی بجھ گیا۔

صوفی عنایت محمدؐ پسروری

قید کے ان رفقا میں صوفی عنایت محمد پسروری بلا کے آدمی تھے "جوہر وسمہ مہندی" کے موجد

تھے رزق حلال کماتے اور رزق حلال کھاتے بارہا قید و بند کی صعوبتیں سہیں بڑے ہی بہادر انسان تھے جہاں کہیں حکومت سے ٹکر ہوتی پیش پیش ہوتے کوئی پندرہ سولہ برس قید کاٹی پیر جماعت علی شاہ کے مرید تھے لیکن حوصلہ و اعتقاد عام مریدوں سے مختلف پایا تھا تحریک خلافت میں قید رہے کانگرس کی سول نافرمانی میں جیل گئے تحریک کشمیر میں اندر ہو گئے کوئی سا موقعہ ہو جیل ضرور چلے جاتے ــــــ شہید گنج میں نظر بند ہو گئے قادیانی نبوت کے تعاقب میں تعزیر و صعوبت کو لبیک کہا جنگ چھڑی تو راولپنڈی کی جامع مسجد میں کھڑے ہو کر فوجی بھرتی کے خلاف تقریر جھاڑ ڈالی پکڑے گئے عدالت نے پوچھا

"یہ تقریر کی ہے؟"

"جی ہاں"

"آپ کو معلوم ہے کہ یہ ضابطہ دفاع ہند کی رو سے جرم ہے"

"میں اللہ اور اللہ کے رسول کے احکام کے سوا کسی ضابطے کو نہیں مانتا۔"

جانے مجسٹریٹ نے کیا کہا تعزیرات ہند کا نسخہ اُٹھایا پاؤں کی ٹھوکر پہ رکھا اور کہا کہ کلام اللہ کے مقابلہ میں اِس کے احکام جوتی کی نوک کے قابل بھی نہیں ہیں۔

مجسٹریٹ نے چار سال قید کا حکم سنایا بڑے لاغر تھے۔ اس قید نے ان کا انجر پنجر ہلا ڈالا رہا ہوئے تو عوارض کا شکار تھے اللہ کو پیارے ہو گئے۔

دوسرے ساتھی

احسن عثمانی کا قصہ پہلے آچکا ہے اِن کی مقعد میں شیر سنگھ نے دودھ کی جو نالیاں دی تھیں اُس کے زخم اور احسن کی غیرت دونو جان لیوا ہو گئے۔ قید گزارنے کے بعد گھر پہنچے

بیمار ہوئے اور ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

برہمانند نے میری حمایت میں بھوک ہڑتال کی تو شیر سنگھ نے اس کے ساتھ بھی بدسلوکی کی ہاتھ بندھوائے چوتڑوں پر گڑ کا پانی ڈالوایا کیڑے چھوڑے اور سلیپروں سے آہستہ آہستہ پٹوایا یہ زخم اس کی بیماری کا حصہ ہو گئے وہ نشست جما کر بیٹھ نہ سکتا تھا۔

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی چاہتے تھے کہ ان کے ساتھ جیل میں رہوں انہوں نے بڑے جتن کئے سپرنٹنڈنٹ سے کہا انسپکٹر جنرل کو لکھا سر منوہر لال پر زور دیا لیکن ان کی استدعا مسترد ہوتی رہی۔

مولانا بادشاہ طبیعت کے انسان تھے کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا اللہ ہی تمام ضرورتیں پوری کرتا کھاتے بھی اور کھلاتے بھی بہادر اور اشجع تو تھے ہی سچی بات دار کے تختہ پر بھی کہہ جاتے خوف پاس سے نہیں گذرا تھا جیل میں اُن کا بڑا دبدبہ تھا مطالعہ کا بے حد شوق تھا گفتگو دو ٹوک کرتے چھوٹے چھوٹے فقرے کھری کھری باتیں شاہ ولی اللہ سے متعلق ابتدائی معلومات انہی سے حاصل کی تھیں "الفرقان" بریلی کا ولی اللہ نمبر بھجوایا اور کہلا بھیجا کہ اس کو سبقاً سبقاً پڑھو مکتوبات امام ربانی بھی انہی سے لے کر پڑھے اور امام غزالی کی احیاء العلوم بھی! ایک دن مجھے کہلوا بھیجا کہ سکندر حیات کو چٹھی لکھو کہ مجھے قرآن مجید اور اس کا ترجمہ پڑھنا ہے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی حسن اتفاق سے یہاں موجود ہیں اجازت دی جائے سپرنٹنڈنٹ نے درخواست لیکر انسپکٹر جنرل کو بھیج دی انسپکٹر جنرل نے حکومت سے پوچھا اوپر سے ہدایات تھیں کہ شورش اور مولانا آپس میں ملنے نہ پائیں۔ اس درخواست کو ٹھکرانا مشکل تھا جواب آیا کسی اخلاقی قیدی کا انتظام کرو پنجاب کی تمام جیلوں میں ڈھنڈوایا گیا ایسا کوئی شخص نہ ملا جو قرآن مجید ترجمہ سے پڑھا سکتا ہو سپرنٹنڈنٹ نے حکومت کو لکھا اور ساتھ ہی میری دوسری درخواست بھجوادی درخواست میں درج تھا کہ مسلمان کو قرآن پاک پڑھنے سے محروم رکھنا سراسر

شقاوت و معصیت ہے میں اس دولت و نعمت سے محروم رہا تو قیامت کے دن سکندر حیات اللہ تعالیٰ کے ہاں جوابدہ ہوں گے جواب آیا کہ باہر سے کوئی معلم رکھ دیا جاتے ابھی یہ معاملہ چل ہی رہا تھا کہ مولانا حبیب الرحمٰن کو اُٹھا کر دھرم سالہ سب جیل میں بھیج دیا گیا کوئی ہفتہ عشرہ بعد مجھ سے کہا گیا کہ دھرم سالہ جانا چاہو تو جا سکتے ہو میں لاہور کے لئے تیار تھا سپرنٹنڈنٹ سے پوچھا کہ انسپکٹر جنرل نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ ارادہ نہیں بدلا استفسار کیا ہے وہاں مولانا کو ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ تم جانا چاہو تو جا سکتے ہو؟ اس حیص بیص میں اور دو ہفتے نکل گئے۔

نظر بندوں کی بھوک ہڑتال

انہیں دنوں صوبہ بھر کے نظر بندوں نے جو یہاں مجتمع تھے بھوک ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ

(۱) ہمیں جرم کی نوعیت سے مطلع کیا جاتے؟

(۲) درجاتی امتیاز کو ختم کیا جائے۔

(۳) تمام سیاسی نظر بندوں کو یکساں مراعات دی جائیں۔

(۴) ہر نظر بند کو اے کلاس میں رکھا جاتے اور اس کا وظیفہ مقرر ہو۔

(۵) صوبہ بھر کے نظر بند ایک ہی جگہ رکھے جائیں۔

جب پچاس ساٹھ نظر بندوں کی طرف سے حکومت کو یہ خط ملا تو ہلچل مچ گئی۔ یہ ہمارا معاملہ نہیں تھا کہ اپنی ہی جان کے سوا کوئی معاون نہ تھا ہر چکی کے دو پاٹ ہوتے ہیں جس چکی میں احرار پس رہے تھے اُس کے تین پاٹ تھے۔ ہندو، احرار کو فرقہ پرست کہتے مسلمان ہندو پرست اور انگریز تشکم پرست، اللہ تعالیٰ علیم و بصیر ہیں کہ ان طعنوں مہنوں کی حقیقت کیا ہے؟ اور جن لوگوں

کی زندگیوں میں قرنِ اول کے صحابہ کی زندگیوں کا عکس تھا وہ کس حد تک اس الزام کے سزاوار ہیں۔

انسپکٹر جنرل دوڑا دوڑا آیا منوہر لال پہنچا چھوٹو رام نے دو پھیرے ڈالے تینوں نے منتیں کیں لیکن نظربند تہیہ کر چکے تھے کہ مطالبات منوا ہی کے دم لیں گے بھوک ہڑتال ہو گئی ہندو اخباروں نے سر پہ آسمان اُٹھا لیا ملک بھر میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔

مہاتما گاندھی نے ایک بیان میں کہا کہ حکومت نوجوانوں سے بدسلوکی کر کے انہیں دہشت پسند بنا رہی ہے اگر ملک کے پڑھے لکھے نوجوانوں کے ساتھ اخلاقی قیدیوں کا سا سلوک ہوتا رہا تو وہ بے قابو ہو جائیں گے انہوں نے حکومت کو انتباہ کیا کہ ان نوجوانوں کی شکایات کا بروقت تدارک نہ کیا گیا تو وہ ملک کے عام نوجوانوں کو دہشت پسندی کے راستہ پر گامزن ہونے سے روک نہ سکیں گے یہ ایک پہلو دار نشانہ تھا جو خطا نہ گیا حکومت کو پندرہ دن کے اندر اندر سپر انداز ہونا پڑا نظربندوں کے تمام مطالبات تسلیم کر لئے گئے لیکن ایک وار بھی ہو گیا ملک بھر کے کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کو جو نظربند کی حیثیت سے قید تھے راجپوتانہ —— میں دیولی کے مقام پر نظربندوں کے ایک کیمپ میں بھیج دیا گیا جو فوجی انتظام کے ماتحت، جنگی قیدیوں کے طرز کا ایک ویرانہ آباد تھا۔ یہاں نظربندوں نے کچھ عرصہ بعد اس سوال پر بھوک ہڑتال کر دی کہ انہیں اپنے اپنے صوبے میں منتقل کیا جائے۔

سبھاش چندر بوس

جنگ کا حال یہ تھا کہ انگریزوں کو مختلف محاذوں پر پے در پے شکستیں ہو رہی تھیں —— سبھاش چندر بوس کلکتہ سے فرار ہو چکے تھے۔ پنجاب کی سی آئی ڈی کو اپنی "ذہانت" پر بڑا ناز رہا ہے لیکن سبھاش کلکتہ سے نکل کے لاہور پہنچے یہاں ایک رات اُس کمرے میں رہے جو اس وقت ایڈیٹر چٹان کا دفتر ہے۔ اگلی صبح سرحد پہنچے سرحد سے قبائلی علاقہ پار کیا افغانستان چلے گئے اور

افغانستان سے برلن چلے گئے ملک کو کچھ خبر نہ تھی آزاد ہند فوج بن چکی تھی انگریز اندر خانہ ہلا ہوا تھا کہ فوج کو بھی انقلاب کی ہوا لگ گئی ہے نظر بندوں کو قدرتی طور پر احساس تھا کہ انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑا تو وہ انہیں اس دور افتادہ علاقے میں گولیوں سے اُڑا دیں گے مرنا ہے تو اپنے اپنے صوبے میں چلے جائیں ممکن ہے حالات کروٹ لیں اور کوئی دوسری شکل پیدا ہو۔ تمام ہندوستان بھوک ہڑتال کی پشت پناہ ہو گیا مرکزی اسمبلی میں شور مچنے لگا جلسے جلوس شروع ہو گئے غرض حکومت ہل گئی اور نظر بندوں کو ان کے صوبوں میں منتقل کر دیا گیا۔

چودھری افضل حق کا انتقال

حافظہ کی بات ہے وقت کا تعین مشکل ہے منٹگمری جیل ہی میں اطلاع ملی کہ چودھری افضل حق کا انتقال ہو گیا ہے۔ چودھری صاحب احرار کا شہ دماغ تھے ان کا سیاسی حلقوں میں احترام بھی تھا اور خوف بھی وہ ایک صحیح العقیدہ مسلمان تھے۔ نگاہ بڑی دوررس تھی اس خیال پر بڑی پختگی سے قائم تھے کہ اسلام کو جو ضعف پہنچا ہے اسکی ایک وجہ تو مذہب کی حقیقی روح سے مسلمانوں کی برگشتگی ہے دوسری وجہ سرمایہ داری کا وجود ہے جس سے نہ صرف اسلام کی نشو و نما رک گئی ہے بلکہ عجمیوں کی سازش سے سرمایہ داری ہی اصل دین ہو گئی ہے ان کا عقیدہ تھا کہ جاگیرداری اور سرمایہ داری نے مسلمانوں کو ایک زبوں حال قوم بنا دیا ہے۔ وہ ایک ہی تقسیم کے قائل تھے اور وہ دولت کی منصفانہ تقسیم! سر فضل حسین نے چودھری صاحب کو شیشہ میں اُتارنے کی بڑی کوشش کی برادری کا واسطہ دیا مگر چودھری صاحب مختلف دل و دماغ لے کر پیدا ہوتے تھے وہ ذاتی ایثار اور شخصی عظمت کے لحاظ سے قرن اول کے صحابہ کی نظیر تھے۔ سکندر حیات انہیں اپنے لئے خطرہ سمجھتے رہے حکومت کی منشا بھی یہی تھی کہ احرار ختم ہوں

انگریزوں نے مسلمانوں کے جن گروہوں کو مٹانا چاہا احرار اُن میں سرفہرست تھے کچھ ہی کہہ لیجئے پنجاب میں احرار سے بڑھ کر کوئی گروہ انگریزی استعمار کا دشمن نہیں رہا اور چودھری افضل حق تو بُری طرح سامراج کے جان لیوا تھے ان کی صاف گوئی کا یہ حال تھا کہ کانگرس اور لیگ دونوں کے منہ پر کھری کھری کہتے انہوں نے اپنے آخری خطبہ میں دونوں جماعتوں کے سرمایہ داروں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ لیگ کا سرمایہ دار ایک مفلوج طاقت ہے اُس نے جو طاقت اُڑائی ہے وہ مسلمان عوام کی طاقت ہے اور مسلمان عوام کو ہندوؤں کی معاشی ناانصافی اور مجلسی چھوت چھات سے بجا طور پر شکایت ہے یہی شکایت دو علیحدہ قوموں کا تصور پیدا کرتی ہے وہ کانگرس کے سرمایہ دار کو مقابلتہً زیادہ خطرناک سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندو سرمایہ دار چونکہ ایثار کرتا اور قربانی دیتا ہے اس لئے ملک کی حیات سیاسی کے لئے زیادہ مہلک و مضر ہے اس سرمایہ داری ہی نے ملک کی انقلابی طاقتوں کا راستہ روک رکھا ہے۔

——— یونی نسٹ وزارت برطانیہ کی سیاسی داشتہ تھی اُس نے احرار کو کچل ڈالا، چودھری صاحب جیل ہی میں موت کے دروازہ تک پہنچ گئے دم اُلٹا آخری وقت آپہنچا تو رہا کر دیئے گئے آخر صحت ہی کی تلاش میں جان ہار ہو گئے۔

مرافعے

انہی دنوں لاہور ہائی کورٹ کے نیشلسٹ وکلاء نے کانگرسی قیدیوں کے از خود مرافعے شروع کئے رہائیوں کا ایک سیلاب بہہ نکلا تمام کانگرسی زعماء چھوٹ گئے شیخ حسام الدین بھی انہی رہائیوں میں رہا ہو گئے احرار کے بعض دوسرے لیڈر بھی یکے بعد دیگرے چھوٹتے گئے۔ بعض نے اپیلیں کیں اور نکل آئے۔ احرار میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور میں دو ہی تھے

جو قید میں رہ گئے میں نے آخری وقت تک مرافعہ کی مزاحمت کی شیخ صاحب نے میرے بھائی یورش مرحوم سے مختار نامہ لینا چاہا لیکن میں نے روک دیا انہوں نے اپنے طور پر مرافعہ دائر کیا جو عدم پیروی یا ناقص پیروی کے باعث خارج ہو گیا اس وقت میں اپنی قید کا ساٹھ فی صد حصہ گذار چکا تھا۔

چودھری صاحب کی رحلت کے بعد مولوی مظہر علی اظہر احرار کے قائد ہو گئے۔ انہوں نے "حکومت الہیہ" ایجاد کی اور احرار کو ایک ایسے دوراہا پر لا کھڑا کیا کہ کانگرس نے کٹھ مُلا کا طعن کسا اور لیگ نے غدار کی پھبتی — لیکن یہ سب بیرونی دنیا کی باتیں تھیں ہمیں سیاسیات کے خارجی اُتار چڑھاؤ کا کچھ علم نہ تھا۔

آخر وہ صبح بھی آگئی کہ میں بیڑیاں کھڑکھڑاتا لاہور روانہ ہو گیا منٹگمری سنٹرل جیل کے سیاہ پھاٹکوں نے چڑیل کی طرح گھورا اور بند ہو گئے لاہور سنٹرل جیل پہنچ کر میں نے محسوس کیا کہ دوزخ سے اعراف میں آگیا ہوں۔ ؏

از دوزخیاں پُرس کہ اعراف بہشت است



ٹیررسٹ وارڈ

لاہور پہنچا تو رات خاصی بیت چکی تھی پولیس گارد نے چھاؤنی کے اسٹیشن پر اتار لیا اور سیدھا سنٹرل جیل لے گئی۔ جیل والوں کو پہلے سے اطلاع تھی دربان نے ڈیوٹی آفیسر مسٹر سپرا کو بلوایا اس نے وارنٹ وصول کئے پولیس کو رسید دی اور مجھے ٹیررسٹ وارڈ میں بھجوا دیا ٹیررسٹ وارڈ خطرناک سیاسی قیدیوں کے لئے مخصوص تھا یہ لاہور سنٹرل جیل کا سب سے "خوبصورت" بلاک تھا بھگت سنگھ سکھدیو اور راج گورو کے جن ساتھیوں کو عمر قید ہوتی تھی یہ انہی کے لئے تعمیر ہوا اور انہی کو یہاں رکھا گیا دوسری جنگ عظیم میں یہ خصوصیت بدل گئی بعض دوسرے پولیٹیکل قیدی بھی یہاں رہنے لگے عام اخلاقی قیدی اسے بم احاطہ بھی کہتے تھے کل بیس کوٹھڑیاں تھیں درمیان میں باورچی خانہ دروازہ کے سامنے غسل خانہ دوسری طرف بیت الخلا، آخری نکڑ پر مشقت کے لئے بیرک تھی وہاں مشقت تو کیا ہوتی آپس میں گپ بازی کے لئے ڈرائنگ روم کی شکل دے دی گئی تھی وہیں اکٹھے کھانا کھاتے اور ملکی حالات پر تبصرہ کرتے تھے ایک چھوٹا سا باغیچہ بھی تھا جہاں ایک طرف پھل پھول لگے ہوئے دوسری طرف سبزیاں اُگی ہوئی تھیں۔ لان میں

والی بال یا ٹینس کھیلتے تھے غرض یہ ایک چھوٹا سا بورڈنگ ہاؤس تھا جس میں ایک عرصہ سے دہشت پسند قیدی رہ رہے تھے اب کچھ اور سیاسی قیدی بھی آ گئے ان میں دو چار اعلیٰ کلاس کے سیاسی قیدی تھے جنہیں غالباً جگہ کی کمی کے باعث یہاں رکھا گیا تھا میرے آنے سے مسلمان پانچ ہو گئے پہلے چار میں ایک روزنامہ سیاست کے مالک و مدیر سید حبیب تھے جو حکومت افغانستان کی تحریک پر نظر بند کئے گئے صوبہ کے وزیر اعظم سکندر حیات بھی اُن کے موافق نہ تھے۔ دوسرے ہانگ کانگ سے ایک مسلمان نوجوان چودھری عبدالستار تھے تیسرے مشہور سوشلسٹ لیڈر یوسف مہر علی چوتھے لاہور کا ایک نوجوان سیفی کاشمیری پانچواں اب مَیں تھا باقی تمام ہندو تھے یا سکھ،

مَیں ٹیررسٹ وارڈ میں داخل ہوا تو ایک ثلث رات بیت جانے کے باوجود بعض کمروں میں گپیں ہانکی جا رہی تھیں ٹیررسٹوں کے کمرے مقفل تھے اور وہ تقریباً سبھی پڑھ لکھ رہے تھے مَیں بیڑیاں کھڑکھڑاتا ہوا آخر کے خالی کمرے پر رُکا جس کا پچھلا حصہ گودام بنا ہوا تھا اور کوئی کمرہ خالی نہ تھا مشقتی بیرک میں ایک چارپائی پڑی تھی معلوم ہوا کہ میرے لئے رکھی گئی ہے ہر کمرے یا کوٹھڑی کے پہلے حصے کی چھت اور دروازے لوہے کی سلاخوں کے تھے یمین و یسار کی دیواریں اینٹوں کی تھیں اُس وقت سیفی کاشمیری نے اپنے ساتھ جگہ دے دی اور مَیں برآمدے میں سو رہا صبح اُٹھا ہیئت کذائی بدلی بیڑیاں اُتروائیں قیدیوں کا جھول اُتارا شیو بنوائی نہایا دھویا شکلیں پہچاننے کی کوشش کی بعض چہرے شناسا تھے کچھ دوست نکلے اکثریت سے رسمی علیک سلیک ہوئی کچھ فوجی قسم کے سکھ تھے جو سنگاپور سے سیاسی قیدی بن کے آئے تھے انہوں نے محسوس کیا جیسے مندر میں کوئی ملیچھ آ گھسا ہے بہر حال یہ ایک عارضی لہر تھی دو ایک دن میں نکل گئی پرانے ٹیررسٹوں میں کشوری لال ہنسراج، روپ چند، گلاب سنگھ اور کندن لال تھے کانگرسی زعماء

میں چودھری کرشن گوپال دت، مسٹر گوند سہائے (یو۔پی) لالہ برج کرشن چاندی والا ڈاکٹر سکھدیو لال اور مسٹر اونکار ناتھ (دہلی) سوشلسٹوں میں یوسف مہر علی اور سردار سجن سنگھ مرگند پوری ان کے علاوہ بہار کا ایک کالا بھجنگ۔ واجبی خط و خال کا ٹیررسٹ نوجوان بچہ بابو تھا جو پٹنہ کے مضافات سے بھاگ کر لاہور آیا اور یہاں سی آئی ڈی کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔

اب سی کلاس میں ہم تین قیدی تھے بچہ بابو، سیفی کاشمیری اور مَیں۔ باقی سبھی اے یا بی کلاس میں تھے لنگر اکٹھا تھا اور ٹیررسٹ نوجوانوں کی بدولت خوراک میں کوئی امتیاز نہیں رہا تھا کھانا سبھی ایک ساتھ کھاتے کپڑے گھر سے منگوا لئے لباس بھی ایک سا ہو گیا بلا امتیاز سبھی سفید کھدر پہنتے تھے۔

وارڈ تو جیل ہی تھا لیکن ہوسٹل نظر آتا۔ پہلے ہی دن منٹگمری سنٹرل جیل کے سارے غم غلط ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ جہنم سے بہشت میں آ گیا ہوں۔ کہاں اُس جیل کے شب و روز کہ انسان ہستیٔ باری تعالیٰ ——— پر غور کرنے لگتا اور دہریت کی حدوں تک نکل جاتا ہے کہاں لاہور سنٹرل جیل کہ مقابلتاً دار الاقامہ محسوس ہوا پھر ٹیررسٹ وارڈ گویا جنگل میں منگل! پہلی نظر ہی میں اندازہ ہو گیا کہ دانشوروں کی ایک چوپال ہے۔

اس سے پہلے بھی لاہور سنٹرل جیل میں کئی دفعہ رہ چکا اور اس کے کونے کھدرے سے واقف تھا۔ تب ٹیررسٹ وارڈ محض ایک ہوّا تھا۔ وہاں پہنچنا مشکل تھا۔ قیدیوں سے باتیں سُن رکھی تھیں کہ جن نوجوانوں کو یہاں رکھا گیا وہ خطرناک قسم کے دہشت پسند ہیں۔ انھیں عمر بھر کے لیے قید کیا گیا ان سے علیک سلیک جُرم اور میل ملاپ ممنوع ہے۔ اب داخل ہو کر دیکھا

تو نقشہ ہی دوسرا تھا - دہشت پسند، انقلاب پسند، دین پسند، دھرم پسند ترقی پسند اور رجعت پسند سبھی قسم کے لوگ موجود تھے —— قدرِ مشترک یہ تھی کہ سبھی ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ میں ماخوذ تھے - آفت کے پر کالا ؟ لیکن مجموعۂ اضداد !! سرسری نظر میں اندازہ ہو گیا کہ ذہانت و لطافت استقامت و ایثار، جرأت و مردانگی اور شرافت و سیاست کے نادر نمونے رہ رہے ہیں - گو بہت سی کنکریاں بھی ہیں لیکن ہیروں کی کمی نہیں اور سبھی ہیرے بیش قیمت ہیں - ایک سے ایک بڑھ کر، جن کی آب و تاب سے پورا بلاک جگمگا رہا تھا - فی الجملہ سیاسی آبرومندوں کا ایک نگر تھا -

دو سیّد

سید امیر شاہ جیلر تھے اور میجر حبیب اللہ شاہ سپرنٹنڈنٹ دونو خاص خوبیوں کے مالک تھے کرنل پوری (انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات) نے منٹگمری سے واپسی کے بعد میجر حبیب اللہ شاہ سے ذکر کیا کہ ایک سخت طبیعت کا قیدی آ رہا ہے اس پر قابو پا سکو گے سید امیر شاہ (جیلر) نے میرا نام سنا تو فوراً آمادہ ہو گئے شاہ صاحب کے ساتھ مَیں کسی جیل میں کبھی نہیں رہا تھا میری ان کی واقفیت ٹرین میں اتفاقیہ ہوئی تھی مَیں ہمسفر دوستوں سے بات چیت کر رہا تھا انہیں گفتگو پسند آئی دوست ہو گئے جس واقف کار سے کبھی ملے تعریف کی منشی احمد دین (سوشلسٹ لیڈر) سے کہہ چکے تھے کہ شورش کو منٹگمری جیل میں سخت تکلیف ہے وہ یہاں آ جائے یا مَیں وہاں چلا جاؤں تو جو کچھ میرے بس میں ہو اُس کے لئے کروں اب جو مَیں لاہور آ گیا تو پہلے ہی دن صبح سویرے دفتر بلا بھیجا - بڑے تپاک سے ملے معانقہ کیا چودھری کرشن گوپال دت مہاشہ کرشن

ایڈیٹر پرتاپ سے ملاقات کر رہے تھے شاہ صاحب نے میرا نام لیا تو مہاشہ جی اچھل کر میری طرف بڑھے شاہ صاحب سے پوچھا "اسی نوجوان کا نام شورش کاشمیری ہے؟"

"جی ہاں میرا ہی نام شورش کاشمیری ہے" میں نے خود ہی جواب دیا۔

مہاشہ جی حیرت و محبت سے تکتے رہے دیر تک باتیں کیں۔ خصوصیت سے منٹگمری جیل کے حالات پوچھے وہاں جو کچھ بیتی وہ میرے جسم سے ظاہر تھی ایک مشت استخوان حواس خمسہ کے سہارے جی رہا تھا صرف ہڈیاں رہ گئی تھیں آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں چہرہ سیاہ پڑ گیا اور بال نوجوانی ہی میں سفید ہونے لگے تھے مہاشہ جی بزرگانہ انداز میں تھپکی دے کر چلے گئے دوسرے دن انہوں نے ایک بھرپور اداریہ لکھا عنوان تھا "شورش کاشمیری زندہ باد" اس اداریہ میں انہوں نے میری بے حد تعریف کی شاید ہی اس سے قبل ان کے قلم سے کسی نوجوان کی تعریف میں اتنے عمدہ کلمات نکلے ہوں۔ انہوں نے ایک مرہٹہ نوجوان کے انقلابی سوانح سے موازنہ کرتے ہوئے تبریک و ستائش کے الفاظ میں لکھا کہ شورش کاشمیری جیسے نوجوان ہی ملک و قوم کا سرمایہ ہوتے اور آڑے وقت میں انقلابی نوجوانوں کی قیادت کر سکتے ہیں انہوں نے یونینسٹ وزارت کو آڑے ہاتھوں لیا کہ وہ شورش کاشمیری کو سی کلاس میں رکھ کر ذاتی انتقام کی پیاس بجھا رہی ہے۔

مجھے یہاں تشدد و انتقام کے سبھی مرحلوں سے گزار کر لایا گیا تھا اور اب مجھ پر کوئی سا تجربہ کرنا باقی نہ رہا تھا میجر حبیب اللہ شاہ کا سلوک بہر حال شریفانہ تھا لطف کی بات یہ ہے کہ وہ پکے قادیانی تھے ان کی ہمشیرہ میرزا بشیر الدین محمود کے عقد میں تھیں قادیان کے ناظر امور عامہ سید زین العابدین ولی اللہ ان کے بڑے بھائی تھے انہیں یہ بھی علم تھا کہ میں آل انڈیا مجلس احرار کا جنرل سیکرٹری ہوں اور احرار قادیانیوں کے حریف ہیں بلکہ دونوں میں انتہائی عداوت ہے میجر حبیب اللہ شاہ نے اشارۃً بھی اس کا احساس نہ ہونے دیا انہوں نے

اخلاق و شرافت کی انتہا کر دی پہلے دن اپنے دفتر میں اس خوش دلی اور کشادہ قلبی سے ملے گویا مدۃ العمر کے آشنا ہیں انہوں نے مجھے بیماروں میں رکھا اور اچھی سے اچھی دوا و غذا دینا شروع کی نتیجۃً میری صحت کے بال و پر پیدا ہو گئے اور میں چند ہفتوں ہی میں تندرستی کی راہ پر آ گیا وہ بڑے جسور، انتہائی حلیم، بے حد خلیق اور غایت درجہ دیانت دار آفیسر تھے ان کے پہلو میں یقیناً ایک انسان کا دل تھا ان کی بہت سی خوبیوں نے انہیں سیاسی قیدیوں میں مقبول و محترم بنا دیا تھا۔

بیوپار منڈل

میری آمد کے دوسرے یا تیسرے روز بیوپار منڈل کا قضیہ شروع ہو گیا ہندو دوکانداروں نے بکری ٹیکس کے خلاف احتجاج و ہنگامہ کیا ان کی پہلی کانفرنس منعقدہ لائل پور کے صدر خان عبدالقیوم خان زلیگ کے مرد آہن، منتخب یا نامزد ہوئے اور ایک زبردست صدارتی خطبہ پڑھا تھا بیوپاریوں نے ہڑتال کی تو گرفتار شدگان میں مولانا اختر علی خان مدیر زمیندار بھی تھے ان کے علاوہ ایک اور انقلابی نوجوان کامریڈ احسان الٰہی بھی ساتھ تھا ان لوگوں کی آمد سے تمام سنٹرل جیل میں چہل پہل ہو گئی ایک میلہ سا لگا رہا۔ بڑے بڑے ہندو اور سکھ تاجر قید ہو کر آ رہے تھے جن میں اکثر مہاسبھائی ذہن کے لوگ تھے امرتسر کے باوا ہر دمن سنگھ اور لاہور کے لالہ دھنی رام بھلہ بھی اسی غول میں تھے مولانا اختر علی خان تو تکلفاً ہی آ گئے تھے یا انہیں بہ ترغیب ملا لیا گیا تھا کامریڈ احسان الٰہی بیوپار منڈل کے آفس سیکرٹری تھے لالہ بہاری لال چاننہ تحریک کے لیڈر تھے غرض لاہور اور امرتسر کے سربرآوردہ تجار اندر آ گئے اِن میں جوہری بچے بھی تھے جن کے گلابی عارضوں کی رونق سے فکر شعر میں آسانی ہوتی ہے یہ گویا دولت

اور حسن کا ایک عجائب خانہ تھا دو ایک روز ہی میں ہزار بارہ سو قیدی جمع ہو گئے جیل پہلے ہی پُر تھی ٹیررسٹ وارڈ کے سامنے کھُلے میدان میں چھولداریاں لگا دی گئیں یہ لوگ وہاں رکھے گئے جب چھولداریوں میں گنجائش نہ رہی تو اس سے متصل حوالات کی وسیع گراؤنڈ میں مزید چھولداریاں نصب کی گئیں بہاری لال چانینہ برات کے دولہا تھے اُنہوں نے مہاتما ئیت کا ٹھپہ لگا لیا آن واحد میں اُن کا دماغ کہاں سے کہاں پہنچا ان کے بعض نامور ساتھیوں کو ہمارے احاطہ کی بیرک میں جگہ دی گئی اکثر اپنی دولت کے باعث کانگرسی راہنماؤں کے ساتھ ٹک گئے کئیوں نے ازراہ نیاز مندی اپنے کمرے اُن کے لئے مخصوص کر دیئے مجھے اُس روز بخار ہو رہا تھا طبیعت ہُمک رہی تھی دل نڈھال تھا سیفی کاشمیری پر ملاپ کے مہاشہ یشپال کا بے حد اثر تھا یشپال میری آمد سے پہلے رہا ہو گیا لیکن سیفی نے حاضر و غائب اسکی خدمت اپنے اوپر فرض کر لی تھی جب تک یشپال اندر رہا سیفی کی مالی امداد کرتا رہا سیفی اس کے کپڑے دھوتا جوتے پالش کرتا بیش رہا ہو گیا تو ہر مہینے اُسے ضرورت کی چیزیں بھجواتے لگا سیفی نے مجھ سے کہا کہ "اس کا برآمدہ خالی کر کے بیرک میں چلا جاؤں کیونکہ برآمدہ میں وہ خود رہنا چاہتا اور اپنا کمرہ باوا پرِدمن سنگھ کو دے رہا ہے"

مَیں بخار کے غلبہ سے لاچار پڑا تھا میرا خیال تھا سیفی کو ضرور احساس ہوگا اور وہ مجھے جگہ خالی کرنے کیلئے نہیں کہے گا اُس کا کہنا تھا کہ باوا پرِدمن سنگھ کی بیٹی یشپال سے بیاہی جا رہی ہے لہذا اُس کا فرض ہے کہ وہ باوا جی کی خدمت کرے چار و ناچار مَیں نے جگہ خالی کر دی کسی کو یہ خیال ہی نہ تھا کہ مَیں اس طرح بیمار پڑا ہوں اور میری تکلیف لحظہ بہ لحظہ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

بیرک میں رات بھر رہا اگلے روز بیوپار منڈل کے کچھ اور معززین آ گئے یہ کٹر قسم کے ہندو تھے جن کا چھوت چھات پر یقین تھا اب مجھے ان کے لئے بیرک بھی چھوڑنی پڑی بلکہ

چھڑوالی گئی آخری کوٹھڑی کے برآمدے میں جہاں گودام تھا جگہ ملی رات بھر وہاں اکیلا پڑا رہا، پچھلے پہر ابر آگیا سلاخوں کی چھت پر چٹائیاں ڈلی ہوئی تھیں اِدھر بخار تیز ہو رہا تھا اُدھر بوندا باندی ہونے لگی چھت نے ٹپکنا شروع کیا چار کمبلوں کا جاڑا اور مَیں دو کمبلوں میں پڑا تھا۔ نیند کہاں؟ رات بھر کراہتا رہا کسی دیش بھگت کی آنکھ نہ کھلی صبح ہوگئی مَیں بدستور کراہ رہا تھا جو لوگ بیوپار منڈل میں آئے تھے وہ مزاجاً اور فطرتاً ہندو تھے اختر علی خان اور احسان الٰہی اس غزل میں شتر گربہ تھے اور خواہ مخواہ چلے آئے تھے لالاؤں نے بیرک کو بوتر رکھنے کے لئے مجھے وہاں سے چلتا کیا۔ اُن کے تعصب کا ایک ایک ورق کھلنے لگا یہ لوگ مولانا آزادؒ کے سخت مخالف تھے اُن کا خیال تھا کہ مولانا نے کانگریسی راہنماؤں کو اس تحریک میں حصہ لینے سے روک کر سکندر وزارت کی معاونت کی ہے مولانا آزادؒ زرعی قرضوں کے معاملہ میں سکندر وزارت کی ہمنوائی کر چکے تھے انہوں نے کانگرس اسمبلی پارٹی کو ہدایات جاری کی تھیں کہ وہ زرعی قرضے کے تنسیخی بلوں کی مخالفت نہ کرے ان بلوں کی زد براہ راست ان ہندو مہاجنوں پر پڑتی تھی جنہوں نے پنجاب کے بڑے بڑے مسلمان جاگیرداروں کا خون چوس لیا تھا اور اصل سے زیادہ سُود لے چکے تھے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کانگرس اسمبلی پارٹی کے لیڈر تھے انہوں نے بظاہر مولانا کے احکام کی متابعت کی لیکن بباطن مخالف رہے جن لوگوں نے ان بلوں کے خلاف تحریک چلائی تقریباً سبھی کانگرسی راہنماؤں نے ان کی پشت پناہی کی کانگرس اسمبلی پارٹی کے ارکان کا نکتہ نگاہ یہ تھا کہ ہمیں ہندو ووٹروں نے منتخب کیا ہے ہم اُن کا مفاد کیونکر ترک کر سکتے ہیں؟

ایک زندہ دل انسان سجن سنگھ مرگند پوری بھی ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ میں نظر بند تھے انہوں نے مجھے اس پھٹے حال میں دیکھا تو ساتھیوں کی اس شقاوت پر اُن کا جی بھر

آیا میرے پاس آئے اور زور دیا کہ میں اُن کے کمرہ میں رہوں وہ بیرک میں چلے جاتے ہیں اُن کا اس حال میں اپنا کمرہ چھوڑنا بے شبہ ایک ایثار تھا میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ وہ اپنے ہی کمرے میں رہیں میں یہاں ٹھیک ہوں لیکن وہ مانے نہیں اصرار کیا کہ بیمار ہو چلو زبردستی بستر اُٹھا کر لے گئے خود اپنا بستر بیرک میں لگا دیا اور بیوپار منڈل کے سوداگروں کے سرہانے ڈیرا ڈالا، میں ان کی تیمارداری سے دو ایک روز ہی میں اچھا ہو گیا میجر حبیب اللہ شاہ نے قیمتی سے قیمتی دوا مہیا کی اور اچھی سے اچھی غذا۔ تاکہ منٹگمری جیل کے ظالمانہ ایام میں جو کچھ مجھ پر بیت چکی ہے اسکی تلافی ہو اور میں گمشدہ صحت حاصل کر سکوں جب ساتھیوں کی اس بیگانہ وشی کا انہیں پتہ چلا تو قلق ہوا سید امیر شاہ اور بھی آزردہ ہوئے بعض کانگرسی راہنماؤں سے دبی زبان میں گلہ کیا۔ آخر ایک روز ان کی معاونت سے مجھے ایک کمرہ مل گیا سجن سنگھ اپنی جگہ آ گئے سید امیر شاہ نے اپنے طور پر مجھے بی کلاس کی مراعات دے دیں یعنی وہ تمام سامان بھجوا دیا جو بی کلاس قیدیوں کے لئے مقرر تھا۔ میجر حبیب اللہ شاہ نے میری صحت کی خرابی کے پیش نظر اعلیٰ خوراک اور پھل مہیا کرنے کا حکم دیا یہ سب کچھ مشترکہ کچن کی "ملکیت" تھا سید امیر شاہ نہیں چاہتے تھے کہ میری ہیٹی ہو ایک تو انہیں مجھ سے اِخلاص تھا دوسرے مسلمان ہونے کا احساس، وہ عموماً کڑھتے تھے کہ ٹکے ٹکے کے لوگ اے اور بی کلاس میں ہیں لیکن میرا مسلمان ہونا جرم ہو گیا ہے انہیں سی آئی ڈی کی عداوت کا بھی علم تھا اور یونینسٹ وزارت کے انتقام و عناد سے بھی باخبر تھے بہر حال وہ مجھے اپنی محبت سے نوازنے لگے میجر حبیب اللہ شاہ بکمال و تمام ان کے ساتھ تھے راجہ گل نواز جو منٹگمری سنٹرل جیل میں سپرنٹنڈنٹ رہے اور وہاں اپنے شریفانہ اخلاق کا نقش چھوڑ آئے تھے آجکل اسسٹنٹ انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات تھے آپ دو تین دفعہ تشریف لائے اور ہمیشہ شگفتہ اَلفاظ میں ذکر کیا مقصود یہ تھا کہ میرے ساتھ حسنِ سلوک ہو اس ہمدردی

ہیں ایک خاص جذبہ کارفرما تھا وہ میری بے بضاعتی سے بھی واقف تھے اور پامردی سے بھی لیکن انہیں ہندو ذہن کی عصبیتوں نے مجھ سے حسنِ سلوک پر آمادہ کیا تھا انہیں احساس تھا کہ مَیں مسلمان ہوں اور مسلمان سیاسی قیدیوں کا (الا ماشاء اللہ) کوئی پُرسان حال نہیں حکومت کے اعضا مخالف اور کانگرس کے راہنما بے تعلق تھے لیکن یہ رویہ کانگرس کے بعض لیڈروں کا تھا اس میں سوشلسٹ کمیونسٹ ٹیررسٹ یا دوسرے نوجوان شامل نہ تھے ابتدا میں ان کا روکھا پن عارضی تھا کیونکہ ہم ایک دوسرے کے شناسا نہ تھے۔

اسی اثنا میں ہندوؤں کا تہوار لوہڑی آگیا لالہ دھنی رام بھلہ اور دوسرے بڑے بڑے لالاؤں نے رات کو احاطہ کے صحن میں آگ کا الاؤ روشن کیا۔ الاؤ میں ساگوان اور صندل کی لکڑی کے علاوہ سیروں گھی اور جانے کیا کیا ڈالا گیا منتر پڑھے گئے ویدوں کا پاٹھ ہوتا رہا آدھی رات تک یہی سماں رہا یہ سارا سامان حکام کی اجازت سے منگوایا گیا تھا وجہ یہ تھی کہ جیل کے وزیر سر منوہر لال اور انسپکٹر جنرل کرنل پوری تھے۔

صبح ہوئی تو بچہ بابو نے خاکستر کے گرد پھیرے ڈال کر چلانا شروع کیا "رشیوں کے نام پہ دھوکا بھگوان کے نام پہ فراڈ! ہم لوگ دیش کی سوتنترتا کے لئے گھر سے بے گھر سی کلاس میں مر رہے ہیں صبح و شام دو تولے سرسوں کے تیل میں تڑکی ہوئی باسی سبزی اور سڑی ہوئی دال ملتی ہے اور یہ لوگ آگ کو دودھ پلاتے اور گھی کھلاتے ہیں اُس بھگوان کو پھانسی لگا دو جو اس سے خوش ہوتا ہے۔"

بچہ بابو سی کلاس میں غریب الدیار قیدی تھا بے بس، عاجز، تنگدست۔ اپنی روٹی بھی عام اخلاقی قیدیوں کے لنگر سے منگوا کے کھاتا کسی میں حوصلہ نہ تھا کہ اسے ٹوکے یا روکے سب اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں پڑے رہے وہ متواتر بکے جا رہا تھا لالہ دھنی رام بھلہ (مالک بھلہ شو کمپنی)

نے کچھ کہنا چاہا تو اُس نے گریبان سے پکڑ لیا ——

"شرم کرو۔ گئو ماتا کی چمڑی کے بوٹ بیچ کر بھگوان کے نام پر گھی جلاتے ہو صندل پھونکتے ہو ساگوان کو ئلہ کرتے ہو تف ہے تم پر اور تمہارے بھگوان پر، لعنت ہے تمہارے انسان ہونے پر ——"

ساتھیوں نے بیچ بچاؤ کر کے چھڑا دیا سپرنٹنڈنٹ کو شکایت ہو گئی لیکن معاملہ پیش ہونے سے پہلے ہی رفع دفع ہو گیا۔

تیسرے چوتھے روز یہ سبھا بھی اُجڑ گئی، سکندر حیات نے کہلا بھیجا کہ دو روز تک دکانیں نہ کھولیں تو ہنگامی اختیارات استعمال کرتے ہوئے تمام دوکانوں کو سرکاری قبضہ میں لے لیا جائیگا لالہ اب تک نافرمان تھا۔ اس اعلان سے پریشان ہو گیا۔ رکھ رکھاؤ کی ایک صلح ہوتی۔ سب رہا ہو گئے۔ معاملہ جوں کا توں رہا —— ع

دھمکی میں مرگیا جو نہ باب نبرد تھا

دیوتا سروپ

بہاری لال چاننہ دیکھتی آنکھوں دیوتا سروپ ہو گئے۔ متحدہ ہندوستان کے آخری انتخابات میں جب کانگریس مسلم لیگ اور دوسری جماعتوں نے اکھاڑے میں اُترنا شروع کیا تو بہاری لال چاننہ بھی میدان میں آ گئے زعم اُنہیں یہ تھا کہ وہ اس تحریک کی بدولت لیڈر بن گئے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد ٹکٹ کے امیدواروں کا جائزہ لینے کے لیے فلیٹی ہوٹل لاہور میں فروکش تھے تو وہاں بہاری لال چاننہ بھی کہیں سے آ نکلے مولانا سے ملاقات کے لیے بہتیرے جتن کیے مگر ملاقات نہ ہو سکی دعوتِ استقبالیہ میں شریک ہوئے تو چائے کی میز پر بیٹھے اول فول بکتے رہے۔ بعض دوستوں نے سوال کیا

چاننہ جی آپ اور یہاں؟ کہنے لگے کانگریس کے ٹکٹ کا بھاؤ پوچھنے آیا ہوں مولانا کے کان میں بھنک پڑ گئی وہ پہلے ہی ان سے ناخوش اور تحریک سے بیزار تھے۔ انہوں نے نہ صرف ملاقات سے انکار کیا۔ بلکہ بعض اعلیٰ کانگریسیوں کی اس خواہش کو بھی ٹھکرا دیا تھا کہ چاننہ کو ٹکٹ دیا جائے۔ مولانا نے چاننہ کے مقابلہ میں ایک معمولی آدمی کو ٹکٹ دیا چاننہ نے اس کو اپنی ہتک سمجھا ان کا خیال تھا کہ بکری ٹیکس کے سلسلہ میں انہوں نے ہندو جنتا کی بڑی خدمت کی ہے۔ لازماً یہ نشست اُن کے سوا کوئی نہیں لے سکے گا اپنے ٹکٹ پر کھڑے ہو گئے لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ ہار گئے۔

بیوپار منڈل کی تحریک میں نہ صرف بڑے بڑے ہندو تاجر پکڑے گئے بلکہ شاہ عالمی دروازے کا مشہور بدمعاش لالہ بیلی شاہ (تیل والا) بھی اپنی منڈلی سمیت گرفتار ہوا تھا۔ ایک طرف باوا پردمن سنگھ (امرتہ پریتم کے خسر) سردار کرتار سنگھ کوائرہ اور کرشن لال بھلہ جیسے لوگ تھے تو دوسری طرف اُن کے ہمراہ عام دوکاندار ——————

کامریڈ احسان الٰہی

کامریڈ احسان الٰہی دو برس پہلے اسی جیل میں شاہی قیدی تھے اور تقریباً آٹھ سال رہے جب اُن کا کچومر نکل گیا تو رہا کر دیئے گئے۔ الزام ان کے خلاف یہ تھا کہ انہوں نے پنجاب میں ٹیررسٹ موومنٹ کی نیو رکھی بہت سے نوجوانوں کو انقلابی بنایا اور واقعہ بھی یہی تھا کہ وہ صوبہ کے بیشتر انقلابیوں کے اُستاد رہے تھے۔ انہیں ٹیررسٹ موومنٹ کو نظم میں رکھنے کا خصوصی ملکہ حاصل تھا۔ بھگت سنگھ (شہید وطن) پربودھ چندر (وزیر تعلیم بھارتی پنجاب) کامریڈ رام کشن (وزیر اعلیٰ بھارتی پنجاب) اور بیسیوں نوجوان جو پھانسی پا گئے انہی کے شاگرد تھے یہ تمام انقلابی تحریک میں ان کے زیر تربیت رہ چکے تھے۔ افسوس احسان الٰہی نے اپنے سوانح حیات قلمبند نہ کیے اور اب تو انہیں یاد کرنیوالا

بھی کوئی نہیں سب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ رہا ہوئے تو روزگار کا سوال درپیش تھا۔ اُن کے بھائی ایک نامور طبیب تھے ایک اچھے گھرانے میں شادی کر دی لیکن ان کی معاشں کا سوال حل نہ کیا، روز بروز تنگدستی گھیرتی رہی مسلمانوں نے پوچھا تک نہیں کہ احسان الٰہی آٹھ برس جیل میں کیوں رہا اور اُس کی کہانی کیا ہے۔ عام ہندوؤں کے نزدیک مسلمان ہونے کی وجہ سے ناقابل اعتنا رہا بہت سے ہندو نوجوانوں کے دل میں اُس کا احترام تھا اور وہ ہیرو سمجھ کر اس کی پوجا کرتے تھے لیکن بہر حال وہ مسلمان ہی تھا آخر معاش سے عاجز آکر اُس نے بیوپار منڈل کی ملازمت کر لی اور آفس سیکرٹری ہونے کی وجہ سے پکڑا گیا پیٹ کی مار نے اُس کو ادھ موا کر دیا تھا۔ اب وہ اپنے لئے نہیں بچوں کے لیے جی رہا تھا لیکن جینے کی آسائشوں سے محروم تھا یہ ایک ٹریجڈی ہے اور اس ٹریجڈی کا تذکرہ پہلے صفحوں میں ہو چکا ہے کہ پنجاب سی آئی ڈی نے اُن مسلمان نوجوانوں پر، جو آزادیٔ وطن کی تحریک میں حصہ لینے اور برطانوی حکومت کے خلاف جدوجہد کرنے میں پیش پیش رہے نہ صرف انتہائی تشدد روا رکھا بلکہ انہیں جسمانی طور پر ناکارہ کر دیا اور دماغی طور پر ہلا دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جو مسلمان نوجوان ہتھے چڑھ گیا اُس کو مخبر بنا لیا جو ہتھے نہ چڑھا اس کو اس بُری طرح پیس ڈالا کہ پناہ بخدا، خود مسلمانوں میں اپنی ہی قوم کے ان نوجوانوں کے لیے جذبہ یا تپاک نہ تھا۔ ان نوجوانوں کے معاملہ میں عام مسلمان من حیث القوم سرد مہر تھے احسان الٰہی محض انقلابی ہی نہ تھا بلکہ ایک عبقری نوجوان تھا اس کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ اس کی نگاہ میں علم کی بنا۔ پر بہت کم لوگ جچتے تھے۔

بھگوتی چرن

اُس کو اپنے اُستاد بھگوتی چرن سے بے پناہ اخلاص تھا بھگوتی نے اُس کی زندگی بدل ڈالی تھی اُن دنوں تمام ملک میں بم پھٹا کرتے تھے۔ دہلی سے پنجاب تک کا علاقہ بھگوتی چرن کی راہنمائی

میں تھا۔ بھی نوجوان اُس کو گورو کہتے ایک روز وہ دریا تے راوی کے کنارے ذخیرے کے گھنے درختوں میں دستی بموں کا جائزہ لے رہا تھا کہ اچانک ایک بم پھٹا اور جان لیوا زخم چھوڑ گیا بھگوتی چرن زخموں سے چور ہو گیا۔ اُسے کو یقین تھا کہ اب اُس کا بچنا محال ہے اُس نے رینگنا شروع کیا تاکہ اپنے آپ کو راوی کی موجوں کے حوالے کر دے سکھدیو جو اُس وقت ہمراہ تھا اس اذیت ناک حادثہ سے کانپ اُٹھا۔ بھاگم بھاگ شہر پہنچا دو ایک رفیقوں کو لیا اور اُلٹے پاؤں واپس آگیا۔ بھگوتی چرن اس وقت دریا کی طرف رینگ رہا تھا اُس کا جسم لہولہان تھا دیکھتے ہی کربناک ہوئی آواز میں بولا

"تم لوگ بھاگ جاؤ میں ختم ہو رہا ہوں بلکہ ختم ہو چکا ہوں ایسا نہ ہو کہ پولیس آجائے اور تم پکڑے جاؤ اب یہاں خطرے کے سوا کچھ نہیں رہا —— چلے جاؤ ——"

ساتھیوں نے اُٹھا کر ساتھ لے جانے پر اصرار کیا اُس نے مسترد کر دیا۔

"پاگل ہو گئے ہو —— چلے جاؤ ——"

بھگوتی رینگتا رینگتا تھک گیا اُس نے سوچا کنارا ابھی بہت دور ہے اور وہ اس سے پہلے ہی مر جائے گا۔ آخر ایک ڈھکی ہوئی جھاڑی میں گھس گیا اُس نے عہد کیا تھا کہ وہ اپنا جسم نوکر شاہی کے حوالہ نہیں کرے گا جب پربودھ چندر اور احسان الٰہی ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں پہنچے تو بھگوتی چرن دم توڑ چکا تھا لیکن اُس کا چہرہ کہہ رہا تھا۔ "کہاں آگئے ہو بھاگ جاؤ ——"

پولیس نے کئی دن تلاش کیا لیکن لاش نہ ملی۔ آخر ایک جھاڑی سے ہڈیوں کی مٹھی ہاتھ آئی اُس کی روح ہی نہیں جسم بھی غائب ہو چکا تھا۔

دھرم کی بات

مولانا اختر علی خان بڑے تپاک سے ملتے کئی وعدے کیے لیکن رہائی کے بعد بھی وعدے

دوشیزہ کی کہہ مکرنی ہو گئے لالہ دھنی رام بھلہ کے فرزند کرشن لال بھلہ میرے ساتھ ہی پڑھتے تھے جاتی دفعہ چندن نام کی آریو ویدک معجون دے گئے جو کمزوری رفع کرنے کے لیئے ایک طرح کی وٹامن تھی اس سے مجھے خاصا فائدہ پہنچا اُن کے والد نے مجھے بخار میں سردی سے بچنے کے لیئے گلوبند دیا تھا میں نے دھو کر واپس کیا انہوں نے چولہے میں جلا دیا پرانے ہندوؤں کی سماجی چھوت چھات کا اندازہ ہوا بلکہ تلخ تجربہ لیکن ان کی نوجوان پود میں تعصب کا نام و نشان تک نہ تھا ابھی یہ لوگ رہا نہیں ہوئے تھے کہ ایک دوست خلیفہ کے کباب اور نان دے گیا ہم چار مسلمان ٹینس گراؤنڈ میں بیٹھے کھا رہے تھے کہ دو ایک ہندو راہنماؤں کو ناگوار گذرا دبے لفظوں میں احتجاج کیا پنڈت کشوری لال سُن رہے تھے۔ اُٹھ کر ہمارے پاس آگئے۔

"بھئی کیا کھا رہے ہو؟"

"نان کباب"

"ہمیں پوچھا ہی نہیں؟"

"یہ آپ کے کھانے کی چیز نہیں بڑا گوشت ہے"

"تو کیا ہمیں کاٹتا ہے"

"جی نہیں —— دھرم کی بات ہے"

"چھوڑو جی دھرم کو، لاؤ کباب اور نان ——" پنڈت نے خود ہی ایک نان اور کچھ کباب اُٹھا لیئے۔ اور آناً فاناً چٹ کر گئے۔

نامور سیاسی قیدی

ہیو مار منڈل کے قیدی چلے گئے تو جیل میں ایک سکون ہو گیا۔ بالخصوص ہمارے احاطہ

میں جو شور و غل تھا ختم ہو گیا۔ تعصب جاتا رہا۔ اخلاص آگیا۔ ہفتہ عشرہ بعد یا اس دوران میں دو اور ساتھی آگئے ایک سردار بھگت سنگھ شہید وطن کے بھائی سردار کلبیر سنگھ جو میرے ساتھ ملتان جیل میں تھے دوسرے لائلپور کے کامریڈ سحر گل یہ دونو سوشلسٹ تھے۔ انتہائی بہادر انتہائی دلیر۔ مہاتما گاندھی نے اگست ۱۹۴۲ء میں "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک چلائی تو قیدیوں کا میلہ لگ گیا۔ کتی بلاک اے کلاس کانگرسی قیدیوں کے لئے مخصوص ہو گئے جن میں "دو شاہی" بیرکیں بھی تھیں۔ ایک پرانا بڈھی خانہ جو شاہی احاطہ نمبر ایک کہلاتا اور جیل کے بڑے دروازہ کی بائیں سمت خراس گھر سے آگے تھا۔ دوسرا شاہی احاطہ جیل پریس کے بغل میں آمنے سامنے کے دو حصوں میں تقسیم تھا پرانے بڈھی خانے میں کامریڈ احسان الٰہی آٹھ برس رہے تھے۔ نئے شاہی احاطہ میں ایک زمانہ سے کرتی پارٹی کے دو سکھ لیڈر رہ رہے تھے غالباً ایک تیجا سنگھ سوتنتر تھا دوسرے کا نام یاد نہیں آرہا جب یہ لوگ رہا کر دیئے گئے تو ان احاطوں میں اے کلاس قیدی رہنے لگے اب جو پولیٹیکل موومنٹ چلی تو نامور قیدیوں کے لئے ان احاطوں کو مخصوص کر دیا گیا۔

کانگریس اسمبلی پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کو نئے شاہی احاطہ میں رکھا گیا اُن کے سیکرٹری مسٹر ملک راج بھی ان کے ہمراہ تھے ادھر دہلی کے لالہ رگھو نندن سرن جو انڈین چیمبر آف کامرس کے صدر رہ چکے تھے گرفتار ہو کر آگئے۔ انکے ساتھ دہلی کے کانگرسی راہنماؤں کی ایک کھیپ تھی۔ مثلاً ڈاکٹر یدھ ویر اور "تیج" کے ایڈیٹر لالہ دیش بندھو گپتا لاہور سے مولانا داؤد غزنوی، مہاشہ نرنیدر، دیوان چمن لال اور سیٹھ سدرشن نے قدم رنجہ فرمایا۔ یہ لوگ پرانے بڈھی خانہ میں رکھے گئے باہر باغیچہ میں چھولداریاں لگا دی گئیں۔ ایک دن سچر صاحب بھی آنکلے۔ مولوی عبدالغنی ڈار، اور شہزادہ آزاد وسمبڑیالوی بھی چلے آتے ایک روز صبح اُٹھ کر دیکھا تو پروفیسر تلک راج چڈھا موجود تھے جو دیولی کیمپ ٹوٹنے کے بعد علاج کی غرض سے یہاں بھیج دیئے گئے تھے۔

اچانک ہی پربودھ چندر بھی آ گئے ایک دن ڈیوڑھی سے واپس آکر دیکھا کہ میرے کمرے کا حلیہ ہی بدلا ہوا ہے پہلے تو مجھے مغالطہ ہوا کہ میں کسی اور کمرے میں گھس آیا ہوں دیکھا تو اپنا ہی کمرہ تھا اتنے میں یامین ڈار نے میرے کاندھے پر بازو رکھ دیئے اور اپنی عینک کے دبیز شیشوں سے اس طرح ہنسا، جیسے گاڑھی لسی کا گلاس چھلک رہا ہو میں ان سے پہلے متعارف نہ تھا لیکن یہ جانتا تھا کہ سوشلسٹ ہیں اور لدھیانہ میں رہتے ہیں اس عمر میں وہ نوجوان تو نہیں رہے تھے کہولت کا آغاز ہو چکا تھا لیکن ان کا دل اور دماغ دونوں جوان تھے عشق و عاشقی ان کی فطرت تھی ایک ہی لحظہ میں اس طرح بے تکلف ہو گئے جیسے بچپن میں ساتھ کھیلے ہوں بولے "معافی چاہتا ہوں کہ بلا اجازت آپ کے کمرے میں آ گھسا ہوں اور کوئی کمرہ خالی نہیں تھا جن ساتھیوں سے سیاسی رشتہ ہے ان کے ساتھ رہنا مشکل ہے سوچا تو تمہارے نام قرعہ پڑا تم نے تو اسے ایڈیٹر کی میز بنا رکھا تھا میں نے باقاعدہ ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کی شکل دے دی ہے"۔ ع

خوب گذرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو

فی الجملہ یامین بڑے ڈھب کا حسن پرست تھا۔ لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی اس کی فطرت کا حسن تھے منہ آئی بات کہہ ڈالتا اُس کے سوشلسٹ ساتھی اس سے بدکتے اور کمیونسٹ گھبراتے تھے وہ اِن سب کا بھیدی تھا کانگرسی راہنما کنی کتراتے ۔ انہیں چھیڑنا اور چٹکی لینا اس کا شعار تھا۔ اپنی باغ و بہار طبیعت کے باعث سب پر حاوی ہونے لگا اور ہو گیا۔

طبیعتوں کی بوقلمونی

کانگرسی راہنما اپنے اپنے مزاج کی تقسیم کے مطابق دو تین دھڑوں میں بٹے ہوتے تھے اُن

میں لاگ بھی تھا اور لگاؤ بھی زیادہ عنصر مہاسبھائی ذہنیت کے ہندو راہنماؤں کا تھا ڈاکٹر گوپی چند بھارگو اسی قبیلے کے سردار تھے لالہ بھیم سین سچر اور دیوان چمن لال کھرے نیشنلسٹ تھے پربودھ چندر بھی اسی دھڑے کے تھے سرتاپا ہندوستانی (۱)۔ رہ گئے سوشلسٹ یا کمیونسٹ ــــ تو وہ ہندو تھے نہ مسلمان صرف سوشلسٹ تھے یا کمیونسٹ اور یہی اُن کا دھرم تھا ٹیررسٹوں میں ایک دو نوجوان کمیونسٹ تھے لیکن قدیم قیدی ہونے کی وجہ سے ان کا اپنا ایک گروہ تھا۔ سوشلسٹوں کی طاقت خاصی بڑھ گئی تھی یوسف مہر علی کے علاوہ ان کے صوبائی لیڈر بھی آ گئے ان سب سے میرا قدیمی تعلق تھا اُنکے حسن اخلاق سے اور بھی گہرا ہو گیا جہاں تک ایک دوسرے کے احترام کا تعلق ہے۔ کمیونسٹ بھی میرے ساتھ مخلص ہی رہے اور کانگرسی راہنماؤں کی اکثریت بھی تعصبات کے باوجود احترام کرتی رہی مولانا داؤد غزنوی کا رویہ انتہائی مشفقانہ تھا وہ سب کے تھے اور ہر شخص ان کا احترام کرتا تھا خوش خوراک اور خوش پوشاک کسی کو ان کے لب ولہجہ سے شکایت نہ تھی جن خوش اخلاق بزرگوں کا تذکرہ پڑھنے میں آتا ہے وہ اس کا کامل نمونہ تھے آدمی ان سے مل کر اور ان کے ساتھ رہ کر گرویدہ ہو جاتا تھا اُن میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ عیب بین اور عیب چین نہ تھے ہر کوئی ان کے لئے بچھا جاتا کسی کو ان سے خفی یا جلی شکایت تھی تو یہ کہ

(۱) فقیری میں شاہی کرتے ہیں۔

(۲) مولانا ابوالکلام آزاد نے انہیں صوبہ کانگریس کی صدارت پر مسلط کیا ہے۔

کانگریس کے ہندو راہنماؤں کی اکثریت کا یہ حال تھا کہ وہ مسلمانوں کو کانگرس میں بلاتے ضرور لیکن دروازہ بند رکھتے تھے جو مسلمان اوپر سے آتا اُس کو اس طرح زچ کرتے کہ آخر کار بھاگ اُٹھتا جیسا کہ میاں افتخار الدین نے کیا یا پھر اُن کا اجیر ہو کر رہ جاتا جیسا کہ پنجاب میں ایک صاحب خلیفہ فضل الدین تھے یا پھر کبھی کبھار اتشتائی کیفیت پیدا ہو جاتی مجلس احرار کی الگ

تنظیم کا محرک اور وجوہ کے علاوہ یہی ذہن تھا ـــــــ مولانا ابوالکلام آزاد کانگریس ہائی کمانڈ میں اُن صوبوں کے انچارج تھے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی دوسرے صوبوں کی مسلمان وزارتوں کے انچارج بھی مولانا ہی تھے۔ پنجاب کانگریس کے ہندو زعماء جو صوبائی جماعت پر قابض تھے مولانا آزاد کے خلاف اور سردار پٹیل کے موافق تھے لیکن سرتابی کا حوصلہ نہ تھا چوہوں کی طرح کترتے رہتے۔ مولانا داؤد غزنوی کا کانگرس میں شمول اُن کے لیے سوہان روح تھا انہیں یہ خطرہ تھا کہ آئندہ چل کر بھی وہ صوبہ کانگرس کے سربراہ ہوں گے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو جو مدت سے صوبہ کے کرتا دھرتا تھے ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی صدارت کے ضرور معاون ہو جاتے کیونکہ ڈاکٹر صاحب ایک تو اکل کھرے شیلٹ تھے دوسرے انہیں مولانا عبدالقادر قصوری کے ہمراہیوں مجلس احرار کے راہنماؤں اور میاں افتخار الدین کے ساتھیوں سے کوئی تعلق ہی نہ تھا دونوں ایک دوسرے کے بارے میں حسن ظن نہیں رکھتے تھے سب سے بڑھ کر یہ کہ ڈاکٹر کچلو کو مولانا ابوالکلام سے ناراضی تھی غرض بھارگو کا دل کچلو کے سوا کسی بھی مسلمان کی طرف مائل نہ تھا یا پھر یہ کہ اُن کے دل میں کسی بھی مسلمان کے لیے احترام نہ تھا۔

بھارگو اور سمبڑیالوی

شہزادہ آزاد سمبڑیالوی کانگرس کے کل وقتی کارکن تھے تھوڑی بہت تنخواہ بھی ملتی ہو گی ۴۲ ۱۹ء میں وہ بھی پکڑے گئے۔ ملتان جیل میں انہیں اعضاء میں درد کا عارضہ ہو گیا مرض بڑھا تو لاہور بھیج دیئے گئے گوپی چند بھارگو کے احاطہ ہی میں شہزادہ آزاد کو رکھا گیا وہ دن بھر تڑپتے رہے لیکن ڈاکٹر بھارگو کو جوں تک نہ رینگی معاً شہزادہ صاحب کا بخار تیز ہو گیا چہرہ پر ورم آنے لگا جسم سوج گیا میجر حبیب اللہ شاہ دوڑے دوڑے آئے انجکشن دیا شہزادہ صاحب

کو قدرے سکون ہوا میجر صاحب نے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو سے کہا کہ وہ ہر تین گھنٹے بعد انہیں ایک انجکشن دیتے رہیں ڈاکٹر صاحب نے صاف جواب دے دیا کہ وہ اس خدمت سے معذور ہیں شہزادہ صاحب صبح ہی سے نڈھال ہو رہے تھے ڈاکٹر بھارگو اپنی نشست پر چرخہ کاتتے رہے۔ ویش بند ھو گپتا کتابیں پڑھتے رہے کسی نے پوچھا تک نہیں بلکہ انہیں ناگوار تھا کہ ان کے ساتھ کیوں رکھا گیا ہے مسلمان اور مندر ہیں اطرفین کی حیثیت میں فرق بھی تھا۔۔۔۔۔۔ اقصور شہزادہ صاحب کا یہ تھا کہ وہ کسی وقت ڈاکٹر صاحب کا ساتھ چھوڑ گئے تھے بھارگو سپرنٹنڈنٹ سے مطالبہ کیا کہ مریض کو جیل کے ہسپتال میں بھجوا دیں سپرنٹنڈنٹ نے جگہ نہ ہونے کا عذر کیا اگلے روز سر منوہر لال وزیر جیل خانہ آنکلے یا بلوائے گئے تو ڈاکٹر صاحب نے فوری طور پر شہزادہ کو واپس ملتان بھجوا دیا۔ ڈاکٹر صاحب کو اندازہ تھا کہ ان کی اس ذہنیت کے خلاف ناراضی پیدا ہو گی لیکن وہ اپنی ہٹ کے پکے تھے۔

مہاتما گاندھی نے انفرادی ستیہ گرہ شروع کیا تو ڈاکٹر صاحب کے حکومت میں رسوخ کا یہ حال تھا کہ جس شخص کو چاہتے بہتر کلاس دلوا دیتے جسے چاہتے پیرول پر رہا کروا دیتے سردار سکندر حیات نے انہیں رعایت دے رکھی تھی کہ وہ صوبہ بھر کی جیلوں کا دورہ کریں پولیٹیکل قیدیوں کے آرام و آسائش کا جائزہ لیں اور اس ضمن میں جو تجویز مناسب سمجھیں وزارت کو لکھیں بلا تاخیر عمل ہو گا لیکن اس سے کانگریس کے ہندو دوستوں ہی کو فائدہ پہنچا مسلمان کانگریس میں خال خال تھے گنتی کے جو لوگ تھے ان میں سے دو چار کو بہتر کلاس مل گئی لیکن ان کی حیثیت یہ تھی کہ جیسے بہتر کلاس خیرات کے طور پر دی گئی ہو احرار کے معاملہ میں سردار سکندر حیات اور ڈاکٹر گوپی چند بھارگو ہمخیال تھے نتیجتہً مسلمان قیدیوں سے جو نامناسب سلوک بھی ہو سکا روا رکھا گیا اس تشدد و بہیمیت کے خلاف کہیں سے کوئی آواز نہ اٹھی۔

سر منوہر لال ڈاکٹر گوپی چند کے اشارۂ ابرو پر چلتے تھے پولیٹیکل قیدیوں کے معاملہ میں جو چاہتے ہو جاتا کسی عذر یا تاخیر کا سوال ہی نہ تھا۔

ہم نے مولانا داؤد غزنوی سے عرض کیا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے اس سنگدلانہ رویہ کی کیا توجیہہ کرتے ہیں؛ لیکن وہ خود کشیدہ خاطر تھے سرد آہ بھر کر چپ ہو گئے ہم نے آزاد ممبر بالوی کی علالت سے بدسلوکی پر خود ڈاکٹر گوپی چند سے احتجاج نما گلہ کیا لیکن یہ کہہ کر ٹال گئے کہ میں کیا کر سکتا تھا اور ایک بیمار کی ذمہ داری کیونکر لے سکتا تھا؛ کلبیر سنگھ کو غصہ آ گیا اُس نے کہا

"جی ہاں ایک اہنسا وادی یہی کہہ سکتا ہے"

ڈاکٹر صاحب انتہائی ٹھنڈے دل و دماغ کے آدمی تھے جو انہیں کرنا تھا وہ کر چکے تھے بات آئی گئی ہو گئی لیکن اس ایک واقعہ نے کئی واقعات کو جنم دیا جس سے فکر و نظر کے اختلاف میں کھلم کھلا تصادم ہو گیا۔

سلیفی کاشمیری

مجھے یہاں آئے ہوئے کوئی دو ماہ ہو چکے تھے اور اب میں ہر شخص کی طبیعت و مزاج سے آشنا تھا کانگرسی زعماء اور کمیونسٹوں کو چھوڑ کر باقی جتنے نوجوان تھے مجھے اپنا سرخیل سمجھتے اور مسلمان قیدی تو کچھے جاتے تھے اِلّا سلیفی کاشمیری جس نے سیاسی زندگی کا آغاز مجلس احرار اسلام لاہور کی سیکرٹری شپ سے کیا لیکن الیکا ایکی کانگریس میں جا پہنچا اور کانگریس کے اُس گروہ میں شریک تھا جو مسلمانوں کے خلاف تھا۔ سلیفی بموں کے خول رکھنے میں قید ہوا تھا اُس کے والد انار کلی میں درزی کی دوکان کرتے اور نہایت نیک نفس انسان تھے یشپال نے اس شرط پر اس کی ضرورتوں کا ہاتھ بٹایا تھا کہ وہ ہندی سیکھے گا

اور آئندہ ہندی ہی میں اُس کو خط لکھے گا چنانچہ اُس نے جیل میں صرف یہی کام کیا اس کو نہ اسلامیت سے کوئی شغف رہا اور نہ وہ کسی گروہ یا جماعت ہی سے وابستہ تھا جب ٹیررسٹ وارڈ کی آبادی بڑھی تو اُس کو کسی اور جیل میں بھیج دیا گیا جب تک وہاں رہا یشپال ہی کا ہو کے رہا اُس نے خود سپردگی قبول کر لی تھی۔ کسی ساتھی کو اُس پر اعتماد نہ تھا۔ بعض نوکدار زبانیں اس کی عاداتِ خفی و جلی پر اکثر و بیشتر تبصرہ کرتیں لیکن ہمارے لغت سے وہ خارج ہو چکا تھا۔

سید حبیب

سید حبیب کے معاملہ میں مجھے ایک عجیب کشمکش سے گزرنا پڑا۔ اُن کے خاندان سے میرے خاصے تعلقات تھے۔ گو ان تعلقات کا آغاز مسٹر مقبول انور داؤدی مدیر معاون روزنامہ سیاست کی بدولت ہوا تھا جو میری طالب علمی کے زمانے سے دوست تھے۔ میں نے شعر کہنا شروع کئے اور کسی قدر مشق ہو گئی تو ان کی وجہ سے سیاست میں چھپنا شروع ہوتے۔ اِس طرح سیاست مرحوم کے عملہ سے ایک دوستانہ علاقہ پیدا ہو گیا۔ سید حبیب کے برادر خورد سید عنایت اللہ شاہ بڑے ہی نیک نفس انسان تھے ان کے دو بڑے لڑکے سید عطاء اللہ شاہ اور سید عتیق اللہ شاہ میرے جگری دوست بن گئے عنایت شاہ مجھے بھی بیٹوں کی طرح سمجھنے لگے سید حبیب اپنے بھائی کے بالکل اُلٹ تھے عنایت شاہ کے وجود میں ایک مثالی انسان بسا ہوا تھا۔ سید حبیب شاہ بدگمان طبیعت کے انسان تھے عنایت شاہ فقیر منش تھے لیکن سید حبیب فقیری میں بادشاہی کے خواب دیکھتے۔ ان کی اخبار نویسی کا انحصار دشنام و سلام پر تھا جس سے بگڑتے اُس کی تباہی پر تُل جاتے۔ خود اسی تباہی کے ہاتھوں تباہ ہو گئے۔ اُن کی سیاسیات میں ذاتیات کا حصہ تھا جس سے دوستی گانٹھی جب تک بنی رہی

بنی رہی۔ پھر اُس کے لئے اصول یا صداقت جو کچھ ہوتا قربان کر دیتے ٹھن گئی تو پھر ان کے سامنے کوئی سا اخلاقی اصول نہ تھا وہ اپنے دشمن کو ہر ہتھیار سے قتل کرنا جائز سمجھتے تھے لاہور میں مسلمانوں کے تین روزنامے تھے زمیندار' انقلاب اور سیاست' پہلے دو تو اپنے ایڈیٹروں کی قابلیت اور وجاہت کے باعث قابل اعتنا تھے مولانا ظفر علی خان کی ہجو نگاری سے لوگ ڈرتے تھے لیکن وہ ایک ادیب طناز تھے جو کچھ لکھتے زبان و بیان کی خوبی سامنے رکھ کر لکھتے۔ سیّد حبیب برہنہ گفتن کے سوا کچھ جانتے ہی نہ تھے جس کے پیچھے پڑ گئے اس کی عزت و آبرو کے دشمن ہو گئے اُن کے مزاج میں غرور تھا اِدھر اُدھر سے روپیہ جمع کر کے لاتے تو دفتر میں نواب بن کر بیٹھتے یہ روپیہ ختم ہو جاتا تو پھر دورہ پر نکل جاتے۔ ان کے اخبار کی حیات کا انحصار زیادہ تر بڑے چھوٹے جاگیرداروں اور اُڑتے پھرتے دولتمندوں کی امداد پر تھا۔

شہید گنج کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن جب تحریک ٹھنڈی پڑ گئی تو پیر جماعت علی شاہ سے اُلجھ گئے کیونکہ وہ مرزا معراج الدین سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی کے مریدوں کے نرغہ میں تھے اور وہی بولی بولتے جو مرید بولتے تھے سید حبیب مدة العمر سید جماعت علی شاہ کے حامی رہے بلکہ اُن کی سیاسی شہرت کو قائم کرنے میں حصہ لیا دونوں میں تعلق خاطر تھا مرزا معراج الدین نے شہید گنج کی "بلا" کو ٹالنے کے لئے جب اُنہیں حج پر بھجوانا چاہا تو سید حبیب آڑے آ گئے انہوں نے پیر صاحب سے کہا کہ وہ اس مرحلہ میں حج پر نہ جائیں۔ پیر صاحب نہ مانے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سید حبیب کی پیر صاحب سے ٹھن گئی جس دن وہ حج کو جا رہے تھے اُن کے بعض مریدوں نے سید صاحب کو پیغام دیا کہ پیر صاحب یاد فرما رہے ہیں۔ سید صاحب نے ترش لہجہ میں جواب دیا کہ وہ ان سے ملنے کے لیئے ہرگز ہرگز تیار نہیں ہیں مرزا معراج الدین سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی بڑے ہوشیار اور کائیاں آدمی تھے شہید گنج کی تحریک کو انہوں نے بڑی چابکدستی

سے ناکام کیا تھا سید صاحب اس بُری طرح اُلجھے کہ تلواریں ٹکرا گئیں سید صاحب بے عزت کرنے سے نہ رکتے تھے میرزا معراج دین بدلہ لینے میں مشتاق تھے سید حبیب مولانا ظفر علی خان سے اُلجھ پڑے ڈاکٹر عالم کو بھی رگیدا۔ الیکشن کا نتیجہ نکلا تو سردار سکندر حیات کو دھر رگڑا، سر ڈگلس ینگ پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جج تھے اُن سے پیچ پڑا تو چت کر کے دم لیا سر ہربرٹ امیرسن صوبے کے گورنر نے ملاقات میں بدتمیزی کی تو پیچھے پڑ گئے۔ قلم کی نوک پر جو آیا مارا گیا۔ سردار صلاح الدین سلجوقی ہندوستان میں افغانستان کے قونصل جنرل تھے اُن سے مدتوں دوستانہ رہا۔ بگڑے تو ایسے بگڑے کہ بے پناہ ہو گئے غرض سیاستؔ انہی لڑائیوں کے ہاتھوں تباہ ہو گیا جنگ کے زمانہ میں سرکار کے ہتھے چڑھ گئے حکومت نے افغانستان کی شکایت پر نظر بند کر دیا۔ اندر بھی لڑائی باندھ رکھی تھی سرکار نے ہر طرح کی مراعات دی ہوئی تھیں۔ جیل کے حکام عزت سے پیش آتے لیکن سید صاحب کی طبیعت کو چین نہ تھا گورنر کو خط لکھا کہ مجھے اپنی بیٹی کا نکاح کرنا ہے لہذا ایک ماہ کی رخصت دی جائے درخواست مسترد ہو گئی سید صاحب نے آؤ نہ دیکھا تاؤ گورنر کو ایک اور خط لکھا جس میں سکندر حیات کو ملاحیاں سناتے ہوئے یہاں تک لکھ دیا کہ انگریز تو نکاح کی اہمیت کو سمجھتے ہی نہیں کیونکہ ان کے معاشرہ میں نکاح سرے سے ہے ہی نہیں سکندر حیات کے نزدیک بوجوہ نکاح متروک ہے وغیرہ ظاہر ہے کہ یہ خط غیر شریفانہ اور ناقابل برداشت تھا شاہ صاحب کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ اس کے علاوہ اور کئی اسباب تھے جن کے باعث انہیں لاہور سے اُٹھا کر کسی دور دراز جیل میں بھیج دیا گیا۔ ع

یہ تباہی تھی خود اپنے ہاتھ کی لائی ہوئی

شاہ صاحب چاہتے تو لاہور میں رہ سکتے تھے یہاں انہیں بہت زیادہ آرام حاصل تھا خود منوہر لال ان کا خیال رکھتے سپرنٹنڈنٹ جیل میجر حبیب اللہ شاہ ایک تو خود شریف النفس انسان

تھے دوسرے میرزا البشیر الدین محمود نے بھی انہیں کہہ رکھا تھا۔ شاہ صاحب قیمتی سے قیمتی دوائیں سرکاری خرچ پر حاصل کرتے کھانے پینے کو بھی بہت کچھ ملتا اب چونکہ کاروبار کی تباہی سے گھر کے حالات بدل گئے تھے اور بیویاں بھی دو تھیں اور ان دونوں کے گھر بھی الگ الگ تھے اس لیئے سبھی کچھ گھر بھجوا دیتے ٹفن کیریر صبح آتا اور شام کو یہ چیزیں اُس میں بند ہو کر چلی جاتیں۔ جنگ کا زمانہ تھا۔ دوائیاں مہنگی تھیں بازار میں بک جاتی تھیں۔

شاہ صاحب نے دو چار بڑے ہندوؤں کے ساتھ رسم و راہ رکھی لیکن وہ بھی دل سے ان کی عزت نہ کرتے تھے ان کے سوا ہر ایک سے اُن کا جھگڑا تھا برتری کون مانے؟ چھوٹی چھوٹی شکائیتیں جمع ہوتی گئیں نتیجۃً بعض دوستوں سے تصادم ہو گیا میں شاہ صاحب کی عزت ہی کرتا رہا اس کی وجہ اُن کے بھائی اور بھتیجے تھے لیکن شاہ صاحب کو ایک تو عمر نے چڑچڑا کر دیا تھا اُدھر مزاج ہی کچھ ایسا پایا تھا اس کے علاوہ گھر کی صورتحال سے پریشان تھے مستقبل قریب میں رہائی کا امکان نہ تھا دھونس سے رہنا چاہتے تھے اور حکومتیں ان حالات میں دھونس کہاں مانتی ہیں۔

شیو کے لیئے اُسترا

جیل میں شیو بنانے کے لیے سیون او کلاک کے بلیڈ ملتے تھے میری طرح کچھ دوست ایسے بھی تھے جو خود شیو نہ بنا سکتے تھے ہم نے سپرنٹنڈنٹ سے درخواست کی کہ وہ ہمارے لئے حجام کا بندوبست کریں سپرنٹنڈنٹ راضی ہو گئے لیکن عذر یہ کیا کہ قواعد کی رو سے اُسترا جیل میں نہیں آ سکتا اور نہ قیدی حجام اپنے پاس رکھ سکتا ہے طے یہ پایا کہ سید صاحب چونکہ عمر میں سب سے بڑے ہیں اور اُن سے اُسترا کے غلط استعمال کا خطرہ بھی نہیں، لہٰذا وہ اپنے

پاس اُسترا رکھیں حجام ہر روز صبح سویرے حجامت کر جایا کریگا۔ شاہ صاحب نے اس کو بھی اپنی بالادستی پر محمول کیا حجام کو حکم دیا کہ سب سے پہلے اُن کا خط بنایا کرے دو قیمتی اُسترے منگوائے گئے کوئی ستر اسّی روپے میں آئے تھے۔ ایک اُسترا شاہ صاحب نے اپنے لئے مخصوص کر لیا دوسرا سارے احاطہ کے لیے، شاہ صاحب نے کمال یہ کیا کہ دونوں اُسترے گھر بھجوا دیتے اور ان کی جگہ دس پندرہ روپے کا ایک استرا منگوا کر رکھ دیا اپنا خط وہ بلیڈ سے بنواتے رہے جس روز پریڈ ہوتی ہم صبح سویرے شیو بنواتے اور کپڑے بدلتے تھے ایک دن شاہ صاحب بال کٹوانے لگ گئے معمول یہ تھا کہ صبح شیو بنواتے اور دوپہر کو بال کٹواتے تھے سپرنٹنڈنٹ صاحب کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ سید صاحب سے عرض کی کہ وہ حجام کو ذرا جلدی فارغ کر دیں، شاہ صاحب نے تاخیر کر دی حتیٰ کہ بلاوجہ ضدی ہو گئے ہم خاموش رہے شاہ صاحب خوردوں کی عزت نفس کا مطلقاً احترام نہیں کرتے تھے۔ ہم نے حجام سے کہا بھائی یہ اُسترا ہمارے لیے آیا ہے آپ سب سے پہلے ہماری شیو بنا دیا کریں حجام نے کہا شاہ صاحب نہیں مانتے۔ ہم نے کہا وہ شیو نہیں بنواتے صرف داڑھی کے فالتو بال ترشواتے ہیں ــــ شاہ صاحب بگڑ گئے۔ ہم سی کلاس والوں کو ڈانٹتے ہوتے فرمایا: سب سے پہلے اے کلاس قیدیوں کی حجامت بنے گی سی کلاس قیدیوں کی باری بعد میں آتی ہے کوئی حق نہیں ان کا اُنہیں محض رعایت دی گئی ہے۔"

اس قسم کی باتیں وہ عموماً کیا ہی کرتے تھے اب جو انہوں نے اس طرح زبان کھولی تو بی کلاس قیدیوں میں سے ایک کوتاؤ آگیا۔ شاہ صاحب کو سختی سے ٹوکا شاہ صاحب کا فرض تھا کہ وہ انہیں جواب دیتے لیکن انہوں نے اُلٹا مجھے مطعون کرنا چاہا حالانکہ میں ان کے بھائی کی وجہ سے اُن کا احترام کرتا اور اس قصّہ سے الگ تھا لیکن شاہ صاحب ان

دلنوں بھائی سے بھی ناراض تھے بھائی کا گلہ کرنے لگے کہ میں اُن کے اشارے پر ان سے خدانخواستہ کدر کھتا ہوں اور جو کچھ ہو رہا ہے اُن کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ سید عنایت شاہ میں شر کا شائبہ تک نہ تھا وہ حقیقتاً فرشتہ سیرت انسان تھے۔

دونوں بھائی اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن عنایت شاہ کو خراج ادا کرتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں اس قسم کے لوگ بھی موجود تھے اور سید حبیب کے بارے میں یہ خیال مانع ہے کہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور یہی چیز اُن حالات کے افشا کرنے میں روک بنی ہوئی ہے جن حالات نے انہیں عبرت کا ورق بنا دیا تھا ـــــــ شاہ صاحب کی یہی مصنوعی رعونت انہیں لے ڈوبی اور وہ کہیں کے نہ رہے۔ اُسترے کے معاملہ میں آپے سے باہر ہونے کا نتیجہ یہ نکلا کہ گھر میں اُسترے بھجوا دینے کا راز فاش ہو گیا۔ شاہ صاحب نے حجام کو گالیاں دیں کہ اُس نے یہ راز کھولا ہے اب ایک طرف اکیلے شاہ صاحب، دوسری طرف ٹیررسٹ وارڈ کے سبھی قیدی، نوبت بہ اینجا رسید کہ شاہ صاحب کو لاہور جیل سے نکلنا پڑا مظفر گڑھ یا کسی اور جیل میں اُن کا چالان کر دیا گیا جاتے جاتے ڈٹ گئے میں نہیں جاتا حکام نے منتیں کیں ہاتھ جوڑے لیکن شاہ صاحب ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے آخر جیل والوں نے آنکھیں دکھائیں شاہ صاحب سیدھی انگلی گھی نکلنے ہی نہ دیتے تھے ساتھیوں کی ہمدردیاں پہلے ہی کھو چکے تھے ایک تو اس قسم کے واقعات ان کے ہاں عام تھے دوسرے انہوں نے رہائی کے لئے گورنمنٹ آف انڈیا کے ہوم ممبر اور صوبائی سرکار کے مقدمہ میں کمیٹی کو جو عرضداشتیں بھیجیں اور ان میں جو واقعات لکھے تھے وہ سیاسی اخلاق کے منافی تھے شاہ صاحب نے ان عرضداشتوں میں تحریر کیا تھا کہ وہ فلاں فلاں موقع پر فلاں فلاں ریاستوں میں فلاں فلاں نوعیت کی باون [۵۲] خدمات انجام دے چکے ہیں جس افغانستان کی شکایت پر انہیں نظر بند

کیا گیا ہے وہاں بھی حکومت ہند کی خواہش پر فلاں کام کیا تھا اور اب انہیں صرف اس لیے قید میں رکھا جا رہا ہے کہ سکندر حیات ان کے ذاتی مخالف ہیں۔

بہر حال شاہ صاحب کو وارڈروں اور قیدی نمبرداروں نے زبردستی کاندھے پر اٹھایا اور ایک عجیب مضحک انداز میں ڈیوڑھی تک لے گئے جہاں انہیں پولیس گارد کے حوالے کر دیا گیا شاہ صاحب کے جانے کا کسی کو قلق نہ تھا سبھی خوش تھے اور اس کی وجہ جیسا کہ عرض کیا خود شاہ صاحب ہی تھے۔

یوسف مہر علی نے شاہ صاحب کی عرضداشتوں کو اپنی آنکھوں دیکھا تھا اور غالباً انہیں سپرنٹنڈنٹ نے وہ تحریریں دکھاتی تھیں انہی سے یہ باتیں راز دار دوستوں میں پہنچی تھیں عرضداشتوں میں جن خدمات کا حوالہ دیا گیا اُن میں ایک خدمت یہ تھی کہ عزیز ہندی افغانستان سے واپسی پر جب شاہی قیدی بنا دیئے گئے تو حکومت نے بہت چاہا کہ ان سے کچھ حاصل کرے لیکن تمام کوششیں رائیگاں ہو گئیں شاہ صاحب حکومت کے کام آتے تھے۔

عزیز ہندی

عزیز ہندی ۱۹۱۴ء میں ہجرت کر کے افغانستان گئے تھے وہاں سالہا سال رہے مختلف سفارت خانوں سے تعلق پیدا کیا کئی انقلابی تحریکوں کی مالی اعانت کرتے رہے اُن کے سامنے برطانوی حکومت کو اُلٹا دینے کا ایک مشن تھا امان اللہ خاں ہٹ گئے تو انہیں بھی ہندوستان آنا پڑا پنجاب سی آئی ڈی کے مسلمان افسروں نے اُنہیں بہت ستایا لیکن اُن سے کچھ نہ لے سکے۔ شاہ صاحب نے ہوم سیکرٹری سے رابطہ پیدا کر کے اس سلسلہ میں اپنی خدمات پیش کیں سودا بھی ہو گیا لیکن ایک اُلجھن رہ گئی شاہ صاحب چاہتے تھے کہ

عزیز ہندی سے اکیلے ملیں اُن سے اپنی رشتہ داری بھی ظاہر کرتے تھے لیکن سی آئی ڈی تنہا ملاقات پر متفق نہ ہوئی شاہ صاحب نے بہتیرے جتن کئے تمام اکارت گئے آخر میرزا معراج دین سپرنٹنڈنٹ سی آئی ڈی کے ہمراہ ملاقات ہوئی عزیز ہندی اناڑی نہیں تھے بیل منڈھے نہ چڑھی دونو خالی ہاتھ لوٹ آئے میرزا معراج دین نے کسی دوست سے اِس واقعہ کا ذکر کیا تو میں اس وقت یہی سمجھا کہ سی آئی ڈی نے حسب عادت گپ چھوڑی ہے لیکن شاہ صاحب کے اپنے اعترافات سے یہ بات ثابت ہوگئی ——

عزیز ہندی بھی اُسی بیرک میں تھے۔ ایک دن انہوں نے خود ہی یہ سارا قصہ بیان کیا کہ شاہ صاحب کس طرح اُن سے راز حاصل کرنے آتے تھے ان کے دل میں بھی شاہ صاحب کے لیئے کوئی وقعت نہ تھی وہ ایک دیوانہ مزاج انقلابی اور اسلام دوست فلسفی تھے۔ مطالعہ اُن کا بہت وسیع تھا۔ عصر حاضر کی تمام تحریکوں کے عالم تھے۔ ان سے میں نے سوشلزم کمیونزم فاشزم اور انارکزم کے بارے میں کئی کتابوں کا علم حاصل کیا۔ بعض چیزیں سبقاً سبقاً پڑھتا رہا اُن کا عقیدہ تھا کہ انسانیت کی بھلائی کے لئے اسلام کی تعلیمات سے زیادہ کوئی فلسفہ یا فکر موزوں نہیں ہے۔ اس موضوع پر وہ بہت کچھ لکھتے رہے لیکن طبع نہ کرایا امان اللہ خان کے عزل پر اُن کی کتاب "زوال غازی" بڑی معلوماتی دستاویز ہے پاکستان بنا تو بروایت خان لیاقت علیخان کے ایما۔ پر آزاد قبائل میں چلے گئے وہاں جن کے ہاں مہمان ٹھہرے تھے ان کی معرفت حکومت افغانستان کے ہاتھ آگئے۔ سترہ برس تک کچھ پتہ نہ چلا کہ حیات و موت کی کس سرحد پر ہیں؟ ایک روز اچانک افغانستان سے رہا ہو کر لاہور پہنچ گئے ہیں۔

اب وہ ایک مشتِ اُستخوان ہیں قدرت نے ان کی صحت کو ایک ایسا کھنڈر بنا دیا ہے جس کی رونق مر چکی ہو سترہ برس کی قید نے ان کے دل و دماغ دونو کو متاثر کیا ہے حواس خمسہ

کا ایک احتجاج رہ گئے ہیں۔ طبیعت میں ایک ولولہ ضرور ہے اور یہ ولولہ ہمیشہ ان کے ساتھ رہا ہے لیکن جس دنیا میں اب لوٹ کر آتے ہیں وہ اتنی تیز رفتار واقع ہوئی ہے کہ ان کے خیالات اور اس کے واقعات میں مطابقت پیدا کرنا ناممکن ہو چکا ہے بہر حال ان کے افکار کی ایک اڑان ہے اور وہ اس دشتِ افکار میں قلبِ آبلہ پا کی طرح ہیں۔

جیل یا کلب

جیل تو بہر حال جیل ہے لیکن لاہور سنٹرل جیل مقابلتہً آرام دہ تھا۔ سوسائٹی اتنی اچھی مل گئی تھی کہ اکاڈمی کا نقشہ بن گیا تھا۔ دن رات سیاسیات کے موضوع پر بات چیت ہوتی۔ ادب بھی چلتا شاعری بھی ہوتی جدید و قدیم کا تذکرہ رہتا۔ لطیفے اُڑتے تو دلوں ہی سماں بندھا رہتا کئی کئی راتیں اُسی کی نذر ہو جاتیں طعن وطنز کا بازار گرم ہوتا مگر لطافت ہاتھ سے نہ چھٹتی تاریخ، سیاست، معاشیات تو گویا روزمرہ کے مضامین تھے ادب سے کم لوگوں کو دلچسپی تھی شاعری کا چسکہ چودھری کرشن گوپال دت کو تھا لیکن بانگ درا کی بعض نظموں تک ۔۔۔! وہ خوش آواز تھے لہک لہک کر پڑھتے۔ بیوپار منڈل والوں کو اقبال کی بیشتر نظمیں اپنے ہی نام سے سناتے ۔۔۔ چودھری صاحب نے اپنے بارے میں یہ تاثر پیدا کر رکھا تھا کہ وہ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری سے بڑے خطیب ہیں اور ہندوؤں میں اُن سے بڑھ کر کوئی مقرر نہیں لیکن ان کی معلومات بڑی سطحی تھیں۔

یوسف مہر علی

یوسف مہر علی تاریخ اور سیاسیات کے عالم تھے انگریزی ادب کا مذاق بھی خوب

پایا تھا خود مصنف اور مؤلف تھے "ہمیں کیا پڑھنا چاہیئے" اس عنوان سے انہوں نے انگریزی میں ایک کتاب لکھی تھی جس کے تشریحی حواشی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس قدر وسیع المطالعہ ہیں اُس وقت اُن کی عمر ۳۰-۳۲ سال کے لگ بھگ تھی۔ سرخ و سپید رنگ، کتابی چہرہ، کھلا ماتھا، لمبی پلکیں، سُرمگیں آنکھیں، میانہ قد، گفتگو میں رس، چال میں آہستہ خرامی، ملکہ خرامی، بمبئی کے ایک بڑے گھرانے کا چراغ تھے جے پرکاش نارائن اچھوت پٹوردھن اور رام منوہر لوہیا کے ساتھ مل کر سوشلسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی اور اسی کے ہو گئے تھے گاندھی جی سروجنی نائیڈو اور مولانا آزادؒ انہیں بے حد عزیز رکھتے انہوں نے بہ عنوان "ہمارے لیڈر" کانگریسی راہنماؤں کے سوانحی خاکے بھی لکھے تھے۔ یہ کتابچہ بے حد مقبول ہوا اور کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کر لاکھوں کی تعداد میں بِک گیا۔

معمول یہ تھا کہ صبح سویرے اُٹھتے اور مجھے ساتھ لے کر احاطہ میں ٹہلا کرتے کئی عنوانوں پر گفتگو رہتی افراد و شخصیات خصوصیت سے زیر بحث آتے۔ ان دنوں وہ "سیاحتِ پاکستان" کے نام سے ایک کتاب لکھ رہے تھے اس کتاب کی اکثر معلومات دوستوں سے حاصل کرتے۔ بالخصوص مسلم سیاسیات کے بارے میں میرا نقطہ نگاہ معلوم کر کے اس کا تجزیہ کرتے اور خاصی بحث کے بعد کسی رائے پر متفق ہوتے۔ رات کو جب گنتی بند ہوتی تو گھنٹہ دو گھنٹہ ٹہلتے۔ میں ساتھ ہوتا انہی موضوعات پر گفتگو ہوتی وہ جیل میں ضابطے کے سختی سے پابند تھے کبھی فضول بحث نہ کرتے نہ منڈلی لگاتے، نہ عام جھگڑوں میں پڑتے تمام دن پڑھتے یا لکھتے کھانا بھی اپنے ہی کمرے میں کھاتے بس ٹہلنے کے وقت باہر آتے انہیں مجھ سے ایک اُنس ہو گیا تھا وہ ان لوگوں میں سے تھے جو اپنی سیرت کا عکس دوسروں پر ڈالتے ہیں کوشش اُن کی یہ تھی کہ میں رہائی کے بعد سوشلسٹ پارٹی میں شریک ہو جاؤں۔ وہ مجھے

اپنے ہائی کمانڈ میں لینے کی خواہش کا بھی اظہار کرتے رہے مگر میں اُن کے ڈھب کا نہ تھا۔ میں ہندوستان سے برطانوی حکومت کے انخلا کی حد تک نونیشلسٹ تھا لیکن میرے دل و دماغ میں کچھ عصبیتیں بھی تھیں میرے تجربہ نے مجھے نیشلزم کی ہندو چھاپ سے باغی کر دیا تھا۔ میں اقوال کی جگہ اعمال دیکھتا جب بھی کانگریس کے بعض راہنما مجھ سے آزادی کے سوال پر گفتگو کرتے یا ملکی سیاسیات زیر بحث آتیں میں مسلمانوں کی انفرادیت کے مسئلہ کو نمایاں کرتا تاہم میرا نقطۂ نگاہ قریب قریب وہی تھا جس کا اظہار ایک دفعہ مولانا ابوالکلام آزادؔ نے کیا تھا کہ

"ہندو من حیث الجماعت تنگ دل اور تنگ نظر ہیں مسلمان من حیث الجماعت بزدل اور کوتاہ اندیش"

صحیح الفاظ تو میرے سامنے نہیں ممکن ہے ایک آدھ لفظ کا فرق ہو لیکن اجتماعی مفہوم یہی تھا ایک دفعہ یوسف مہر علی کی موجودگی میں ہندو مسلم مسئلہ پر بحث ہو رہی تھی۔ میں نے مولانا محمد علی کا یہ فقرہ نقل کیا تو بھڑک اُٹھے،

"وہ ہندو جو اپنے آپ کو نیشلسٹ کہتے ہیں کمیونسٹ ہیں اور وہ مسلمان جو اپنے آپ کو کمیونسٹ ظاہر کرتے ہیں خود غرض ہیں"

وہ تاریخ کے مادی پس منظر پر یقین رکھتے اور اس کے احوال و ظروف کی روشنی ہی میں اقوام و ملل کے افکار و اعمال کو پرکھتے تھے میں نے جب انہیں پنجاب کانگریس کے نیتاؤں کے خدوخال سے آگاہ کیا اور اس بات کی صراحت کی کہ ان لوگوں کا سیاسی چال چلن کیونکر مشکوک ہے تو وہ حیران رہ گئے مثلاً اس دوسری جنگ عظیم کے آغاز میں احرار نے سب سے پہلے برطانوی سامراج کو للکارا اور فوجی بھرتی کے بائیکاٹ کا اعلان کیا سکندر وزارت نے احرار کو اس بُری طرح مارا کہ مظالم کی حد ہو گئی ڈاکٹر گوپی چند بھارگو اور اُن کے ساتھی نہ صرف تماشا دیکھتے

رہے بلکہ در پردہ سکندر وزارت کی اعانت کی۔ لیگی ذہن کے مسلمان احرار کو کانگرس کا اجیر سمجھتے اور کانگرس کے ہندو نیتا کٹھ ملا ان کے نزدیک احرار صوری اور معنوی لحاظ سے فرقہ پرور ہی تھے یہ واقعہ ہے کہ پنجاب کانگریس کے ہندو راہنماؤں نے سکندر وزارت سے ذہنی طور پر سمجھوتہ کر لیا تھا کہ کانگرس سے باہر وہ جس مسلمان جماعت سے جو سلوک بھی چاہیں کریں انہیں کوئی تعرض نہ ہوگا یہی ہوا۔ احرار پٹتے رہے کانگریس نے تماشا دیکھا مسلمانوں نے قہقہے لگاتے انگریز مطمئن رہا کہ مٹھی بھر لوگوں کی ایک مسلمان جماعت گھر میں اور گھر سے باہر کسی اعتنا کے قابل نہیں ہے یوسف مہر علی کو جب ان تفصیلات کا علم ہوا تو وہ ششدر رہ گئے۔ بلکہ انہیں قلق ہوا کہ کتنے ہی اصول بعض افراد کی وجہ سے ناکارہ ہو جاتے ہیں وہ خود بھی اپنی آنکھوں سے کئی واقعات دیکھ چکے تھے۔ جتنے دن یہاں رہے ہر روز ہندو ذہنیت کا تجربہ کرتے رہے۔ ایک دن انہوں نے مختلف واقعات و حالات کی کڑیاں ملاتے ہوئے مہاتما گاندھی کے اس قول کا اظہار کیا کہ ——

"پنجاب سی آئی ڈی کا صوبہ ہے"

مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اپنے ایک خطبہ میں لکھا ہے کہ ——

"اس زمین نے حق و انصاف کے خلاف سب سے زیادہ خون بہایا ہے"! بعض نوجوانوں نے مولانا سے استفسار کیا کہ وہ پنجاب میں کیوں نہیں آتے؟ یہاں کے حالات زیادہ خراب ہیں فرمایا "جو وجہ یہاں آنے کی ہے وہی نہ آنے کی؛" آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بڑے بڑے راہنماؤں نے پنجاب کانگریس کو کبھی عزت یا مسرت سے نہیں دیکھا —— یوسف مہر علی کا یہ تاثر اور بھی گہرا ہو گیا چنانچہ جب وہ رہا ہو کر بمبئی واپس جانے لگے تو ان حالات سے کچھ زیادہ خوش نہ تھے یہاں وہ تھوڑے سے دن رہے لیکن اپنی عالمانہ بصیرت کا نقش چھوڑ گئے

ایک سٹڈی سرکل کی بنیو رکھی جس میں ملکی و قومی نوعیت کے مختلف تاریخی وسیاسی موضوعات پر مذاکرہ ہوتا ہم میں سے کچھ دوست پنجاب پبلک لائبریری کے ممبر تھے وہاں سے متعلقہ موضوع پر کتابیں منگوا کر ہفتہ بھر مطالعہ کرتے پھر اتوار کو ان کتابوں کی تلخیصات پیش کی جاتیں بحث و مباحثہ ہوتا آخر حاصل کلام کے طور پر ایک مقالہ ہو جاتا جس سے سبھی مستفید ہوتے بمبئی پہنچ کر بھی انہوں نے اس مجلس مذاکرہ کو جاری رکھنے کی تلقین کی کچھ دنوں بعد بمبئی کارپوریشن کے میئر ہو گئے اتنے میں ان کی کتاب "سیاحت پاکستان" (A TRIP TO PAKISTAN) چھپ کر آگئی۔ ایک باب کا سرعنوان میرا ہی ایک شعر تھا ؎

سلام ہو مرا لاہور کی فضاؤں کو!

کہ ان کی یاد میں حیران و سوگوار ہوں میں

غرض مجھ سے جو تعلق خاطر تھا اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے ہوتا ہے جو اس کتاب سے ماخوذ ہے۔

"ایک شام پتہ چلا کہ شورش کاشمیری منٹگمری جیل سے چالان ہو کر لاہور آرہے ہیں میں نے اس خبر سے ساتھیوں میں ایک خاص جذبہ پایا شورش کافی شہرت رکھتا تھا وہ آل انڈیا مجلس احرار کا جنرل سیکرٹری تھا اور بطور خطیب اُسے سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ و منشی احمد دین کے ہم رتبہ ہوتے کا فخر حاصل تھا۔ وہ شاعر بھی تھا اور طاقتور قلم کا مالک ادیب بھی۔

پاکستان کی حکومت کو (واضح رہے کہ اس وقت یہ ایک تصور تھا ـــــ راقم) اسکے انداز خطابت سے ہمیشہ شکایت رہی۔ اسی باعث اُس نے قید و بند کی بے شمار صعوبتیں اُٹھائیں اُس کی موجودہ سزا پانچ سال ہے وہ قریب قریب

تین سال گذار چکا ہے اس کی جسمانی صحت پر بہت بُرا اثر پڑا ہے۔

ہمارے احاطہ میں کوئی نو بجے شب ایک دراز قد نوجوان ٹہلتا ہوا نظر پڑا، دھان پان، چہرہ صاف ملیں بائیس برس کی عمر کا لڑکا شورش بہ لحاظ عقیدہ اُن لوگوں میں سے ہے جو عزت و آبرو کے ایک پر خروش لمحہ کو غیر معروف زندگی کی عمر دراز سے بہتر خیال کرتے ہیں۔

شورش میں عمل پہلے سوچ بعد میں ہے۔ وہ پر جوش مخلص انتہائی جذباتی اور شاعرانہ لب ولہجہ کا نوجوان ہے۔ اس کی پسند و ناپسند دونوں شدید ہیں۔ اس کا حافظہ نہایت قوی اور محکم ہے مجھے کسی نے بتایا کہ اردو شاعری میں جو چیز شورش کے حافظہ اور علم سے باہر ہے وہ قابل اعتنا ہی نہیں اس کے آنے سے فضا میں چہل پہل اور چمک دمک پیدا ہو گئی"۔

ایک دن روپیہ پیسہ کا ذکر ہو رہا تھا کہنے لگے انسان کو روپیہ پیسہ سے مطلقاً محبت نہیں کرنی چاہیئے جو لوگ روپے کی پوجا کرتے ہیں وہ سوسائٹی کے لئے ناسور ہوتے ہیں اس ضمن میں اپنا ایک واقعہ سنایا کہ میری سالگرہ تھی والد کے دوستوں نے مجھے بہت سا روپیہ دیا میں نے سو روپے کا ایک نوٹ اُڑا لیا والد کو پتہ چلا تو مجھے بلا کر کان کھینچے پھر سو روپے کے اُس نوٹ کا سگریٹ بنا کر پھونک ڈالا — فرمایا — بیٹا روپیہ کو اس سے زیادہ اہمیت کبھی نہ دینا۔ اس سے بس اتنی ہی محبت کرنا جتنی انگریز بیرے سے کرتا ہے یوسف مہر علی کنوارے تھے۔ میں نے شرارتاً دریافت کیا تو کہنے لگے والدین مجبور کرتے ہیں لیکن پارٹی کے کاموں ہی سے فرصت نہیں۔ لڑکی کے والدین ایک لاکھ روپیہ نقد دے رہے ہیں۔ پارٹی کو روپیہ کی ضرورت ہے۔ جے پرکاش مجبور کرتے ہیں کہ شادی کر لو اور جو لاکھ روپیہ مل رہا ہے

پارٹی کے حوالے کردوں تاکہ پارٹی کی مالی حالت سدھر سکے۔

"تو پھر کیا ارادہ ہے؟"

کہنے لگے "جب پارٹی کو فنڈ کی ضرورت ہے تو یہ شادی کرنی ہی پڑے گی۔"

لیکن قضا انہیں اِس سے پہلے ہی کھا گئی اور وہ جاں بار ہو گئے۔ زندہ رہتے تو ملک کے چند بڑے لیڈروں میں سے ایک ہوتے۔

کمیونسٹ اور خاکسار

دن تیر کی طرح نکلتے جا رہے تھے کام وام کوئی تھا نہیں ایک تو جو لوگ یہاں تھے وہ اعلیٰ مرتبہ کے پولیٹیکل لیڈر یا اعلیٰ درجہ کے پولیٹیکل کارکن تھے ان میں کمیونسٹ تھے سوشلسٹ تھے کانگرسی تھے ٹیررسٹ تھے۔ احرار میں تو صرف مَیں ہی تھا باقی سب رہا ہو چکے تھے ۲۳ مارچ کے حادثہ لاہور میں جو خاکسار پکڑے گئے اور اب عمر قید گزار رہے تھے وہ عام اخلاقی قیدیوں کے ساتھ سی کلاس میں رہ رہے تھے اور بُری حالت میں تھے۔ ان کے علاوہ بعض حادثاتی پولیٹیکل قیدی تھے مثلاً کچھ لوگ ہانگ کانگ سے گرفتار ہو کے آئے تھے اُن میں ہوشیار پور کا ایک مسلمان چودھری عبدالستار بھی تھا ایک دو شخص ایسے بھی تھے جو سیاسی تھے لیکن کسی پارٹی کے ساتھ نہ تھے۔

ان مختلف گروپوں میں بھی پولیٹیکل قیدی ہونے کی حد تک تو لگاؤ تھا لیکن لاگ زیادہ تھی مثلاً کمیونسٹ جنتا کی جنگ (پیپلز وار) کا نعرہ لگانے کی وجہ سے الگ تھلگ تھے۔ ہٹلر کے روس پر حملہ نے اُنہیں اتحادیوں کا ہمنوا کر دیا تھا۔ وہ جنگ میں غیر مشروط تعاون کر رہے تھے۔ ان کا حال یہ تھا کہ اتحادیوں کی فتح سے خوش ہوتے اور محوریوں کی فتح سے افسردہ،

اُن کا اصل تصادم سوشلسٹوں سے تھا جو گھر کے بھیدی تھے اور ان سے کٹ کے الگ ہوئے تھے سوشلسٹوں کا خیال تھا کہ روس کے جنگ میں شامل ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہماری جنگ برطانیہ سے ہے روس سے نہیں۔ برطانیہ نے ہماری آزادی سلب کر رکھی ہے اور یہی موقع ہے کہ انگریزوں کو آنکھیں دکھا کر ہم اپنی آزادی حاصل کر سکتے یا قریب لا سکتے ہیں۔ سوشلسٹوں کا دعویٰ تھا کہ ہندوستانی کمیونسٹوں نے اپنے دماغ سے سوچنا چھوڑ دیا ہے جو ماسکو کہتا ہے وہی کرتے ہیں۔ انہیں ہدایات بھی بالواسطہ آتی ہیں - ماسکو کی پارٹی لندن کی پارٹی کو ہدایت کرتی ہے اور لندن کی پارٹی جس کے سیکرٹری ہیری پولٹ ہیں ہندوستان کی پارٹی کو کنٹرول کرتی ہے سوشلسٹ جیل میں کمیونسٹوں کے مقابلہ میں زیادہ تھے اور یوں بھی حسنِ اتفاق سے اُن کے بہترین دل و دماغ لاہور میں اکٹھے ہو گئے تھے ہر روز محوریوں کی فتح پر گیت گھڑے جاتے جنرل رومیل کو خصوصیت سے سراہا جاتا لیکن یہ جو کچھ بھی تھا کمیونسٹوں کو چڑانے کے لیے تھا۔ کمیونسٹوں کے بارے میں سوشلسٹوں کا یہ عقیدہ رہا اور وہ انہیں واقعات و نظریات کی روشنی میں بیان کرتے تھے کہ کمیونسٹ صرف وقتی ہتھکنڈوں پر یقین رکھتے ہیں وہ کمیونزم کے سوا کسی کے وفادار نہیں افراد اُن کے نزدیک کوئی شے ہی نہیں وفاداری صرف پارٹی کی ہے جھوٹ بولنا اُن کا آرٹ ہے اخلاقی قدریں ان کے نزدیک اضافی ہیں۔ اُن کے نزدیک کسی مقصد کا حصول ہی ذرائع کے غلط یا صحیح ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔ آدمی اپنے موقف کے لیے اخلاقی یا غیر اخلاقی جو ہتھیار چاہے استعمال کر سکتا ہے —— کمیونسٹ اپنا وار کرنے سے کبھی نہیں چوکتے۔ طاقتور ہوں تو مہلک وار کر جاتے ہیں کمزور ہوں تو گھات میں رہتے ہیں یہاں چونکہ کمزور تھے اس لیے کڑھتے ضرور تھے مگر ہر وار سہہ جاتے البتہ کانگرسی لالاؤں کو زچ کرنے میں سوشلسٹوں کے ہمنوا

تھے بلکہ ان سے بھی دو قدم آگے! ان لوگوں کے نزدیک فرقہ داریت کا تصور ہی لغو تھا وہ اس خیال سے متفق تھے کہ کانگریس کی لالہ لیڈرشپ نے مسلمانوں کا سماجی اور معاشی مقاطعہ کر کے قومی تحریک کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ لالاؤں پر طرح طرح کی پھبتیاں کسنا ان کا روزمرہ تھا۔ تعصب سے یہ لوگ اتنے ہی دور تھے جتنا روشنی سے تاریکی ———

ایک روز میں احاطہ اول کی ساتویں بارک کے پاس سے گذر رہا تھا کہ میری نگاہ ایک ایسے نوجوان پر ٹھہر گئی جو کھلے میدان میں بیٹھا بان بٹ رہا تھا اس سے پیشتر کہ میں اُسے پہچانتا اُس نے مجھے پہچان لیا اور بڑی نیازمندی سے سلام کیا۔

"تمہارا نام اکبر ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"جی ہاں — مجھے محمد اکبر کہتے ہیں"

محمد اکبر موچی دروازہ کا رہنے والا اور خاکسار تھا۔ شریف، وجیہہ، نیک سیرت، نیک خصلت اور با اخلاق۔

"تم یہاں کیسے آئے ہو؟"

"خاکساروں کے تصادم میں"

"۱۹ مارچ کے قیدی ہو؟"

"جی ہاں"

"کتنی قید ہے؟"

"عمر قید"

"کتنے ساتھی ہو؟"

"سات"

"سب اکٹھے ہو"

"جی نہیں۔ اُڑدی لگتی ہے[1]۔"

"مشقت کیا ہے؟"

"مَیں تو بان بٹتا ہوں۔ ایک ہسپتال کی ڈسپنسری میں ہے۔ ایک منج کٹائی کرتا ہے۔ چار چھاپے خانے میں ہیں۔"

اکبر خاکساروں کے تشکیل اور نوجوان سالاروں میں سے تھا خوبرو بالا بلند نشیلی آنکھیں تیکھی چتونیں ستواں ناک سڈول جسم عمر کوئی ۲۲ برس لیکن اب اُس کی عمر کا نکھار اُڑا جا رہا تھا قیاس یہ تھا کہ اُسے کوئی غم چاٹ رہا ہے۔

۳۱۳

تین سو تیرہ خاکساروں کا تاریخی جیش جو ۱۹ مارچ کو کفن بدوش نکلا تھا وہ اسی جیش میں تھا ہیرا منڈی کے چوک میں پولیس کی مڈبھیڑ کے دوران ایک لرزہ خیز تصادم ہو گیا خاکساروں نے ڈٹ کے پولیس کو مارا بالخصوص انگریز افسروں کو نوک دم بھگا دیا لاہور کے سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر گینسفورڈ کا چہرہ لگاڑ ڈالا ایک سارجنٹ مسٹر بیٹی کو موقع ہی پر چت کر دیا۔ ایک اور پولیس آفیسر سکروگی کے چہرے پر بیلچہ کا ایک ایسا ٹھپہ لگایا کہ وہ بدرُو ہو گیا۔ بیٹی اور سکروگی یہ دونوں اکبر کے ہاتھوں پٹے تھے اکبر نے بتایا کہ جب وہ بیٹی کو

---

[1] عمر قیدی کی بیرک رات گذارنے کے لیے ہر روز بدلی جاتی اور اُسے گنتی بند کرتے وقت بتایا جاتا ہے کہ آج رات وہ کس بیرک میں رہے گا اسی کا نام پنجاب کی جیلوں میں اُڑدی لگنا ہے۔

ڈھیر کر کے نکلا تو اس وقت ایک حشر برپا تھا۔ اکبر نے پاس ہی "بالی خیر پور والی" کے مکان کی پناہ لی اور دوسرے خاکسار بھی اِدھر اُدھر چھُپنے لگے کوئی زہرہ و مشتری کے چوبارہ میں چلا گیا کوئی حمیدی اور الٰہی جان کے کوٹھے پر لیکن پولیس زخمی شیر کی طرح دھاڑ رہی تھی۔ تھانیداروں ہیڈ کانسٹیبلوں اور کانسٹیبلوں نے کنجروں کے کوٹھوں پر چڑھ چڑھ کر خاکساروں کو کئی کئی منزلوں سے نیچے پھینکا کئی گرتے ہی مر گئے جو سسکیاں بھر رہے تھے انہیں گولیوں سے بھون دیا اور جو کمروں میں چھپ کے بچ رہے تھے انہیں کنجروں نے پکڑوا کے مروا دیا کنجروں نے بعض کوٹھوں سے روپوش خاکساروں کو خود گرا دیا غرض چاروں طرف رقصِ بسمل کا تماشا تھا انگریز افسروں کے قطرہ ہائے خون کا بدلہ لیا جا رہا تھا ——

جب کنجر بھی پولیس کے معاون ہو گئے اور انہوں نے اِغماض یا رحم کا سوال ہی اُٹھا دیا تو بوجڑوں اور کنجروں سے بچنے کے لیے اکبر عقبی دروازہ سے نکل گیا قریب ہی بیدمٹھا بازار کے نکڑ پر ایک ہندو حلوائی کی دوکان تھی اُس کا تالا توڑ کر کڑاہی کے نیچے چولھے میں چھپ گیا ایک اور ساتھی یوسف بھی اُس کے ساتھ تھا دونوں کئی گھنٹے وہاں چھپے رہے دن بھر کرفیو لگا رہا آغازِ شب میں ایک حوالدار ادھر سے گزرا تو اسے دوکان پر تالا نہ دیکھ کر شبہ ہوا۔ اس نے چوبی تختوں پر ڈنڈے مارے یوسف نے اندر سے دروازہ کھول دیا اور اس طرح یہ دونوں گرفتار ہو گئے۔ ایک قیامت گزر چکی تھی لیکن اس کے باوجود بعض کوٹھوں سے تاناری ری کی آوازیں آ رہی تھیں اور معمول کے مطابق مجرا بھی ہو رہا تھا اکبر نے بتایا وہ سر جھکائے پولیس کے نرغہ میں چلا جا رہا تھا لیکن ایک بازاری آواز اس کے ہمقدم تھی ؎

تیری رسوائی کے خونِ شہدا درپے ہے

دامنِ یار خدا ڈھانپ لے پردا تیرا

بہ قول اکبر گھنگھروؤں کے چھنا کے اس حسب حال آواز کو اور بھی مجروح کر رہے تھے ۔۔۔۔ تھوڑی دیر بعد پولیس اکبر کو قلعہ میں لے گئی اور یہ سب آوازیں اس طرح غائب ہوگئیں جیسے سرے سے موجود ہی نہ تھیں۔ قلعہ کی کہانی بیان کرتے وقت اکبر کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو بہہ نکلے یہ آنسو اس کے سرخ رخساروں کی زرد دیوار پر مٹی کے دیوں کی طرح جھلملا رہے تھے۔ اُسے یا اُس کے ساتھیوں کو سیاسیات اور اُس کے پیچ وخم کا قطعی اندازہ نہ تھا وہ پالٹکس کی مبادیات سے بھی نابلد تھے لیکن انہیں بالخصوص اکبر کو یہ ملال ضرور تھا کہ قلعہ میں اس کے ساتھ جو سلوک مسلمان پولیس افسروں نے کیا وہ حد درجہ بہیمانہ تھا کیا واقعی وہ مسلمان تھے یا اکبر کافر تھا؛ رہ رہ کے یہ سوال اس کے دل و دماغ کو کھا تا رہا اتنے سال گزر جانے کے باوجود وہ اس صدمہ کو نہیں بھولا تھا اُس نے تشدد کے ایسے ہولناک واقعات سنائے کہ خود خوف خدا تھرا رہا تھا۔

پولیٹیکل قیدی

مَیں نے اکبر کی بپتا سُن کر اُسے یقین دلایا کہ ہم خاکسار قیدیوں کے لیے انشاء اللہ کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے مَیں نے ساتھیوں سے ذکر کیا تو گاندھی بھگتوں نے جھک کر فرمایا کہ خاکساروں کو وہ سرے سے پولیٹیکل قیدی ہی نہیں مانتے ہیں کمیونسٹوں کے لیڈر پنڈت کشوری لال نے ہمنوائی کی کہ خاکساروں کو ضرور مراعات ملنی چاہئیں وہ بہر حال پولیٹیکل قیدی ہیں ۔۔۔۔ لیکن خود وہ کوئی مطالبہ یا اقدام کرنے کے حق میں نہ تھے سوشلسٹوں میں پروفیسر تلک راج چڈھا سردار سجن سنگھ مرگند پوری اور سردار کلبیر سنگھ نے میری تائید کی اور آمادہ ہو گئے کہ اس ضمن میں اگر خاکسار کوئی قدم اٹھائیں تو وہ عملاً اُن کا ساتھ دیں گے اس حیص بیص میں چار دن

گذر گئے چودھری کرشن گوپال دت کہنے لگے کہ خاکسار پولیٹیکل قیدی نہیں۔ انہیں زبردستی پولیٹیکل بنانا غلط ہو گا میں نے اُن سے دریافت کیا۔

"آپ کے نزدیک پولیٹیکل قیدی کی تعریف کیا ہے؟"

"جواب تو وہ کیا دیتے ادھر اُدھر کی باتیں لے بیٹھے نقطہ نگاہ ان کا یہ تھا کہ یہ لوگ تشدد کے حامی، آمریت کے پیروکار، اور ایک فرقہ دار جماعت کے رکن ہیں سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے انسان مارے ہیں۔"

میں نے کہا اول تو یہ میرے سوال کا جواب نہیں آج ہر وہ شخص پولیٹیکل قیدی ہے جو غیر ملکی غلامی کے خلاف کسی بھی تحریک یا تنظیم کی سیاسی جدوجہد کے باعث قید ہو گیا ہے جو شخص قوم و ملک کے لیے قید ہوتا ہے پولیٹیکل قیدی ہے رہا تشدد کا سوال تو یہ ٹیررسٹ بھی تشدد کر کے قید ہوتے ہیں ان پر بھی قتل ڈاکہ اور دہشت کے الزامات تھے آمریت کا سوال ہی عبث ہے غور سے دیکھا جائے تو اس قسم کی آمریت خود کانگرس ہائی کمانڈ کی فکری سیادت میں ہے خود گاندھی جی اپنی شخصیت کے بارے میں کانگرس سے کامل اتباع چاہتے ہیں، رہا یہ الزام کہ انسان مارے ہیں تو ۱۹۴۲ء کی کانگرس تحریک میں بھی انسان ہی مارے گئے ہیں۔ اب رہا فرقہ دار جماعت کا سوال تو کسی جماعت کو صرف اس لیے فرقہ دار نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی ایک مذہب کے پیروؤں کی اکثریت پر مشتمل ہے یا اس کے اعلیٰ اصولوں پر ایمان رکھتی ہے۔

میں نے اپنے نقطہ نگاہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ مہاتما گاندھی جب اچھوتوں کو ہندو قوم کا جزو قرار دینے کے لیے برت رکھتے ہیں تو کیا وہ فرقہ وارانہ نہیں ہوتا؟ ۱۹۴۱ء میں ہندو مہا سبھا نے بھاگل پور میں اپنا سالانہ اجلاس کرنا چاہا اسی دن بقرعید تھی حکومت نے

فساد کے خدشہ کو محسوس کرتے ہوئے اجلاس بند کر دیا مہا سبھا کے صدر ساور کر دفعہ ۱۴۴ توڑ کر گرفتار ہو گئے اور صرف ایک دن جیل میں رہے لیکن مہاتما جی نے احتجاجی بیان دیتے ہوئے کہا کہ حکومت نے بھارت بھوشن ساور کر کو گرفتار کر کے شہری آزادی پر چوٹ لگائی ہے کیا یہ ایک فرقہ وارانہ جماعت کی اعانت نہ تھی؟"

دیوان چمن بھی یہ باتیں سُن رہے تھے انہوں نے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا "وہ سلوک جو سکندر حیات کی وزارت نے خاکساروں سے کیا ہے کوئی کانگرسی وزارت کرتی تو مسلمان غدر مچا دیتے سارا ملک ہل چکا ہوتا لیکن یہاں چونکہ وزیر اعظم مسلمان ہے لہٰذا مسلمانوں کی حالت یہ ہے جیسے کوئی واقعہ ہی نہیں ہوا ہے پنتھ وزارت کا ذکر کرتے ہوئے دیوان صاحب نے کہا کہ اُس نے خاکساروں کے ساتھ سکندر وزارت کے سنگدلانہ سلوک کا عشر عشیر بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن مسلمان اخباروں اور مسلمان راہنماؤں نے ہنگامہ برپا کر دیا مگر اس عظیم تشدد پر وہی اخبار اور راہنما منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھے رہے کسی نے چوں نہیں کی ہم پر خاکساروں کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے"؛

میں نے دیوان صاحب سے کہا "جس طرح آپ سوچ رہے ہیں اس طرح نہ سوچئے بلکہ اس طرح سوچئے کہ جو ظلم سکندر وزارت نے خاکساروں پر کیا ہے ہندوؤں یا سکھوں کی کسی جماعت پر ہوتا تو آپ کیا کرتے؟ یوں چپ رہتے؟ کانگرس اپوزیشن سکندر وزارت کی معاون ہوتی؟ اور اپوزیشن لیڈر وزیر اعلیٰ کے گن گاتے؟"

دیوان صاحب نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ "میں خاکسار قیدیوں کو بہتر کلاس دیئے جانے کے حق میں ہوں لیکن ان کی اخلاقی یا سیاسی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی بلکہ ذمہ دار انکی اپنی تنظیم اسکی طاقت اور قیادت پر ہے۔"

میری تجویز یہ تھی کہ خاکساروں کو بہتر کلاس دلواتے اور موجودہ سلوک بدلوانے کے لئے ہم بھوک ہڑتال کریں سردار کلبیر سنگھ بھوک ہڑتال ہی کی وجہ سے کئی عارضوں کا شکار تھے تاہم میری رائے سے اتفاق کرتے ہوئے خود بھی تیار ہو گئے۔ فیصلہ یہ ہوا کہ پہلے خاکسار بھوک ہڑتال کریں ہفتہ بعد ہم شامل ہو جائیں گے پھر جب تک انہیں پولیٹیکل قیدیوں کی مراعات نہ مل جائیں بھوک ہڑتال جاری رہے مصیبت یہ تھی کہ خاکسار سیاسی ذہن بالکل نہ رکھتے تھے انہیں علامہ مشرقی یا ادارہ علیہ پر اعتماد تھا اور اسی کے حکم سے سوچتے تھے اپنی قوت فیصلہ تھی ہی نہیں ان لوگوں نے ادارہ علیہ سے استفسار کیا تو جواب آیا کہ اجازت نہیں دی جا سکتی تاہم ہماری پشت پناہی کا نتیجہ یہ نکلا کہ خاکساروں کی مصیبت کا بڑا حصہ ٹل گیا۔ اور اس سے پہلے جو سلوک ان سے ہو رہا تھا اس میں کمی ہونے لگی۔ میں نے سید امیر شاہ (جیلر) سے ذکر کیا تو آبدیدہ ہو گئے۔ کہنے لگے

(۱) قوم ساتھ ہو لیڈر شپ مضبوط ہو تو حکومت کے بہرے کان بھی کھل جاتے ہیں۔

(۲) عزت نفس مانگنے سے نہیں ملتی بلکہ اُس کی حفاظت خود کی جاتی ہے۔

(۳) کانگریس طاقتور ہے لیڈر مضبوط ہیں حکومت ان کے سامنے جھکتی ہے خاکسار بزدل قوم کی ہاری ہوئی جماعت ہے۔

(۴) ان نوجوانوں کو شکست کے احساس نے بے حوصلہ کر دیا ہے اپنے حقوق بھی نہیں مانگ سکتے نہ حقوق کے لیے لڑنے کا حوصلہ ہے نہ اس طریق کار سے واقف ہیں۔

(۵) مسلمانوں میں کوئی معاون نہیں نہ اُن کی آواز ہے جماعت مر چکی ہے عوام

بیگانہ ہیں ہندوؤں کو کیا پڑی ہے کہ ان کے لئے آواز اُٹھائیں ۔

غرض کئی مہینوں کی تگ و دو کے بعد اُن کے معاملہ میں یہ ہو گیا کہ

(۱) اُن میں جو قیدی سخت مشقتیں کرتے تھے اُن کی مشقتیں ہلکی ہو گئیں ۔

(۲) ملاقاتوں میں رعایت ہونے لگی ۔

(۳) اُرڈوی کو روزانہ سے ہفتہ وار کر دیا گیا ۔

(۴) اور انہیں بھی سیاسی قیدی تصور کیا جانے لگا ۔

ماں کی میّت

اکبر اپنی شادی کے مہینہ یا سوا مہینہ بعد جیل آگیا تھا اُس کو اپنی بیوی کی جوانی اور جدائی کا شدید احساس تھا اچانک ماں پر مرض الموت نے حملہ کیا اور وہ جوان بیٹے کو ایک نظر دیکھ لینے کی خواہش لے کر مر گئی کچھ لوگوں نے چاہا اکبر کو ایک دن کے لیے پیرول پر رہائی مل جائے کیونکہ انفرادی ستیہ گرہ کے دوران پنجاب کے بہت سے کانگرسی فرضی اور حقیقی رشتہ داروں کی بیماری یا موت کے عذر پر رہا ہوتے رہے تھے لیکن یہ ایک خاکسار کا معاملہ تھا کامیابی نہ ہوئی اکبر کے اعزہ جنازہ لے کر سنٹرل جیل کے دروازہ پر پہنچے سید امیر شاہ نے خدا ترسی کی اور میّت کو ڈیوڑھی میں رکھوا دیا اکبر کو بلایا کہ ماں کا چہرہ دیکھ لے اکبر نے اشکبار چہرے کے ساتھ ماں کو آخری سلام کیا اور اُلٹے پاؤں پچھاڑیں کھاتا بارک میں آگیا ۔ پھر دنوں تک آہوں میں مستغرق رہا لیکن بے بس تھا ۔

خاکساروں کی رہائی

متحدہ پنجاب کی آخری وزارت میں لالہ بھیم سین سچر جیل خانوں کے وزیر تھے ۔ میرے

ساتھ اُن کے مراسم نہایت مخلصانہ تھے مَیں نے اُن سے کہا کہ خاکساروں کو چھوڑ دیں وہ فوراً مان گئے لیکن رہائی اٹکی رہی میرا اصرار جاری رہا وہ یہی کہتے کہ مَیں آرڈر کر چکا ہوں تاخیر ہو گئی مَیں نے زور دیا کہ انتاعرصہ بی کلاس کر دیں۔ کہنے لگے کہ یہ آرڈر اس سے بھی پہلے کر چکا ہوں آخر عقدہ کھُلا کہ انسپکٹر جنرل پولیس بنیٹ اور ہوم سیکرٹری میکڈانلڈ نے کاغذات دبا رکھے ہیں ملک خضر حیات مُلک سے باہر تھے وزارت ڈانواں ڈول ہو رہی تھی ہندوستان بھر میں فسادات شروع ہو گئے۔ اس سے پہلے کہ سیحر کوئی قدم اُٹھاتے ملک خضر حیات نے وزارت سے استعفٰی دے دیا۔ ایک نیا دَور شروع ہوا آخر پاکستان بن جانے کے بعد نواب افتخار حسین ممدوٹ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ خاکساروں کو رہا کر دیا نہ بنیٹ رہا نہ میکڈانلڈ خاکسار رہ گئے اور رہا ہو گئے۔ اکبر رہائی کے بعد مجھے ملا تو اُس کا رنگ روپ اُڑ چکا تھا معلوم ہوا میری رہائی کے بعد خاکسار ملتان سنٹرل جیل بھجوا دیئے گئے تھے جہاں انہوں نے کچھ دنوں بھوک ہڑتال بھی کی جس سے اکبر کی صحت ہل گئی رہائی کے دوسرے سال اکبر نوجوانی ہی میں حرکت قلب بند ہونے سے رحلت کر گیا ماں نے یاد کیا اور وہ ماں کے پہلو میں ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

خیالات کی لہریں

جیل کی راتیں اور جیل کے دن عجیب ہوتے ہیں نکل جائیں تو سَن سے نکل جائیں نہ نکلیں تو رینگ رینگ کر چلتے ہیں منٹگمری سنٹرل جیل کا عالم یہ تھا کہ ڈراؤنی راتیں اور بھیانک دن تھے یوں کہیئے کہ دن رات میں کوئی امتیاز نہ تھا محسوس ہوتا تھا کہ شب و روز عمر کو چبا چبا کر کھا رہے ہیں۔ لاہور میں معاملہ اُلٹ رہا یہاں ہم شب و روز کو پھانکتے اور ڈکارتے

چلے جا رہے تھے راتیں کبھی کبھی اُداس ہو جاتی تھیں لیکن دن وصل کے لمحوں کی طرح ڈگ بھرتے اُڑے چلے جا رہے تھے میرا حال عجیب تھا کبھی شاعر ہو کر غزل میں ڈوب جاتا کبھی سیاستدانوں کی طرح سوچتا اور افکار کی چٹانوں سے ٹکراتا کبھی ایک ادیب کی طرح خیالات کے تانے بانے بنتا کبھی خطیب بن جاتا اور دیواروں سے مخاطب ہوتا۔ ع

شاید کوئی پتھر مری آواز سے پگھلے

مجھے معلوم تھا اور باقاعدہ اطلاعات آ رہی تھیں کہ خورشید بیمار ہے لیکن بے بس تھا باہر کی دنیا اس تیزی سے بدل رہی تھی کہ اندر بیٹھ کر ہم اس کا اندازہ ہی نہ کر سکتے تھے انسان فطرتاً تبدیلی چاہتا ہے ہم برسوں سے ایک ہی چار دیواری میں پڑے تھے ایک سا ماحول چلا آ رہا تھا ہر پھر کر دہی صورتیں سامنے آتیں کبھی جی خوش ہوتا تو کبھی طبیعت اُچاٹ ہو جاتی صرف خیالات تھے جو موسموں کی طرح پلٹا کھاتے تھے اُن کی آمد و رفت سے گرمی و سردی اور بہار و خزاں کا لطف پیدا ہو جاتا لیکن یہ بھی احساس پر موقوف تھا طبیعت شگفتہ ہو تو خزاں بھی بہار ہوتی ہے طبیعت بدمزہ ہو تو بہار بھی بہت جھڑ نظر آتی ہے قید اسی کا نام ہے کہ حسرتیں اُبھرتی رہیں اور امیدیں قتل ہوتی جائیں جب کبھی شاعرانہ ذوق آنکھیں کھولتا تو دل و دماغ کا عالم ہی اور ہوتا وہ تمام رعنائیاں یاد آتیں جنہیں اوائل عمر کی شریر یادوں کے ساتھ دفن کر آیا تھا پہروں سوچتا کہ وہ دوست کہاں ہیں جن کے ساتھ میرا بچپن گزرا لڑکپن جوان ہوا یہی سوچتے سوچتے سو جاتا اور سوتے سوتے جاگ اُٹھتا میری طبیعت کئی طبیعتوں کا مجموعہ ہے اس میں پکے راگ بہت تھوڑے ہیں بلکہ سرے سے ہیں ہی نہیں میں نے عمر بھر کوشش کی ہے کہ لوک گیتوں کی طرح رہوں دوستوں نے کبھی بیت الغزل سمجھا کبھی لکیر بھول گئے یا پھر مصرع طرح سمجھا کہ مذاق کے مطابق

گرہ لگاتے رہے۔

اس گہما گہمی کے باوجود جو اُس وقت سنٹرل جیل کی اس وارڈ میں تھی۔ مَیں اکیلا اکیلا تنہا ہو جاتا اور اس تنہائی میں اپنے آپ کو اس طرح پاتا جیسے کسی شاعر کی فکر احاطہ نگارش سے نکل گئی ہو۔

نوک جھونک

ایک روز صبح سویرے میرے پاس چودھری عبدالستار آئے اور کہنے لگے "آپ ہمارے ساتھ ڈرائنگ روم میں کھانا کیوں نہیں کھاتے؟ مَیں نے کہا ایسی کوئی بات نہیں میری عادت ہے۔" کہنے لگے "جی نہیں آپ ہمارے ساتھ کھایا کریں۔ آپ کے آنے سے پہلے اکثر بوڑھے یا بڑے کانگرسی راہنما ہمیں حقیر سمجھتے تھے کوئی مسلمان بھی اُن کی نگاہ میں نہیں جچتا تھا اچھوتوں کا سا سلوک کرتے آپ کی وجہ سے فضا پلٹ گئی ہے اور ہم بھی قدرے دلیر ہو گئے ہیں البتہ ایک چیز بہت کھلتی ہے اور وہ ان لوگوں کا کھانے کی میز پر تبصرہ ہے یہ لوگ ہر لقمہ کے ساتھ مسلمانوں کی ہتک کرتے ہیں جس سے ہمارے جذبات کو صدمہ پہنچتا ہے۔"

"کہتے کیا ہیں؟"

"ایسی باتیں کرتے ہیں جن سے مسلمانوں کے خلاف حقارت پائی جاتی ہے۔"

"گالی دیتے ہیں؟"

"جی نہیں، ان کی باتوں سے قومی احساسات مجروح ہوتے ہیں"

"کوئی خاص بات؟"

"مثلاً قائد اعظم پر تبّرا تو لیتے ہیں مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق ایسی باتیں
کہہ جاتے ہیں جن سے بہت دُکھ ہوتا ہے۔"

"وہ کون لوگ ہیں ان کے نام کیا ہیں؟"

"چودھری کرشن گوپال دت اور ڈاکٹر سکھدیو لال اور ان کے ساتھ جو دو چار
بورژوا ٹائپ کے کانگریسی ہیں۔"

"کون کون مسلمان آپ کے ساتھ کھانا کھاتا ہے"

"کھانا تو ہم سب اکٹھا کھاتے ہیں لیکن میری نشست آخر میں ہے قریب تو وہ
پھٹکنے ہی نہیں دیتے"

"مَیں نے آپ سے یہ پوچھا ہے کہ اور کون مسلمان آپ کے ساتھ کھانا کھاتا ہے"

"مسلمان تو مَیں اکیلا ہی ہوں چونکہ طبیعت محسوس کرتی ہے اس لئے
آپ سے کہنے آیا ہوں"

"اچھا کوئی بات نہیں آج شب کا کھانا آپ کے ساتھ ہوگا یامین ڈار سے بھی
کہہ دو بات مَیں اُن سے خود کر لوں گا۔"

"کلبیر سنگھ وغیرہ کو بھی مَیں نے مطلع کر دیا۔ یامین باوجود یکہ
کٹر قسم کا سوشلسٹ تھا یہ سُن کر اُسے تاؤ آگیا کہنے لگا کوئی بات نہیں آج ہی سب
ٹھیک ہو جائے گا"

"جونہی رات کے کھانے پر ہم اکٹھے ہوئے لالاؤں کو استعجاب ہوا
کرشن گوپال دت نے کہا"

"آج تو کچھ بانٹنا چاہیئے آپ لوگ بھی پہلی دفعہ چلے آئے ہیں۔"

وہ سمجھتے تھے کوئی نئی بات ضرور ہے لیکن کسی نے کوئی ایسی بات نہ کی جس پر ہم لوگ گرہ لگاتے

اگلے روز ٹیرا سلو لانے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو لالہ دیش بندھو گپتا (ایڈیٹر تیج) مہاشہ ویریندرا اور اس گروہ کے دوسرے افراد کی دعوت کر رکھی تھی کھانے کی میز پر بیٹھے تو قائد اعظم کے ایک بیان پر جو اُسی دن نکلا تھا تبصرہ ہونے لگا کرشن گوپال دت نے نثری کیا دیش بندھو نے لقمہ دیا میں نے بات کاٹتے ہوتے کہا "چودھری جی! معاف کیجئے جو الفاظ آپ نے کہے ہیں وہ غیر شریفانہ ہیں اس کھلی گالی کا مطلب ہے کہ آپ عاجز ہو چکے ہیں"

چودھری صاحب نے بھڑک کر کہا "آپ کو جناح سے کیا؟"

اس سے پہلے کہ چودھری صاحب اپنا فقرہ مکمل کرتے میں نے ان کی بات کاٹ دی "جی! آپ ٹھیک کہتے ہیں میں جناح کا پیرو نہیں لیکن آپ کو یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے کہ وہ مسلمانوں کی عظیم ترین اکثریت کے لیڈر ہیں ہم بطور مسلمان ان کی ہتک نہیں سُن سکتے یامین نے فوراً ہی میری تائید کی کلبیر سنگھ اور ملک راج نے بھی صاد کیا کہ اس قسم کے کلمات سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

اسی طرح ایک دن مولانا ابوالکلام کا ذکر آگیا چودھری صاحب نے ملاحیاں شروع کیں یامین نے جواب آں غزل چھیڑا ڈاکٹر گوپی چند بھی مولانا کے سخت خلاف تھے کچھ کہنا چاہا میں نے روک دیا۔ دہلی اور پنجاب کے اکثر کانگرسی سبھاش چندر بوس کی ریس میں مولانا کو ازراہ تحقیر مغل اعظم کہتے ہم بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے بعض اوقات سخت سست کلمات بھی نکل جاتے ایک دن میاں افتخار الدین پر تبصرہ ہونے لگا پتہ نہیں کسی نے کیا کہا لیکن جو کچھ کہا نا روا تھا۔ ہم نے روکنا چاہا تو سکھدیو لال نے کہا "مسلمان لیگی ہو یا کانگرسی چھیلو تو اندر سے مسلمان ہی نکلتا ہے۔"

ڈاکٹر سکھدیو لال سوامی شردھانند کے داماد تھے مجھے ہندی پڑھایا کرتے اور میں اُن کا ادب کرتا تھا لیکن اُب کے میں بھی ضبط نہ کر سکا جواب دیا تو بگڑے ہندی پڑھانا موقوف کر دی ماضی کے ہندو مسلم فسادات پر گفتگو چل رہی تھی یا میں نے کہا تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے تحریک خلافت کے گمشدہ اتحاد کا سبب بیان کرتے ہوتے میں نے کہہ دیا کہ اس فساد کے بانی سوامی شردھانند تھے بس طوفان آگیا ڈاکٹر سکھدیو لال آگ بگولا ہو گئے دیش بندھو گپتا کو تو چین نہ پڑتی تھی کہ میں نے کیا بک دیا ہے غرض اس قسم کی پُر لطف جھڑپوں سے ہم نے ان کی بے قابو زبانیں بند کرا دیں جو ہمیشہ مسلمانوں ہی کے افراد و حالات پر گلفشانی گفتار کی مرتکب ہوتیں اور اُس کو نیشلزم کا حصہ گردانتی تھیں۔ ان بوڑھے "دیش بھگتوں" کے دماغ میں یہ بات بسی ہوئی تھی کہ مسلمان اچھوت ہیں سیاسی طور پر ہمیں ہیچ خیال کرتے اُن کا خیال تھا کہ سیاسیات میں وہ بہت آگے ہیں یہ بات حقیقتاً درست تھی مگر بہادری کا تمغہ اپنے ہی سینہ پر لگانا اصولاً اور واقعتہً غلط تھا جو مسلمان ان کی جماعت سے باہر رہ کر غیر ملکی حکومت سے لڑ رہے تھے وہ زیادہ بہادر تھے اُن کی بدنصیبی یہ تھی کہ اپنی قوم ہمدرد نہ تھی ہمسایہ قوم دل سرد تھی اور حکمران بیدرد تھے۔

رگھونندن سرن

قائدِ اعظم کے سلسلہ میں ہم نے چودھری کرشن گوپال دت اور لالہ دیش بندھو گپتا کو ٹوکا تو کہیں سے اس کی بھنک لالہ رگھونندن سرن کے کان میں پڑ گئی مجھے بلا بھیجا اور کہا تم نے ٹھیک کیا یہ دونوں اسی سلوک کے مستحق تھے۔ گپتا کے متعلق کہا کہ اس کی وجہ سے دہلی کی فرقہ وار فضا کبھی صاف نہیں ہوئی اسی ذہنیت ہی نے جناح جیسے انمول ہیرے کو

کانگرس سے بدظن کر دیا کانگرس سے بدظن ہونا تو خیر کوئی بات نہ تھی —— ہندو مسلم اتحاد ہی کو ناممکن بنا دیا ہے۔

رگھو نندن دہلی کے روسا میں سے تھے لاکھوں روپے کے مالک بلکہ کروڑپتی، رائے زادہ ہنسراج کے داماد، دھان پان، لب ولہجہ کے اعتبار سے بے زبان، غیبت کرتے نہ سنتے، شرافت ان کا طبعی حسن تھا ان کی باتیں بڑی میٹھی ہوتیں تصنع اور ریا سے نفور، نام و نمود سے کوسوں دور، موٹروں کے بہت بڑے تاجر کئی شہروں میں ان کی دوکانیں تھیں تقریباً سبھی ریاستوں کے راجے مہاراجے اُن سے کاریں خریدتے گورنمنٹ آف انڈیا کو بھی وہی موٹریں سپلائی کرتے جب کبھی وائسرائے یا دہلی کے اعلیٰ حکام کو مہمانوں کے لیے نفیس کاروں کی ضرورت ہوتی اُن کے ہاں سے موٹریں منگائی جاتیں طبیعت میں بے نیازی تھی۔ کئی وائسرائے اُن کے ذاتی دوست رہے تھے گاندھی جی انہیں انتہائی عزیز رکھتے انہی کی زبانی معلوم ہوا کہ قائداعظم ان کے گہرے دوست ہیں دہلی آتے تو اُن سے ضرور ملتے ہیں وہ قائداعظم کی بے حد تعریف کرتے اور کہتے تھے کہ انہیں متحدہ ہندوستان سے جو اختلاف ہے وہ ہندوؤں کی اجتماعی روِش کا ردعمل ہے قائداعظم سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ ایک دفعہ میں نے مہاتما جی کی خواہش پر اُن سے کہا کہ کانگرس سے صلح کیوں نہیں کر لیتے؟ جب اختلاف کا آخری حل بھی یہی ہے قائداعظم نے ہنس کر فرمایا "رگھو نندن! مسلمان من حیث الجماعت سیاست و معیشت کے میدان میں ہندوؤں سے بہت پیچھے ہیں جب تک اُن کی ملی انفرادیت تعصبات کی حد تک پختہ نہیں ہو جاتی، اس وقت تک کوئی سمجھوتہ مشکل ہے اب اگر کوئی مفاہمت ہو جائے تو اُس میں مسلمانوں کا قطعی خسارہ ہے فی الحال اس سمجھوتہ کو ٹالتے رہنا ہی مفید ہے اس سٹیج پر سمجھوتہ کر لوں تو اس کا مطلب ہو گا مسلمانوں

کا ہندوؤں میں ادغام ——"

"سرن جی نے بتایا کہ قائدِ اعظم کی طبیعت پر ہندو لیڈر شپ کے طرزِ عمل کا تجرباتی ردِ عمل یہ تھا کہ وہ اس پر اعتماد ہی نہ کرتے تھے مجھ سے اکثر کہا کرتے کہ کانگرس مسلمانوں سے کوئی سمجھوتہ نہیں چاہتی وہ سمجھوتے کی بات چیت کو ٹالنے کے لیے سمجھوتے کا نام لیتی ہے آخر کانگرس خود کیوں نہیں بولتی کہ وہ مسلمانوں کو دینا کیا چاہتی ہے؟ سرن جی کو اس وقت بھی یقین تھا کہ ملک تقسیم ہوگا کیونکہ ہندو آخر وقت تک کچھ نہیں دیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ پاکستان بن کے رہے گا ——"

سرن جی امیروں کی طرح بیمار ہی رہتے بیماری کا آخر وقت تک پتہ نہ چلا کیا ہے؟ اپنے خرچ پر مالش کرانے کا انتظام کر رکھا تھا ہر روز مال روڈ کے کسی حجام کی دوکان سے ایک مالشیہ آتا۔ گھنٹہ دو گھنٹہ مالش کر کے بلاناغہ پندرہ روپے لے جاتا دو ماہ تک مالش ہوتی رہی ایک دن مجھ سے تخلیہ میں کہنے لگے میں ان نیشلسٹ مسلمانوں کی مالی امداد کرنا چاہتا ہوں جو اس وقت قید میں ہیں ایک فہرست تیار کر دو اور جو ماہانہ چاہو ہر نام کے ساتھ لکھ دو۔ ماہ بہ ماہ اُن کے گھروں میں پہنچتا رہے گا میں نے عرض کیا مجھے ایسے لوگوں کا کچھ علم نہیں —— مولانا داؤد غزنوی سے کہیئے وہ شاید آپ کو ایسی فہرست دے سکیں وہ مصر رہے کہ یہ فہرست میں ہی تیار کروں میں ٹال کے چلا آیا اور آگر بر بودھ سے گلہ مند ذکر کیا کہ سرن جی غالباً مجھے اپنی امداد کے لیے منتخب کرنا چاہتے ہیں انہیں شاید میری عزتِ نفس کا احساس نہیں یا ان کے نزدیک غریب میں عزتِ نفس ہوتی ہی نہیں پر بودھ جی نے مجھے یقین دلایا کہ سرن جی بہت بلند آدمی ہیں وہ اس طرز کی سوچ کے عادی نہیں اُنہیں تم سے اخلاص ہے تمہارے مصائب سُن کر ان کے دل میں تمہاری عزت ہوگئی ہے ہمیشہ تعریف

کرتے اور خوش ہوتے ہیں پر بودھ جی نے اُن سے ذکر کیا تو فوراً میرے پاس چلے آئے
اس حسن و خوبی سے میرے خیال کی تردید کی جیسے کہہ رہے ہوں۔ ؎

یہ وہم کہیں تم کو گنہگار نہ کر دے

انہیں مجھ پر بے حد اعتماد تھا وہ یہ جانتے تھے کہ مَیں کسی شخص یا ساتھی سے کوئی تحفہ وصول نہیں کرتا اور نہ کسی خواہش پر مرتا ہوں بلکہ اپنے ہی خیالات میں محو اور مگن رہتا ہوں۔

حلال اور جھٹکا

جیل میں ہم سب کا کھانا اکٹھا پکتا اور ذبیحہ آتا تھا ایک دن بیٹھے بٹھائے سردار گوپال سنگھ قومی کو شرارت سوجھی یا جانے کیا خیال آیا کہ بعض سکھ دوستوں کو اپنے ساتھ ملا کر جھٹکا کا مطالبہ کر دیا گوپال سنگھ قومی صوبہ کانگرس کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے قید ہوتے تھے آدمی خوش مزاج اور خوش گفتار تھے لیکن یکایک ہی اس مطالبے سے انہوں نے ہم سب کو حیرت میں ڈال دیا میں نے اُن سے کہا اس سے فائدہ؟ کہنے لگے ——— ہمارا مذہبی حق ہے۔

"لیکن یہاں تو لنگر اکٹھا ہے اور سب کا کھانا ایک ہی دیگ میں پکتا ہے"

نہ مانے کہنے لگے چولہا الگ کر لیجئے جب ہم حلال کھا لیتے ہیں تو آپ جھٹکا کیوں نہیں کھاتے؟ سیفی کاشمیری بھی تو کھاتا ہی رہا ہے۔

مَیں نے قومی صاحب کی بات کو پہلے تو مذاق سمجھا لیکن جب وہ سختی سے مطالبہ کرنے لگے تو مَیں نے صاف کہہ دیا کہ یہاں نہیں پک سکتا اکثر ٹررسٹ اور سوشلسٹ بلکہ کانگرسی

بھی میرے ہمنوا تھے۔ میجر حبیب اللہ شاہ نے انکار کیا صاف کہا کہ میں جھٹکا نہیں دے سکتا البتہ آپ کا مطالبہ گورنمنٹ کو بھیج سکتا ہوں ڈاکٹر گوپی چند سے ذکر آیا تو طرح دے گئے۔ کہنے لگے ہم تو ماس کھاتے ہی کے خلاف ہیں اگر ذبیحہ آتا ہے تو جھٹکا آنے میں کیا ہرج ہے؟ جب میں نے دیکھا کہ یہ لوگ پھلجھڑیاں چھوڑنے میں لطف محسوس کرتے ہیں اور انہیں مسلمانوں کی ہر چیز سے نفرت ہے بلکہ عمداً ان باتوں کو اختیار کرتے ہیں جن سے مسلمانوں کے جذبات کو صدمہ پہنچے یا اُن کی عزت نفس زخمی ہو تو میں نے مہاتما گاندھی کے نام سپرنٹنڈنٹ جیل کی معرفت ایک خط لکھا جس میں اس شاخسانہ کا ذکر کیا میں نے یہ بھی لکھا کہ صوبہ کانگرس کے یہ نیتا ہماری موجودگی میں مولانا ابوالکلام آزاد کو گالیاں دیتے اور شرمناک باتیں کرتے ہیں آخر میں لکھا کہ یہ سب کچھ وہ لوگ کر رہے ہیں جو آپ کے بھگت کہلاتے ہیں اور جنہوں نے ستیہ و اہنسا وادی ہونے کا روپ دھار رکھا ہے سپرنٹنڈنٹ نے یہ خط پڑھ کر ڈاکٹر بھارگو کو بلوایا کہ وہ بھی پڑھ لیں اُن کا رنگ فق ہو گیا۔ گوپال سنگھ قومی اپنی ضد پر ڈٹے رہے۔ میں خط بھجوانے پر مصر تھا سکھ دوستوں نے اپنے وقار کا سوال بنا لیا اگلے ہی دن سر منوہر لال اچانک آ گئے میں نے اُن سے کہہ دیا کہ ان لوگوں کو یہاں، جھٹکا منگانے کی اجازت دی گئی تو اس کا مطلب ہو گا کہ ہم لوگ ان سے الگ ہو جائیں اور غالباً یہ لوگ یہی چاہتے ہیں اگر انہیں قید میں ہمارے جذبات کا پاس نہیں تو باہر اُن سے کیا توقع ہو سکتی ہے؟ اگر بے سہارا مسلمان ہونے کی وجہ سے ہمیں الگ کیا گیا تو ہم اس نیشلزم کے خلاف بھوک ہڑتال کر دیں گے تاکہ دنیا کو معلوم ہو کہ متحدہ قومیت کے دیوتا کس ذہنیت کے ہیں؟ سر منوہر لال یہ سُن سنا کر واپس چلے گئے شام کو ان کی طرف سے حکم آ گیا کہ جو لوگ جھٹکا کھانا چاہیں اُن کے لیے بورسٹل جیل کا نیا حصہ مخصوص کر دیا گیا ہے چنانچہ گوپال سنگھ قومی اور ان کے

ساتھی جھٹکے کے شوق میں بورسٹل جیل چلے گئے۔

اذان

چودھری عبدالستار پابندِ صوم وصلواۃ انسان تھے ہر روز صبح سویرے کلام پاک کی تلاوت کرتے ایک دن کسی سکھ یا ٹر یسٹ قیدی کے منہ سے نکل گیا کہ سویرے ہی سویرے کانوں میں قرآن ٹھونستے ہو ہم نے احتجاج کیا اور تمام ساتھیوں سے کہہ دیا کہ اس قسم کے کلمات برداشت نہیں کیے جا سکتے بیوپار منڈل کے دنوں میں پو پھٹتے ہی اوم اوم شروع ہو جاتا اور ویدوں کے اشلوک پڑھے جاتے تھے سکھ ہر روز پوجا پاٹھ کرتے اور اکٹھے ہو کر ست سری اکال پکارتے ہیں اپنے اپنے عقیدے اور دھرم کا معاملہ ہے ہمیں کوئی اعتراض نہیں تو آپ کو اذان پر کیا اعتراض ہے میں نے اور چودھری عبدالستار نے طے کیا کہ ہر صبح اذان دیکر نماز پڑھا کریں اذان دی تو دیش بھگتوں کو حیرانی ہوئی، سرگوشیاں ہونے لگیں ایک نے کہا یہ اذان بھی خوب رہی دوسرے نے کہا یہاں مسجد تھوڑی ہے تیسرے نے کہا انہیں کیسے کہا جائے چوتھے نے کہا آب وہوا فرقہ وارانہ ہوگئی ہے آج تک ایسا نہیں ہوا تھا ہمارا وارڈ ان چیزوں سے پاک تھا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ ایک دوست درمیان میں آگیا میں نے اس سے کہا جو لوگ ہماری اذان برداشت نہیں کرتے جس میں صرف اللہ کی بڑائی کا اقرار و اعلان ہے وہ ہمیں بطور مسلمان کیونکر برداشت کریں گے پھر یہاں جیل میں ان کے اندرونی جذبات کا یہ حال ہے آزاد ہندوستان میں ان کا حال کیا ہوگا آخر متحدہ قومیت کا مطلب کیا ہے؟ خود سپردگی! ان لوگوں کو اجازت ہے کہ خود اپنے دھرم کے مطابق جو چاہیں کریں اپنے تہوار منائیں اپنے

رشیوں اور منیوں کا چرچا کریں وید کے اشلوک پڑھیں گیتا کا جاپ کریں رامائن پڑھیں سیواجی سے لے کر مہارانا پرتاپ تک کی تحسین کریں اور اُن کے یوم منائیں لیکن ہم نماز پڑھیں، اذان دیں اور قرآن کی تلاوت کریں تو انہیں فرقہ واریت کی بُو آنے لگتی ہے کیا فرقہ واریت کا مطلب مسلمان، قرآن اور اذان ہے اگر انہیں ہمارا وجود گوارا نہیں تو بے شک ہمیں احاطہ سے الگ کرا دیں کیونکہ انہیں یہاں فوقیت حاصل ہے ایک تو یہ لوگ اکثریت میں ہیں دوسرے بہتر کلاس میں تیسرے جیلخانوں کے وزیر سر منوہر لال اور انسپکٹر جنرل کرنل پوری انہی کے ہیں ہم لوگ نہ تو حکومت کی نگاہ میں ذی حیثیت ہیں نہ ہمیں اپنی قوم لپند کرتی ہے ان باتوں سے یہ لوگ قدرے ٹھٹک گئے اور نہ اُن میں کوئی منفی قدم اُٹھانے کا حوصلہ تھا۔

مَیں گاندھی بھگتوں کی اس کھیپ پر عموماً طعن و تعریض کیا کرتا اور وہ چپ ہو رہتے غرض اس طرح ہم نے اذان دینے اور قرآن پڑھنے کا حق محفوظ کرالیا پھر کسی کو جرأت نہ ہوئی کہ جز بز ہوتا۔ مابخیر شما بسلامت

یہ ذکر پہلے بھی آچکا ہے کہ ان جھمیلوں کو عموماً کانگرسیوں کا وہ گروہ پیدا کرتا تھا جو اکالی دل کے ساتھ تھا اور سردار پٹیل کا پیرو۔ سچے نیشلسٹ ان جھگڑوں سے دُور بلکہ نفور رہتے اور کمیونسٹوں یا سوشلسٹوں کے لئے تو یہ سب چیزیں اضافی تھیں تاہم یہ لوگ سماجی طور پر ہندو یا سکھ تھے اپنے تہواروں سے انہیں اتنا ہی لگاؤ یا انس تھا جتنا کہ ایک مذہبی آدمی کو ہوتا ہے۔

حبیب اللہ شاہ اور ہنڈرسن

ایک دن میجر حبیب اللہ شاہ نے مجھے یاد کیا اُن کے دفتر میں گیا تو ہوم سیکرٹری کا

ایک خط دکھایا جس میں سردار گوپال سنگھ قومی سے جھٹکے کے تنازعہ کا ذکر تھا اور اس امر کی ہدایت کی گئی تھی کہ اذان دینے سے ٹیررسٹ وارڈ کے قیدیوں میں جو بدمزگی پیدا ہوتی ہے اس پر قابو پایا جائے انگریزی دوغلہ زبان ہے ایک ہی لفظ کے کئی مفہوم ہوتے ہیں میں نے اور میجر حبیب اللہ شاہ نے اس خط سے جو مطلب اخذ کیا یہ تھا کہ اذان دینے کی حوصلہ شکنی کی جائے بہر حال یہ خط داخلِ دفتر ہو گیا میجر حبیب اللہ شاہ نے بھی کوئی توجہ نہ دی نہ ہم نے غور کیا لاہور کا ڈپٹی کمشنر ہینڈرسن تھا اس نے ایک دن اس سوال پر کوئی ناگوار بات کہی میجر صاحب کو غصہ آگیا ہینڈرسن کو فوراً ٹوکا۔

"آپ اذان یا قرآن کے بارے میں محتاط رہیں ورنہ میں نہیں روک سکتا"

میجر صاحب ہینڈرسن سے اُلجھ پڑے ایک دفعہ پہلے بھی ہینڈرسن نے حضورؐ کا نام بے ادبی سے لیا تو اس سے اُلجھے تھے۔ تمام جیل میں اُن کی اس حمیت کا چرچا تھا ایک دن پتہ چلا کہ ہینڈرسن سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ہمراہ ٹیررسٹ وارڈ کا معائنہ کرنے آرہا ہے سکھ پہلے ہی ناراض تھے کہ سردار سمپورن سنگھ کو ایک آنہ جرمانہ کر کے اُس نے ذلیل کیا تھا کمیونسٹوں کے دل میں اس کی عزت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا سوشلسٹوں میں کلبیر سنگھ وغیرہ ملتان میں رہ کر اس کی سختیوں کا مزہ چکھ چکے تھے میرے ساتھ ملتان میں گرفتاری کے موقع پر جو سلوک ہوا تو ہینڈرسن ہی ڈپٹی کمشنر تھا۔ میں اُس سے ویسے ہی متنفر تھا یوں بھی ہینڈرسن فطرتاً ایک گورہ ہی تھا ہم سب نے صلاح کی کہ اس کی ہتک کرنی چاہیے۔ گاندھی وادیوں کو تو ہم نے الگ کر دیا کہ وہ بڑھی خانہ چلے جائیں خود ہم نے یہ طے کیا کہ اسے کوئی رسید نہ دیں سپرنٹنڈنٹ یا کوئی بڑا آفیسر جیل میں آتا تو ہم تعظیماً اپنی اپنی کوٹھری کے آگے کھڑے ہو جاتے وہ پوچھتا پچھواتا چلا جاتا ہینڈرسن کے معاملہ میں

ہم نے یہ کیا کہ اپنی اپنی کوٹھڑی کے برآمدے میں کرسیاں بچھائیں اور بیٹھ کر کے بیٹھ گئے ہنڈرسن نے اس طرح دیکھا تو جل بھُن کر لوٹ گیا۔ وزیٹر بک میں ہمارے خلاف بہت کچھ لکھا حتیٰ کہ جیل کے حکام پر بھی نکتہ چینی کی کہ سیاسی قیدیوں کو اتنی مراعات دے رکھی ہیں کہ نہ اُنہیں قید کا احساس ہے نہ نظم ونسق کی پرواکرتے ہیں میجر حبیب اللہ کا بیان تھا کہ میں نے سرکار کو جو تصریحی رپورٹ بھیجی ہے اس میں صاف لکھ دیا ہے کہ جو لوگ ٹیررسٹ وارڈ میں ہیں ان کو حکومت نے خطرناک قیدی قرار دے رکھا ہے بعض کے متعلق ہدایات موجود ہیں کہ ہندوستان محوری طاقتوں کی زد میں آتا ہو تو انہیں گولی سے اُڑا دیا جائے۔ ایسے قیدیوں کے ساتھ نباہ کرنا اور انہیں قید میں رکھنا سہل نہیں مسٹر ہنڈرسن ایسے قیدیوں سے تعظیم یا متابعت کا مطالبہ نہیں کر سکتے یہ لوگ قانون شکنی کی بدولت بلکہ سرکاری اندیشے کی بناء پر اندر آئے ہیں انہیں اندر قانون نہیں سکھایا جا سکتا انہیں قانون کے تحت قید ہی رکھا جا سکتا ہے ——— ہنڈرسن کو اس کے بعد دوبارہ آنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

سکندر حیات کا انتقال

ٹیررسٹ وارڈ کے انچارج اسسٹنٹ جیلر لالہ پرس رام سادہ دل اور شریف انسان تھے ہر وقت ہنستے اور مسکراتے میں تے اُن کے ماتھے پر کبھی ترشی یا تلخی نہ دیکھی ہم سے تو خیر کیا ترشی کرتے اخلاقی قیدیوں کے حق میں بھی مہربان تھے ایک دن علی الصبح دوڑے دوڑے آئے اور کہنے لگے ———

"سکندر حیات کا انتقال ہو گیا ہے گزشتہ رات اپنی ایک بیٹی اور دو بیٹوں کی شادی سے فارغ ہو کر آرام کے لیے بیڈ روم میں گئے تھے کہ حرکت قلب بند ہو گئی

گھنٹہ پہلے جس شامیانے میں براتی بیٹھے تھے اب وہاں ماتمی بیٹھے ہیں۔"

موت کے دروازہ پر سبھی اختلافات ختم ہو جاتے ہیں میرا احمقانہ پن تھا کہ میں نے اُن کی موت پر خوشی محسوس کی میرے سامنے اُس وقت کچھ "ذہنی تصویریں" تھیں۔ مثلاً اُن کا احرار کو تختۂ ستم بنانا میرے معاملہ میں سنگین ہو جاتا۔ خاکساروں کا پٹنا اور پٹوانا اس کے علاوہ برطانیہ کے یار وفادار تھے اور اس کی خاطر مسلمان مملکتوں سے لڑے تھے اُن کی موت سے واقعی برطانیہ کا ایک اہم ستون ٹوٹ گیا لیکن اُن کی موت سے پنجاب کو بھی نقصان پہنچا کانگرسیوں کو اُن کی موت کا بہت قلق ہوا گوپی چند بھارگو دن بھر ملول رہے کافی دیر تک ان کی خوبیوں کا تذکرہ کیا ان کا خیال تھا کہ وہ ایک معتدل مزاج اور صاحب دل انسان تھے سر فضل مرحوم کی طرح انہوں نے بھی انگریزوں پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا لیا تھا وہ انگریزوں کا اثر قبول ہی نہیں کرتے بلکہ ان پر اپنا اثر بھی ڈالتے تھے میں نے جیل سے انہیں دو خط لکھے اور دونوں سپرنٹنڈنٹ کی معرفت بھجوائے تھے میرا خیال ہے کہ وہ خط اُن تک نہیں پہنچے جیل کے حکام نے رکھ لیے یا سی آئی ڈی عادتاً ہضم کر گئی۔ تاہم میں نے یہ خط بیرنگ بھجوا دیئے جن میں سے ایک خط رہائی کے بعد ہفتہ وار "ادا کار" میں چھپوا دیا پہلا خط اُس وقت لکھا جب انکے نامور فرزند سردار شوکت حیات اٹلی کے ہتھے چڑھ کر قید ہو گئے سکندر اس وقت سخت غمگین تھے میں نے انہیں لکھا کہ بیٹے کی قید سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ جن والدین کے بچے آپ نے استعمار کی خاطر قید کر رکھے ہیں ان کے دل پر اولاد کی جدائی سے کیا گزر رہی ہو گی دوسرا خط اُن کی صاحبزادی کو لکھا انہوں نے یوم اقبالؒ پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا مسلمان عورت کو اقبالؒ کا پیغام یہ ہے کہ فاطمۃ الزہراؓ کا اتباع کریں جو سید الشہداؓ کی ماں ہیں یہ غالباً حضرت علامہؒ

کے اس شعر کی طرف اشارہ تھا ؎

بتولے باش وپنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

میں نے اپنے خط میں اُنہیں لکھا کہ آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ ہندوستان کی اس کربلا میں ابوسفیان کا سیاسی پوتا کون ہے؟

ڈاکٹر گوپی چند بھارگو

ایک روز مجھے اچانک بخار ہوگیا شام تک درجہ حرارت بڑھتا رہا نیم بے ہوشی رہی ساتھیوں نے تیمار داری میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ تلک راج، پربودھ، کلبیر، عبدالستار، میرے سرہانے بیٹھے رہے بستر ہی پر بول براز کیا معاً غش آگیا کوئی تین گھنٹے بعد ہوش آیا تو ڈاکٹر گوپی چند بھارگو میری نبض دیکھ رہے تھے معلوم ہوا انہوں نے اب تک تین انجکشن دیئے ہیں چوتھا انجکشن اب دے رہے تھے میں نے قدرے تامل کیا لیکن ڈاکٹر صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا ——— "یہ اہنسا وادی کا ہاتھ ہے کوئی تکلیف نہ ہوگی"۔ تھوڑی سی دیر میں سکون ہوا تو کہنے لگے میرے خلاف تمہارے دل میں جو بات بیٹھی ہوئی ہے اس کا بیشتر حصہ غلط فہمی پر مبنی ہے حقائق مختلف ہیں تیسرے روز میں بالکل ٹھیک ہوگیا ڈاکٹر صاحب نہایت تندہی اور ہمدردی سے علاج کرتے رہے وہ ہماری بیرک سے کوئی دو فرلانگ پر تھے لیکن اس دوران میں صبح آتے اور شام تک وہیں رہتے تھے میں اُن کا شکریہ ادا کرنے کے لئے شاہی وارڈ میں حاضر ہوا تو انہوں نے بہت سی باتیں چھیڑ دیں۔ بولے "مجھے معلوم ہے کہ موری دروازہ کے جلسہ عام میں مجھ پر جو حملہ ہوا تھا اس میں تمہارا نام

بلا وجہ شامل کیا گیا پولیس نے اپنے طور پر تمہیں گرفتار کیا یہی وجہ ہے کہ میں نے اس مقدمہ میں شہادت دینے سے انکار کر دیا تھا۔

تمہاری بی کلاس کے سلسلے میں نے کئی دفعہ سکندر حیات سے کہا وہ پہلے تو مانے نہیں پھر ہوں ہاں کرتے رہے۔ پیچ یہ تھا کہ سی آئی ڈی کے حکام مانع تھے حتیٰ کہ تمہارے لاہور لانے ہی کے خلاف تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے احرار سے اپنے تعلقات کی کشیدگی کے وجوہ بھی بیان کیے۔ ڈاکٹر ستیہ پال کا ذکر ہوتا رہا جو فوج میں بھرتی ہو کر چلے گئے تھے ڈاکٹر صاحب نے کہا "میں سردار صاحب کو کیا کہتا، وہ احرار کو اور احرار اُنہیں ختم کرنے کے درپے تھے میں نے ڈاکٹر صاحب کی باتوں پر کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ ایک۔ تو یہ محل نہ تھا دوسرے گزشت آنچہ گزشت۔

ڈاکٹر صاحب کے بارے میں خود نیشلسٹ مسلمانوں کو کبھی حُسنِ ظن نہیں رہا صرف ڈاکٹر سیف الدین کچلو اُن کے ساتھ رہے یا اُنہوں نے ڈاکٹر صاحب کا ساتھ دیا پنجاب میں ڈاکٹر کچلو جب کبھی صوبہ کانگریس کے صدر منتخب ہوتے تو انہی کی مدد سے" احرار میں مولانا حبیب الرحمٰن بھی اُن کے قائل تھے ان کا خیال تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی بعض باتیں درست ہیں مثلاً وہ مسلمانوں کی بہ نسبت ہندوؤں کے نزدیک ہیں تو ——— وجہ ظاہر ہے کہ ہندو ان کے نزدیک ہیں پھر جب ان کی پارٹی کانگرس کو روپیہ دیتی اور اُسکی اکثریت ہے تو کانگرس پر اُسی کا قبضہ ہوگا۔

وہ پنجاب میں لالہ لاجپت رائے کے نائب اور گاندھی جی کے اتنے ہی بھگت تھے جتنے پٹیل، وہ پٹیل کی طرح مضبوط تو نہ تھے لیکن پٹیل کا عکس ضرور تھے وہ مسلمانوں کے لیے اپنے دل میں کوئی جگہ نہ رکھتے تھے انہوں نے صوبہ کانگرس کو اپنی داشتہ بنا کر رکھا۔

جس کانگریس نے صوبہ میں اُن سے ٹکر لی شکست کھا گیا وہ فی الحقیقت ایک شاطر انسان تھے انہوں نے ڈاکٹر ستیہ پال جیسے آزمودہ کار اور جری انسان کو کانگرس سے بھاگ جانے پر مجبور کر دیا اور وہ فوج میں میجر ہو کر چلے گئے جو شخص اُن کی مرضی کے خلاف صوبہ کا صدر منتخب ہوتا یا منتخب ہونے کے بعد ان کے ساتھ نہ چلتا زچ ہو کر نکل جاتا یا اُسے نکلنا پڑتا میاں افتخار الدین کو انہوں نے بھگا دیا گو اس میں میاں صاحب کی سیمابی طبیعت کو بھی دخل تھا لیکن ڈاکٹر صاحب نے اُنہیں بددل کرنے میں برابر کا حصہ لیا مولانا داؤد غزنوی کی صدارت کو انہوں نے اپنے لیے چیلنج سمجھا لیکن جب مولانا لیگ میں شامل ہو گئے تو اسے اپنی فتح گردانا چونکہ ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو مولانا ابوالکلام سے پُرخاش تھی اس لئے وہ انہیں قریب رکھتے یا اُن کے قریب رہتے تھے مولانا آزادؒ کے دل و جان سے مخالف تھے مولانا بھی معاف کرنا نہ جانتے تھے انہوں نے جب چاہا انہیں کانگرس میں صفر کر دیا ان کی جگہ بھیم سین سچر کو پارٹی کا لیڈر اور صوبہ کا وزیر بنوا دیا۔ صوبہ کانگرس مولانا داؤد غزنوی کے حوالے کر دی اور جسے چاہا ٹکٹ دیا اُن نوجوانوں کو آگے بڑھایا جو یہ نیشلسٹ یا سوشلسٹ تھے اور جن کا گوپی چند گروپ سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ملک کی تقسیم کے بعد بھی مولانا نے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کو پنپنے نہ دیا جب موقع ملا چت کر ڈالا یا تا توی پوزیشن وہی آخری دنوں میں سردار پٹیل سے مولانا کی جو بدمزگی ہوئی گوپی چند بھارگو اسی تڑپ کی دگی تھے —— مولانا کے نزدیک یہ لوگ انسانی آبروؤں کے بیوپاری اور انسانی جانوں کے دلاّل تھے لیکن مولانا کبھی کوئی بات زبان سے نہیں کہتے تھے جو شخص جرم کا ارتکاب کرتا اس کے مطابق اُسے صحیح مقام پر لے جاتے اُن کے نزدیک ایسے اشخاص کی سزا کے لئے یہی کافی تھا —— اس رنگا رنگی کے باوجود ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں اعتدال تھا وہ نرم خو، نرم لہجہ، نرم مزاج اور نرم طبیعت کے انسان تھے

اُن کی بدولت کانگرس کی صوبہ میں وہی پوزیشن رہی جو سردار سکندر حیات کے زمانہ میں صوبہ مسلم لیگ کی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ایک چلبلا لڑکا ملک راج بھی قید میں تھا۔ نین نقش تیکھے' ہنس مکھ' گورا رنگ' شربتی آنکھیں' لمبی ناک' میانہ قد' ایسا کی بولتی چالتی تصویر معلوم ہوتا تھا ڈاکٹر صاحب کسی مندر سے کوئی مورتی اُٹھا لائے ہیں وہ ڈاکٹر صاحب کا باہر بھی سیکرٹری تھا اور اندر بھی۔ ہم اُسے "ملک ٹھیک" کہہ کر چھیڑا کرتے اُس میں غصے یا خفگی کا شائبہ تک نہ تھا جس سے ملتا خوش ہو کے ملتا اور موج خرام یار کی طرح گل کتر جاتا تھا۔

بے قابو حالات

باہر جو ہو رہا تھا کوئی راز نہیں رہا تھا سب باتیں آشکار تھیں تمام اخبارات مل جاتے تھے کچھ جائز طریق سے کچھ چوری چھپے' جنگ کا حال یہ تھا کہ ابھی تک اتحادی ہٹ رہے تھے جاپان ہندوستان کے دروازے تک آپہنچا تھا برما میں اس کی فوجیں اتر چکی یا اتر رہی تھیں جنرل رومیل نے لیبیا کو گرما رکھا اور اتحادی پے در پے شکست کھا رہے تھے ہٹلر کی فوجیں روس کے میدانوں کو پامال کرتی ہوئی ماسکو کی طرف بڑھ رہی تھیں کانگرس ہائی کمانڈ قید میں تھا لیکن معلوم نہ تھا کہ کون کہاں ہے؟ عرصہ بعد پتہ چلا کہ کانگرس ہائی کمانڈ کو احمد نگر کے قلعہ میں رکھا گیا اور مہاتما گاندھی کو آغا خان کے محل میں' افواہ یہ تھی کہ انہیں ہندوستان سے باہر کسی نو آبادی میں لے گئے ہیں پورا ملک جیل خانہ بنا ہوا تھا خبریں آکے نکل جاتی تھیں ہمیں دو قسم کی خبروں سے دلچسپی تھی ایک۔ کانگرس سے سرکار کی صلح کب ہوگی اور ملک اس صلح کے بعد کیا

کروٹ لیتا ہے؟ دوسرے جنگ میں اتحادی کب ہارتے ہیں؟

ایک روز صبح دس بجے لالہ چھوٹو رام آنکلے سنا تھا کہ زبان آور ہیں دیکھا تو جو سُنا تھا وہی پایا چونکھی لڑنے میں کمال تھا جس نے آوازہ کسا اس نے آوازہ سنا، پھبتی کا جواب پھبتی سے، طعن کا طعن سے، طنز کا طنز سے، ضلع جگت کا ضلع جگت سے، بلا کے حاضر جواب تھے اُنہیں اپنے سیاسی موقف پر رتی بھر شرمندگی نہ تھی۔ سننے بھی تھے اور سناتے بھی سکندر حیات کے بعد وہی پارٹی کا دماغ سمجھے جاتے ملک خضر حیات وزیر اعلیٰ ضرور تھے لیکن یونی نسٹ پارٹی کی تنظیمی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں تھی میں نے کہا ——

"چودہری جی! آپ آ گئے شکریہ لیکن ملک خضر حیات کہاں ہیں کبھی اُنہیں بھی تو بھیجئے؟"

"میاں وہ تو واجد علی شاہ ہیں جان عالم پیا کی طرح غسل خانے میں ہوں گے یا زنانے میں۔"

"اور آپ؟ ملک کندن لال نے" لطف لینے کے لیے چٹکی لی۔

"فی الحال قید خانے میں آپ کے پاس" زناٹے کا قہقہہ بلند ہوا اور چودہری صاحب پھریری لیتے ہوتے چلے گئے۔

ساتھیوں کی رہائی

اپنی اپنی قید گذارنے کے بعد کچھ ساتھی رہا ہو گئے انکے چلے جانے سے کوئی چیز کھو سی گئی لیکن بعض ایسے ساتھی بھی رہا ہو رہے تھے جن سے ہماری دماغی رونقوں اور دلی مسرتوں میں اضافہ ہوا تھا یوسف مہر علی کی رہائی کا ذکر پہلے آ چکا ہے ان کے بعد

گووند سہائے چلے گئے وہ لکھنؤ کے ایک تیز و طرار اور ذہین و فطین نوجوان تھے ایک زمانہ میں رفیع احمد قدوائی کے پرائیویٹ سکریٹری رہے تھے قدوائی نے ٹکٹ دلوا کر صوبائی اسمبلی کا ممبر بنوا دیا۔ وہاں اپنی قابلیت سے پہلے ان کے پارلیمنٹری سکریٹری پھر چیف پارلیمنٹری سکریٹری ہو گئے بڑے ترت پھرت نوجوان تھے۔ شکل و صورت واجبی، قد درمیانہ، چہرہ بے رونق، نقش گوارا لیکن بول چال میں قیامت، انگریزی اس طرح بولتے جیسے مادری زبان ہو لکھتے اس طرح کہ آفنٹ چل رہی ہے۔ ہندی اور انگریزی دونوں زبانوں کے مصنف تھے ان کی ایک کتاب کا اردو ترجمہ "شہنشاہیت" کے نام سے مکتبہ برہان نے شائع کیا تھا دوسرا "معلومات جنگ" کے نام سے مکتبہ زمزم نے پکے وشنو اور کٹر ہندو تھے لیکن بڑے ہی خوشگوار آج کل یو پی گورنمنٹ میں غالباً وزیر مالیات ہیں جب سے آزادی آئی ہے لگاتار وزیر چلے آ رہے ہیں۔[1]

پاکستان بننے سے پہلے ایک دوست مجھے اُن کے ہاں لکھنؤ لے گئے اس زمانہ میں جیل خانوں کے وزیر یا پارلیمانی سکریٹری تھے کانگرسی وزارتوں میں پارلیمانی سکریٹری کو بھی انتظامیہ کے اختیارات حاصل تھے ـــــ اُن دوست کے کوئی عزیز یو۔پی میں قید تھے اُس کی قید کا ایک ماہ باقی تھا اور وہ اُسے عام معافی دلوا کر رہا کرانا چاہتے تھے مَیں نے سہائے سے کہا خوش دلی سے پیش آئے اور گھر بیٹھے بیٹھے انسکپٹر جنرل کو رہائی کی ہدایات جاری کر دیں آئی دفعہ اُن سے ایک اور ملاقات ہوئی اُن دنوں ہر جگہ وزارتی مشن کے پلان کا چرچا تھا سہائے تقسیم کے حق میں اور سمجھوتہ کے خلاف تھے اُن کا

---

[1] افسوس کہ اب اُن کا انتقال ہو گیا ہے۔

خیال تھا پاکستان بن جاتے تو ہندوستان ہندو مسلم مسئلہ سے خلاصی پالے گا اس کے بعد ہندو اکثریت کو ہر دائرے میں اپنے نظریات و خیالات کے مطابق نشوونما پانے کی آزادی ہوگی۔

"ان نصف کے لگ بھگ مسلمانوں کا کیا بنے گا جو تقسیم کی صورت میں بھی وہاں رہ جائیں گے" میں نے پوچھا

"کیا بنے گا؟" گووند سہاتے ہنسا۔ "تیسری طاقت کے چلے جانے اور ہندوستان کے بٹ جانے سے یہ مسئلہ از خود ختم ہو جاتے گا جن مسلمانوں کے مفادات پاکستان میں ہیں وہ پاکستان چلے جائیں گے جو رہ جائیں گے انہیں ہندوؤں میں واپس آنا ہوگا آخر اُن میں نوے فی صد ہندوؤں ہی کی اولاد ہیں۔

"اچھا تو آپ انہیں شدھ کرنے کا سوچ رہے ہیں"۔

وہ اِس طرح مسکرایا جیسے اس کی تائید کر رہا ہو۔

'بھئی کانگرس کے بعض نیتا پاگل ہیں وہ تقسیم قبول کرلیں تو ہمارے ہاتھ سے جاتا کم آتا زیادہ ہے۔"

لالہ برج کشن چاندی والا

یہ سنگین صورتحال جس کا یو۔ پی کے مسلمانوں کو آج مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے اُن لوگوں کے ذہن میں پہلے سے تھی صرف وقت کا انتظار تھا ایک شریف انسان لالہ برج کرشن چاندی والا بھی ہمارے ساتھ تھے۔ دہلی کے متمول گھرانے سے تھے اُن کے بڑے بھائی ایسوسی ایڈ پریس آف انڈیا کے جنرل منیجر یا مینیجنگ ڈائریکٹر تھے وہ اپنے منصب

کی وجہ سے وائسرائے کو بلا واسطہ مل لیتے اور اسی طرح بہت سی خبریں لے آتے تھے ان کی معرفت بہت سی تجویزیں کانگرس راہنماؤں کے پاس آئیں اور بہت سی حکومت کے ہاں جاتی تھیں آپس میں ایک ذریعہ بنا ہوا تھا۔ برج کرشن؛ انسان نہیں دیوتا تھے بڑے ہی منکسر المزاج تعصب، انہیں چھوا تک نہیں تھا گاندھی جی نے منہ بولا بیٹا بنا رکھا تھا۔ جھگڑوں جھمیلوں سے دور، ٹھٹھے مذاق سے نفور کم آمیز، احرار کی بے جگری کے بہت قائل تھے کہنے لگا پچھلے سال جب وہ گجرات جیل میں تھے تو احرار کے سالار سردار شفیع بھی وہیں تھے ایک دن کچھ ساتھی سردار صاحب کے کمرے میں بیٹھے شطرنج کھیل رہے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ کا اردلی آیا اور انہیں ایک تار دے کر چلا گیا۔ سردار صاحب نے وہ تار پڑھا اور جیب میں ڈال لیا پوچھا خیریت ہے؟ کہا اللہ کا شکر ہے بات آئی گئی ہو گئی شطرنج چلتی رہی کوئی دو گھنٹہ بعد محفل برخاست ہوئی تو سردار صاحب اُٹھ کر اپنی چارپائی پر لیٹ گئے دن گزر گیا شام ہوئی تو سپرنٹنڈنٹ اچانک آ گئے اور اُن سے افسوس کرنے لگے تب پتہ چلا کہ سردار صاحب کا پندرہ سولہ برس کا اکلوتا بچہ انتقال کر گیا ہے ہم نے سردار صاحب سے کہا آپ نے غضب کیا بتایا تک نہیں۔ سردار صاحب نے اپنے ضبط کو سنبھالا دیتے ہوئے کہا "اللہ کی رضا تھی پوری ہو گئی ہم قدرت کے سامنے بے بس ہیں میں نے یہی بہتر سمجھا کہ آپ کو آزردہ نہ کروں جو ہونا تھا ہو چکا آپ دعا کیجئے میں بھی دعا کر رہا ہوں۔"

برج کرشن نے بتایا کہ ہم نے اُن سے پیرول پر چلے جانے کی خواہش کا اظہار کیا اور یہاں تک کہا کہ ہم خود کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کسی طرح راضی نہ ہوتے صرف اتنا کہا کہ "حکومت سے کسی رعایت کی درخواست کرنا مناسب نہیں" برج کرشن اس واقعہ کو پچھے

ایثار اور کھری استقامت کا مثالی نمونہ کہتے اور سردار صاحب کی بسالت و شجاعت کے بے حد گرویدہ تھے مہاتما گاندھی کے بارے میں عجیب و غریب باتیں بیان کرتے انہیں بہت بڑا رشی سمجھتے اُن کا عقیدہ تھا کہ ایک ہزار برس سے ہندوستان میں اتنا بڑا انسان پیدا نہیں ہوا ہے۔

اونکار ناتھ

دہلی کے ایک اور نوجوان لالہ اونکار ناتھ ہمارے ساتھ اسی وارڈ میں تھے بڑے ہی ہنس مکھ، متواضع، خوبرو، خوش خصلت، امیر کا شعر ہے ؎

دلّی کے نہیں کوچے اوراق مصوّر ہیں
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

اونکار ہو بہو اس کا عکس تھے تعصب ان کے تصور میں سے بھی نہیں گذرا تھا۔ گنتی بند ہونے سے پہلے ہر ساتھی کے پاس جاتے خیر خیریت پوچھتے اور یہ زبانی کلامی ہی نہیں تھا بلکہ خدمت بھی کرتے تھے لوگوں کو کھلا کے خوش ہوتے دہلی سے ہفتہ میں دو بار اُن کیلئے مٹھائی آتی دوستوں کو باقاعدہ بھیجتے اور اس میں خوشی محسوس کرتے تھے جتنے دن رہے چہل پہل رہی تمام لوگ عقیدہ و خیال کی بوقلمونی کے باوجود ان سے خوش تھے تیسرے ایک معمر انسان ڈاکٹر سکھدیو لال تھے جن کا ذکر پہلے آچکا ہے کٹر آریہ سماجی لیکن بڑے خوش مزاج بڑھاپے میں بھی باغ و بہار لیڈروں کے واقعات سنا کر خوش کیا کرتے تھے۔

تمام دن اسی طرح کٹ جاتا بعض لوگ تو بالکل کتابوں ہی کے ہو گئے تھے مثلاً ٹیرسٹوں میں پنڈت روپ چند کتابوں کے کیڑے تھے لیکن جو پڑھتے بیان نہیں کر سکتے تھے ——— کندن لال ملک کتابوں کے دشمن تھے۔ ان کے ٹیررسٹ ساتھی انہیں اُستاد پیڈرو کہتے۔

تھے غصیل لیکن خلیق، چودہ سال قید میں، بہ روایت کشوری لال پنڈت انہوں نے بمشکل دو کتابیں پڑھی ہوں گی اور وہ بھی جاسوسی ناول، کشوری لال ضابطہ سے پڑھتے اور ضابطہ سے رہتے تھے گلاب سنگھ مجلسی آدمی تھے انہیں پکانے اور دوستوں کو کھلانے کا شوق تھا۔ عموماً پارٹیاں ترتیب دیتے تھے۔

تلک راج چڈھا

تلک راج چڈھا کتابوں کے رسیا تھے بہت پڑھتے تھے اقتصادیات میں ایم اے تھے بیحد پڑھتے اور پڑھاتے بھی تھے میرے ساتھ ان کا دوستانہ تعلق وسیع ہوگیا یوسف مہر علی کے ایما اور اپنے اخلاص سے مجھے سوشلزم پڑھانا شروع کیا۔ میں اُن کی معلمی کا قائل ہوگیا مارکسزم اور سوشلزم پر اس انداز میں لیکچر دیتے اور نوٹ لکھواتے کہ ہر چیز دل پر نقش ہوگئی جدلیات کیا ہیں، تاریخ میں معاشی قوتیں کیونکر کام کرتی ہیں، سرمایہ محنت کی کشمکش کیا ہے؟ سرمایہ کسے کہتے ہیں محنت اور زائد محنت کیا ہیں؟ طبقاتی سماج کیونکر پروان چڑھتا ہے عدم طبقاتی سماج کیسے وجود میں آسکتا ہے؟ غرض اس موضوع اور مضمون کے جتنے مباحث تھے پروفیسر تلک راج کی رہبری سے حل ہوگئے اور میں نے ان کا طالب علم بن کر ان مسائل میں تجزیاتی بصیرت پیدا کرلی مجھے یہ لکھتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ تلک راج چڈھا ان مضامین میں میرے اُستاد تھے ایک مثالی نوجوان جو عمر میں مجھ سے چھوٹا تھا لیکن علم اور تجربہ میں بڑا! اسی سیرت کے نوجوانوں کی بدولت قدرت کے کارخانے میں شرافت اور دیانت کی قدریں مرنے نہیں پاتی ہیں ہم نے اخلاق عظیمہ کے بہت سے تذکرے پڑھے ہیں تلک راج چڈھا اسی اخلاق کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھے اُس وقت ۲۷ یا ۲۸ برس کی عمر کے پیٹے میں ہوں گے

انہیں انتڑیوں میں تکلیف تھی۔ وہ دیولی کیمپ سے گجرات جیل اور گجرات سے علاج کیلئے لاہور آئے سفید رنگ، تیکھے نقش، میانہ قد، دبلا جسم، کھُلا ماتھا، بدن پر گوشت تو پہلے ہی نہیں تھا اب بیماری نے مشت اُستخوان بنا دیا تھا چھٹپنے ہی میں والدین کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ آٹھ برس کی عمر میں ایک ہندو حلوائی کی دوکان میں برتن مانجھنے پر نوکر ہو گئے صبح و شام گاہکوں کے جھوٹے کٹورے مانجھنا ان کا کام تھا رات کو دوکان ہی کے تھڑے پر سو رہتے سردیوں میں انگیٹھی کے پاس، گرمی میں ونٹ پاتھ پر، ایک دن اچانک لالہ گوکل چند بھسین ایڈووکیٹ کی نظر اُن پر پڑی انہوں نے محسوس کیا کہ کسی اچھے گھرانے کا بچہ ہے اور کوئی افتاد اس دوکان پر لے آئی ہے۔ حالات معلوم کئے تو قیاس صحیح نکلا لالہ گوکل چند انہیں گھر لے گئے اس وقت ان کے ہاں اولاد نرینہ نہ تھی بچیاں ہی بچیاں تھیں بیوی سے کہا اپنا سمجھ کر پالو قدرت نے لالہ جی کو اُسی سال بچہ دیا تلک راج نے پڑھ لکھ کر اقتصادیات میں ایم اے کیا اور ڈی اے وی کالج راولپنڈی میں اُستاد ہو گئے جتنی تنخواہ ملتی اپنے اخراجات کے لیے ایک چھوٹی سی رقم رکھ کر باقی دوستوں میں تقسیم کر دیتے ان کا معمول تھا جس روز تنخواہ ملتی اُسی دن ساتھی دوستوں کے گھر میں ماہانہ بھجوا دیتے بالخصوص اُن مسلمان ساتھیوں کے ہاں جو آئے دن قید و بند میں پڑے رہتے تھے۔

لالہ گوکل چند تلک کو اپنے بیٹوں سے بھی زیادہ عزیز رکھتے ہر طرح دلجوئی کرتے۔ تلک بھی اُن کا باپ کی طرح ادب کرتا سامنے آتے ان کے پاؤں چھوتا اور ہاتھ باندھ کر کھڑا رہتا لالہ گوکل چند کا حقیقی بیٹا پریم بھسین بھی قید میں تھا وجیہہ و شکل ذہین و فطین پولیٹیکل سائنس میں ایم اے، لیکن لالہ جی اور ان کی اہلیہ کے جتنے خط آتے سب تلک کے نام، لالہ جی تلک سے اپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہتے تھے لیکن تلک نے احتجاج کرتے ہوتے کہا میں اس گھر کا بیٹا ہوں آپ مجھے بہنوں سے کیونکر الگ کر سکتے ہیں؟ بہن اور بھائی میں میاں بیوی کا رشتہ

کیسے ہوسکتا ہے؟ لالہ جی کے خاندان میں ایک اور گھر تھا اس کی بیٹی نے تلک کے ساتھ ایم اے کیا اُس لڑکی نے ایک دن تلک سے کہا کہ آؤ شادی کرلیں تلک جھنجلا گیا کہنے لگا ہم ایک دوسرے کے بہن بھائی ہیں میں نے جس پریوار میں پرورش پائی ہے اس کا بیٹا اور بھائی بن کر رہنا چاہتا ہوں مجھے کوئی دوسری حیثیت منظور نہیں یہ واقعہ اس لڑکی کے بھائی نے مجھے خود سنایا اُسے قلق تھا کہ یہ جواب پاکر اس کی اکلوتی بہن نے خودکشی کرلی اور ہمیشہ کے لیے داغِ جدائی دے گئی لیکن وہ تلک کی تعریف بھی کرتا تھا کہ ہمارے ملک میں اس قسم کے خوش سیرت نوجوان بھی ہیں۔

۱۹۴۶ء کے آخری انتخابات میں وہ راولپنڈی کے شہری حلقہ سے اسمبلی کا ممبر ہوگیا میں نے جس نوجوان کے بارے میں بھی مولانا آزادؒ سے عرض کیا اس کو ٹکٹ مل گیا اور وہ اپنے مخالفوں کی ضمانتیں ضبط کراکے ممبر ہوگیا۔ تلک راج بھی انہی نوجوانوں میں سے ایک تھا ایک دن وہ بریڈلا ہال سے باہر ایک نازک سی خاتون سے کھڑا باتیں کر رہا تھا میں نے نظریں بچاکر نکلنا چاہا چڈھا نے آواز دے کر بلا لیا "شورش ان سے ملو تمہاری بھابی ہیں پروفیسر اجیت کور ایم اے (نام صحیح یاد نہیں آرہا) میں کل ان سے شادی کر رہا ہوں صبح دس بجے کورٹ میں چلے آنا۔ رات ایک مختصر سی دعوت بھی ہوگی اور اس طرح اُس کی شادی ہوگئی۔

——— تقسیم کے دنوں میں اُس کا مکان انارکلی میں تھا مجھے بلوایا اور کہا کہ میں لاہور ہی میں رہنا چاہتا ہوں کوئی صورت ہوسکتی ہے صورت کیا ہوتی؛ فضا کے خنجروں سے گھائل ہوکر مشرقی پنجاب چلا گیا وہاں صوبائی اسمبلی کے پہلے ہی اجلاس میں اعلان کیا کہ وہ ان لوگوں کے سامنے نہیں بیٹھنا چاہتا جن میں اکثریت اُن اشخاص

کی ہے جن کے ہاتھ انسانی خون سے رنگے ہوتے ہیں جنہوں نے مذہب کے اختلاف پر لوگوں کی بہو بیٹیاں اُٹھائی اور اُٹھوائی ہیں میں یہاں بیٹھے ہوئے بہت سے مکروہ چہروں کو جانتا ہوں۔ میرے لیے اس قاتل اسمبلی میں بیٹھنا ضمیر پر ایک بہت بڑا بوجھ ہے میں استعفیٰ دیتا ہوں یہ کہہ کر وہ اسمبلی ہال سے نکل گیا۔ آجکل مشرقی پنجاب کے کسی گورنمنٹ کالج میں پرنسپل ہے کبھی کبھار خوشگوار یادیں جاگ اُٹھتی ہیں تو ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہوتی ہے ؎

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشیں دل
می بینمت عیاں و دعامی فرستمت

سحر گل اور کلبیر سنگھ

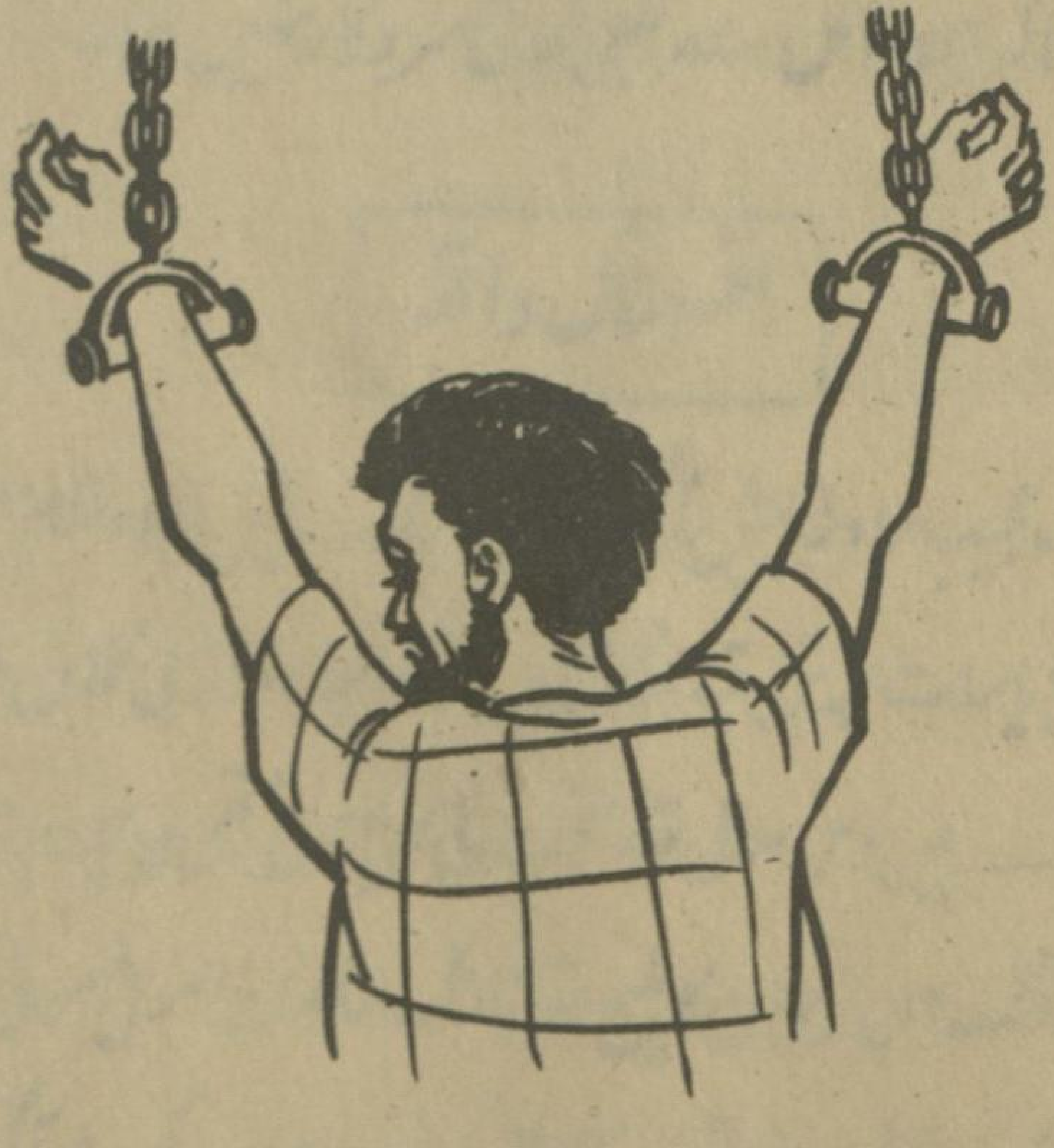
سحر گل اور کلبیر سنگھ یہ دونوں بھی علاج ہی کے لئے لاہور میں تھے جیل میں ہماری چار یاری کا چرچا تھا سحر گل کو ہفتہ عشرہ میں ایک آدھ دفعہ مرگی کا دورہ پڑتا جس سے اس کا سارا بدن ہل جاتا اس کی بُری حالت ہوتی تمام بڑے بڑے ڈاکٹر یہ بتانے سے قاصر تھے کہ مرض کیا ہے؟ کلبیر سنگھ کو بھی ایسا ہی کوئی مرض تھا قے آتی تو لگاتار ایک ایک گھنٹہ بے ہوش رہتا نہ غذا انہیں پچتی نہ وہ غذا کو پچتے یہ دونوں اس وقت برائے نام جی رہے تھے کلبیر سنگھ کو مطالعہ کا بہت شوق تھا اُس نے "پینگوین سیریز" کی بہت سی کتابیں خرید رکھی تھیں لیکن اب اس قدر لاچار تھا کہ عرصہ سے پڑھنا پڑھانا ترک کر دیا تھا تمام دن خوش وقتی کے لیے گپ بازی ہوتی یا اخباری اطلاعات پر تبصرہ و تجزیہ میرا معمول تھا کہ ہر روز کسی نہ کسی کتاب کے سو صفحے پڑھتا جو مقامات سمجھ میں نہ آتے

ساتھیوں سے پوچھتا، سیکھنے میں مجھے کوئی عار نہ تھا بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتیں بھی پوچھتا اور جب تک الفاظ و مطالب سے پوری آشنائی نہ ہو جاتی مضطرب رہتا نقص یہ تھا کہ میرے مطالعہ میں باقاعدگی نہ تھی جو سامنے آیا یا جو ملا پڑھ ڈالا۔ مذہب، تاریخ، ادب، سیاست، فلسفہ، سائنس، معاش، شاعری صرف ایک چیز ایسی تھی —— کہ میرا دل کبھی نہیں لگا اور وہ ناول یا افسانے تھے مقررین کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ناول انہیں زبان سکھاتے ہیں جس سے اظہار کی طاقت بڑھتی ہے میرا معاملہ اُس سے مستثنیٰ ہے میں نے زندگی بھر ناولوں کو ہاتھ ہی نہیں لگایا۔ قدیم ادب میں سے اگر دو چار ناول پڑھے بھی تو زبان کی لذت اُٹھانے کے لیے، میرا مشغلہ تھا کہ دن بھر دوستوں کے ساتھ محفل لگاتا۔ ڈیوڑھی کی سیر کر آتا جیل کا چکر کاٹتا قیدیوں کی نفسیات معلوم کرتا پھانسی پانے والوں سے ملتا ان کے مقدمات پوچھتا اور دن تھے کہ بھاگ چلے جا رہے تھے رات کو بڑے آرام سے پڑھتا اور ہضم کر کے پڑھتا۔ لکھنا تقریباً موقوف کر رکھا تھا طبیعت ہی اُدھر نہ آتی شاعری کا یہ حال تھا کہ جیسے اس سے کبھی کوئی سروکار نہیں تھا۔

افسوسناک واقعہ

اچانک ایک عجیب حادثہ پیش آگیا امرتسر کا ایک رئیس زادہ غلام مصطفیٰ اغوا کے ایک مقدمہ میں پانچ یا سات برس قید بھگت رہا تھا ایک روز بی کلاس میں ایک اور نوجوان آگیا اُسے قتل —— میں دس سال قید سخت کی سزا ہوئی تھی وہ چودہری چھوٹو رام وزیر مال کا بھتیجا یا بھانجا تھا رنگ اس نوجوان کا ملیح تھا نازک سا بدن، موٹی موٹی آنکھیں، بس یہ کہہ لیجئے کہ اسے دیکھ کر غزل ہو جاتی ۔ مصطفےٰ کی طبیعت میں کھوٹ آگیا دو نو بی کلاس

میں تھے مصطفےٰ کسی طرح اُسے ٹیررسٹ وارڈ میں لے آیا ہانگ کانگ کے ایک سکھ قیدی سے ٹھپس لڑائی دونو بدی پر تیار ہو گئے نوجوان نے مزاحمت کی مصطفیٰ نے گلا گھونٹا اور اس بُری طرح اُس کے رخساروں اور ہونٹوں کو کاٹا کہ زخموں کے نشان پڑ گئے آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اُبھر آئے بدن پر خراشوں سے دھاریاں پڑ گئیں۔ تمام جیل میں شور مچ گیا سپرنٹنڈنٹ دوڑتا ہوا آیا جیلر نے آسمان سر پہ اٹھالیا۔ ہم لوگ اپنے طور پر شرمندہ تھے کہ ہمارے وارڈ میں یہ واقعہ ہوا ہے آخر یہ قضیہ اس طرح ختم ہوا کہ ہانگ کانگ کے خود ساختہ پولیٹیکل قیدی جو تقریباً سبھی سکھ تھے اے کلاس کی مراعات سے محروم کر کے اخلاقی قیدیوں میں بھیج دیئے گئے شریک جرم نوجوان چکی میں ڈال دیا گیا مصطفیٰ کو تیس بیدوں کی سزا ملی ازاں بعد اُسے لاہور سنٹرل جیل سے ملتان سنٹرل جیل بھیج دیا گیا۔





مرگ کی گزرگاہ

اس ضمنی دروازے
سے مجرم کو
تختۂ دار
پر لے جاتے تھے



تختۂ دار

—— یہ بوڑھا درخت کبھی ہرا نہ ہوسکا



پرانا چوده نمبر ۱۴

قیدِ تنہائی کا
آخری سیل



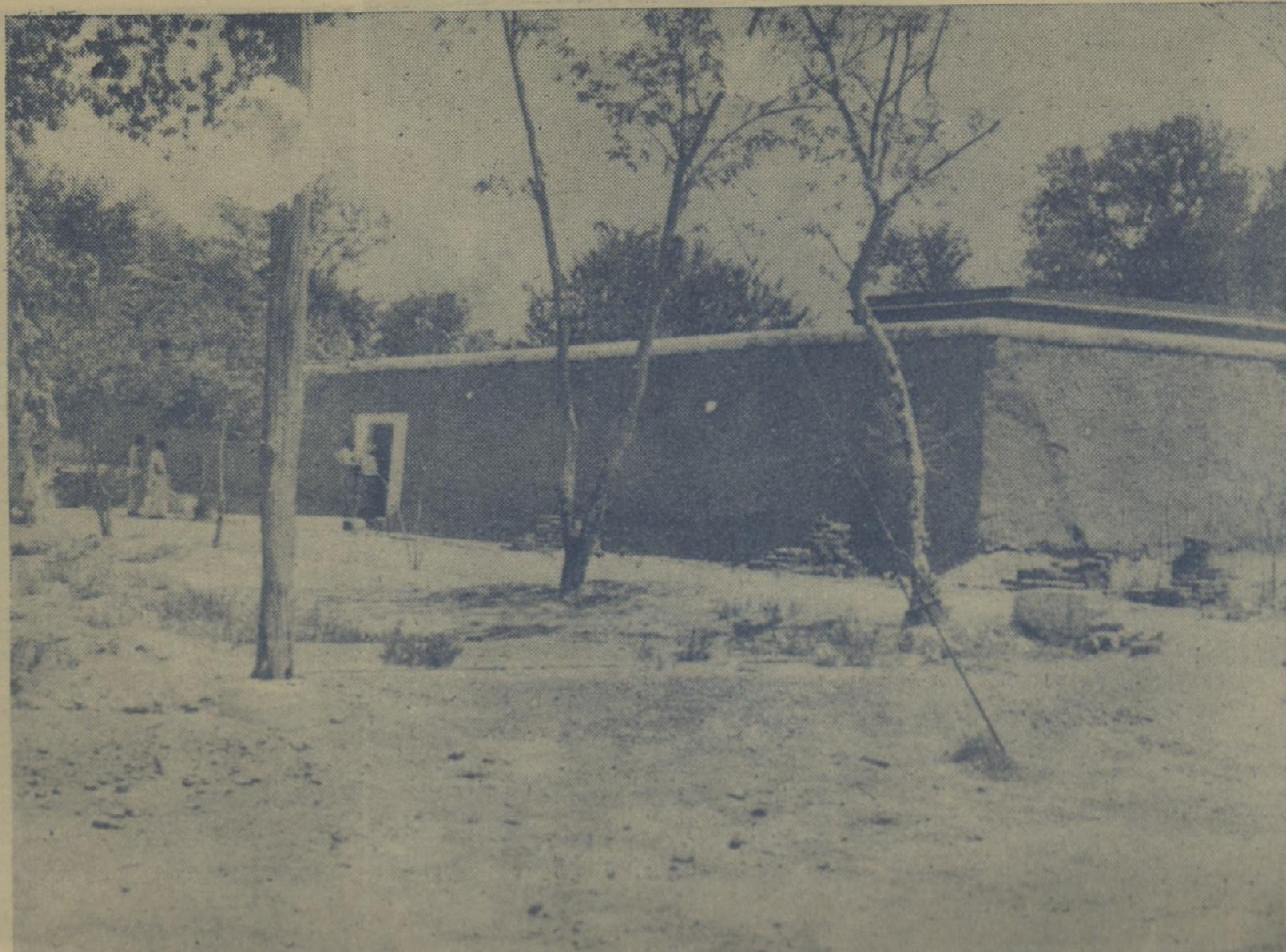
مولف

قیدِ تنہائی میں

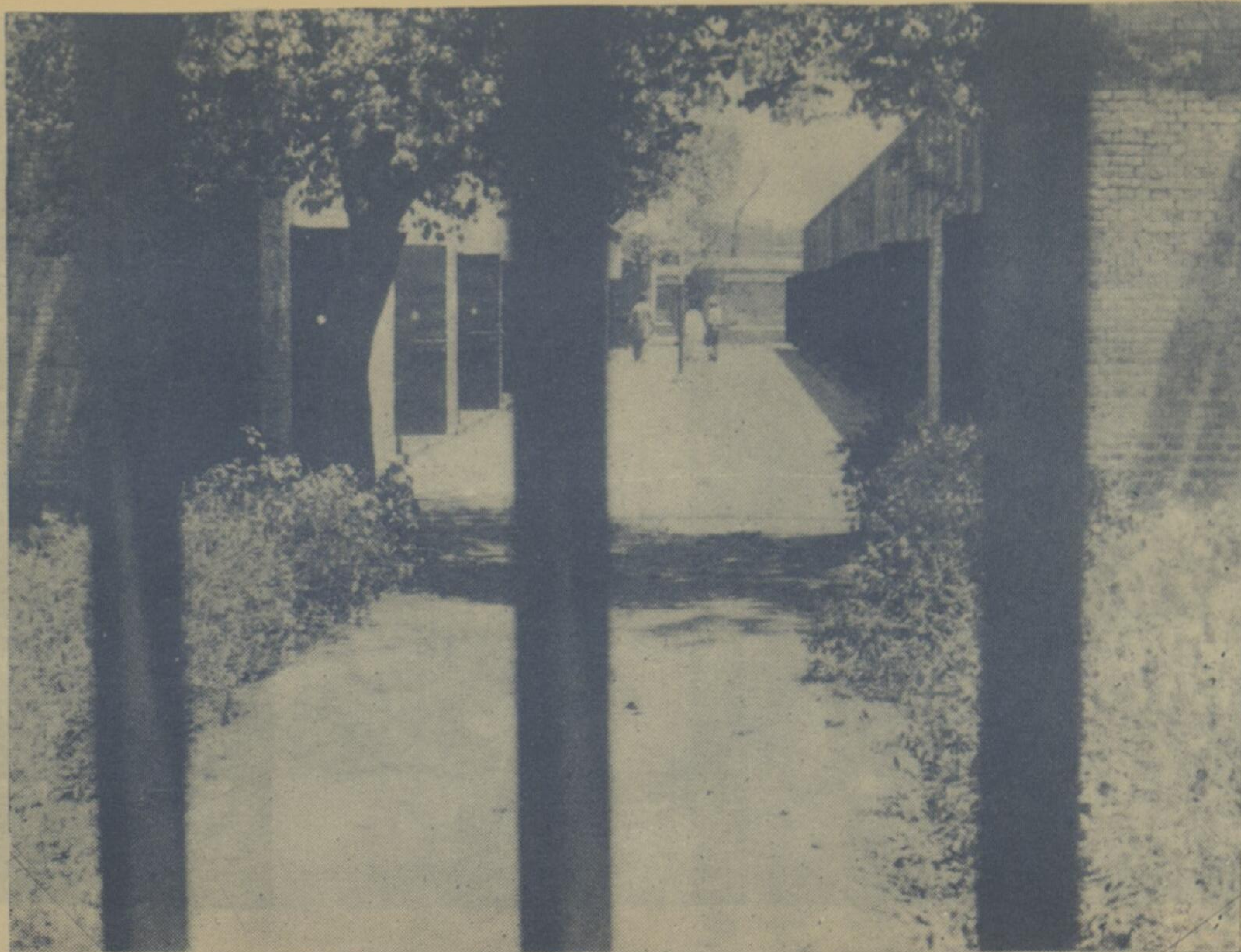


پھانسی کے حجرے

جہاں موت
انتظار کرتی ہے



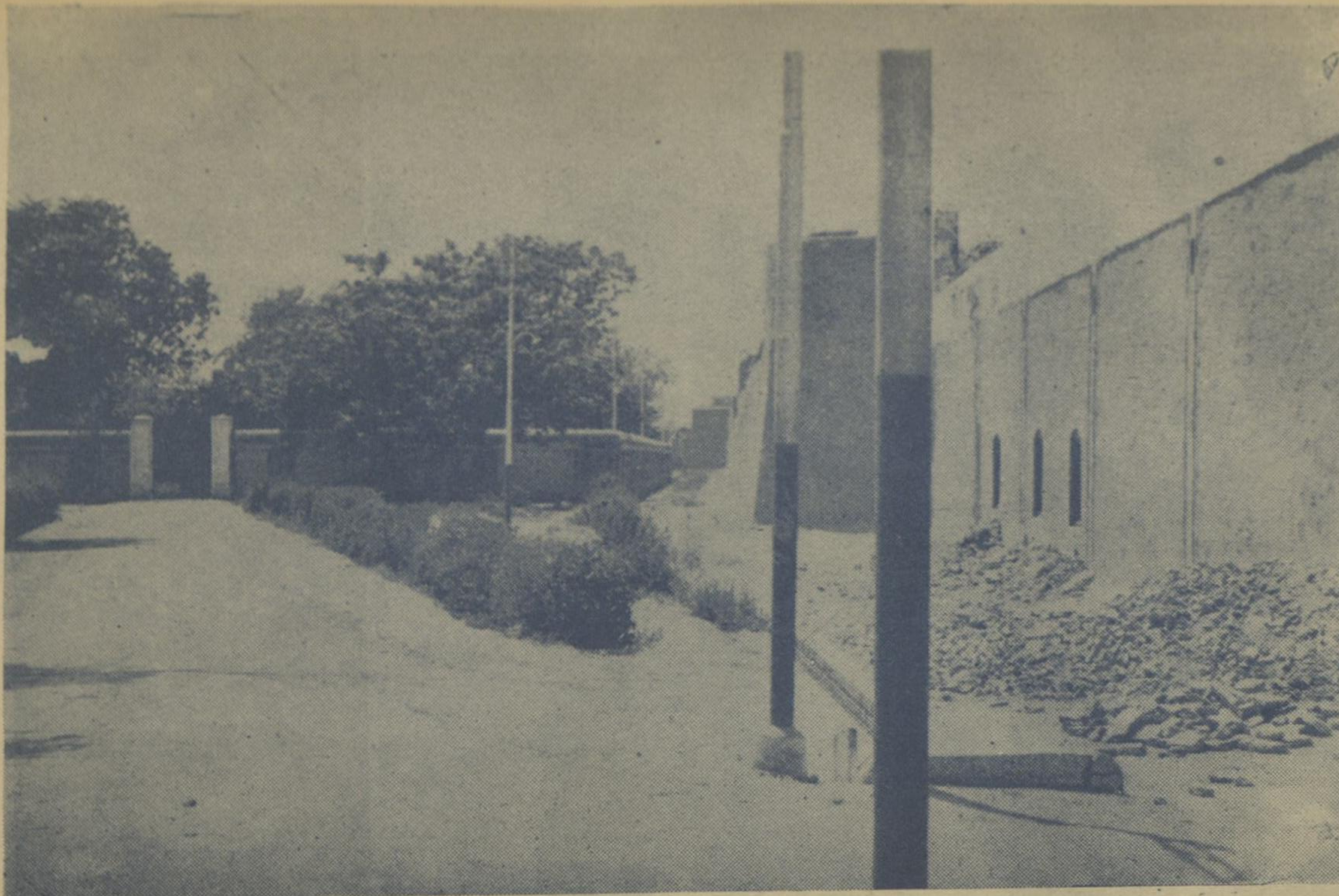
ٹیررسٹ
وارڈ



موت کے غار

نیا چودہ نمبر ۱۴

جہاں پھانسی پانے
والے قیدی
رکھے جاتے ہیں



سامنے پھانسی
پانیوالے قیدیوں کا
بلاک، اِدھر اونچی دیوار
کے پیچھے وہ کمرہ ہے جہاں
بھگت سنگھ اور اُنکے
ساتھیوں کا مقدمہ
سُنا گیا

ہندوستان میں برطانوی عملداری کو دو چیزوں نے مضبوط رکھا خارجی طور پر اس فوجی سپاہی نے جو ملک معظم کی سلطنت کے لئے اس ملک میں عام تھا داخلی طور پر سی آئی ڈی کے کارخانے نے جو برطانوی سرکار کی بقاء کے لئے ریڑھ کی ہڈی تھا اس محکمہ میں وہ لوگ شامل تھے جو انگریزوں سے زیادہ انگریزوں کے وفادار اور ایک جرم دریافت کرنے کے لیے خود دس جرم کرتے تھے پچھلے صفحوں میں یہ ذکر آ چکا ہے کہ انہیں اپنی ترقی کی اس قدر چاٹ لگی ہوئی تھی کہ جرم نہ ہو تو جرم بنا دیتے تھے ان کی بدولت بہت سے نوجوانوں کو تختہ دار پہ کھنچنا پڑا۔ ہزاروں پٹ گئے اور سینکڑوں جیل خانوں کی کال کوٹھڑیوں میں گھٹ گھٹ کر مر گئے انگریزوں نے ان دیسی صاحبوں کو اپنی قوم اور اپنے مذہب سے بیگانہ کر دیا تھا آخری تین چار دہائیوں میں سب سے زیادہ فائدہ جس قوم کے افراد سے اُٹھایا گیا وہ زیادہ تر مسلمان تھے اور مسلمانوں میں بھی دو فرقوں کے افراد خاص طور پر پیش پیش رہے میں نہیں کہہ سکتا اس کی وجہ کیا ہے اور نہ میں نے اس پر کبھی غور کیا ہے لیکن پنجاب میں اثنا عشری حضرات نے

برطانوی عملداری کے اس شعبہ کی بڑی خدمت کی ہے یہ کوئی تعریض نہیں بلکہ ایک طرح کا تاسف ہے کہ جن لوگوں کے سامنے حسین علیہ السلام کا اُسوہ ہو اور جو ہر سال کربلا کی یاد میں اشکبار ہوں ان کا سی آئی ڈی کے اہلکار کی حیثیت سے حریت و استقلال کے نام لیواؤں کی گردن پر چھری پھیرنا اور خود فروشی کی حد تک انگریزوں کی حاشیہ برداری کرنا ہولناک سانحہ تھا قادیانی جماعت کے پیروؤں کی ذہنیت تو سمجھ میں آتی ہے کہ ان کے پیرو اپنے سوا عام مسلمانوں کو مسلمان ہی نہ سمجھتے تھے ان کے لئے انگریزوں کی سلطنت آیہ رحمت تھی وہ اگر عرب ملکوں میں جاسوسی کرتے یا برطانوی فوج کے اعضاء و جوارح تھے تو یہ کوئی عجوبہ نہ تھا اُن کے عقیدہ کا جزو تھا میں نے جس زمانے میں قومی تحریکوں سے شناسائی حاصل کی پنجاب سی آئی ڈی میں اکثریت اثنا عشریوں کی تھی خال خال سُنی بھی تھے لیکن ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہوئے ان لوگوں نے انتہائی مظالم روا رکھے جو اُن کے ہتھے چڑھ گیا فنا ہو گیا اُن کے نزدیک پولیٹیکل نوجوانوں کو کچلنے اور من مانی کرنے کے لئے ہر حربہ جائز تھا قبر تک تعاقب کرتے اور ستم توڑتے ان کے ہاں ہر سیاسی کارکن کا ہسٹری شیٹ کھلا ہوا تھا جس میں شاذ ہی کلمہ ہائے خیر ہوتے۔ اپنے بارے میں اُن کا خیال تھا کہ مامور من اللہ ہیں اور اُن کی خاندانی وجاہتوں میں کوئی زخم نہیں ہے محکمہ کے مٹھی بھر افسروں نے اپنے ادنیٰ اہل کاروں کی معرفت ہر دور میں بہیمیت کا چولہا گرم رکھا جو کوئی نوجوان اُن کے ہاتھوں قید ہوتا اس کا پیچھا کرتے انتہائی ستم ڈھاتے اور اپنے فرائض کا جزو سمجھتے تھے ان فرائض کو انہوں نے اپنی ترقیوں کا زینہ بنا رکھا تھا ——— جسٹس ینگ کے الفاظ میں "پولیس کے فرائض شکاری کُتے کے نہیں بلکہ رکھوالے کُتے کے تھے لیکن سی آئی ڈی نے شکار کرنے اور شکار پیدا کرنے ہی کو حُسن و خوبی سمجھا" ایک دن میجر حبیب اللہ شاہ نے کلبیر سنگھ سے کہا کہ تمہارے

متعلق سی آئی ڈی نے لکھا ہے کہ تم بڑے خطرناک ہو اور خدشہ ظاہر کیا ہے کہ جیل سے بھاگ جاؤ گے کلبیر سنگھ نے کہا" اُن کا خیال غلط نہیں ہے۔"

"تو کیا یہاں سے بھاگ جاؤ گے؟"

"جی ہاں۔ جب داؤ لگا ضرور بھاگ جاؤں گا۔"

"تو یہ گویا چیلنج ہے ـــــ"

"آپ کو نہیں سی آئی ڈی کو۔"

"تو پھر ہمیں انتظام کرنا چاہیئے؟"

"ضرور"

انتظام یہ کیا کہ کوٹھڑی کی پشت پر وارڈروں کا پہرہ لگا دیا یہ تمام وارڈر سی آئی ڈی کی معرفت بھرتی ہو کے آئے تھے قیاس تھا کہ پولیس کے باقاعدہ ملازم ہیں جب سحر گل اور کلبیر سنگھ کو یقین ہو گیا تو انہوں نے ازراہ مذاق لیکن سنجیدہ لہجہ میں ان وارڈروں کے سامنے سی آئی ڈی کے بعض افسروں اور ڈی آئی جی کو برا بھلا کہنا شروع کیا ایک دن سحر گل نے سرگوشی کے انداز میں کلبیر سے کہا" کل صبح تک ڈی آئی جی کو قتل ہو جانا چاہیئے بھوشن بہار سے آچکا ہے سرنگ مکمل ہو گئی تو صبح تک ہم بھی نکل جائیں گے ـــــ"

اُسی وقت سی آئی ڈی کو رپورٹ ہو گئی آناً فاناً جیل کا باوا آدم ہی بدلا ہوا تھا۔ کبھی سپرنٹنڈنٹ آرہا ہے کبھی جیلر! وارڈر ادھر اُدھر دوڑتے پھر رہے تھے اور اس کی ٹوہ لگائی جا رہی تھی کہ سرنگ کہاں کھُدی ہے باہر پولیس کھڑی تھی جیلر نے کہلا بھیجا کہ آج رات سب کو بند کیا جائے گا معلوم ہوا کہ دفتر میں سی آئی ڈی کے افسر بیٹھے ہیں کلبیر نے جب دیکھا کہ پریشانی بہت بڑھ گئی تو مسکرایا میجر حبیب اللہ شاہ سخت پریشان تھے اُن سے کہا

"شاہ صاحب آپ مطمئن رہیے کچھ نہیں ہوگا نہ ڈی آئی، جی سی آئی ڈی قتل ہوں گے نہ کوئی بھوشن بہار سے آیا ہے نہ ہم نے سرنگ کھدوائی ہے جو کچھ معلوم کرنا تھا وہ کرلیا ہے اب ان وارڈروں کی ضرورت نہیں رہی انہیں کہیئے کہ واپس چلے جائیں کیا سی آئی ڈی کو آپ پر اعتماد نہیں ہمیں آپ پر اعتماد ہے حکومت نے ہمارے متعلق جو اعتماد آپ پر کیا ہے وہ ہم کبھی ضائع نہ ہونے دیں گے۔"

میجر حبیب اللہ شاہ کو حیرت ہوئی اور تعجب بھی جہاندیدہ انسان تھے۔ زور کا قہقہہ لگایا اور "چہ خوب" کہہ کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے واپس چلے گئے اگلے دن تینوں وارڈر غائب تھے کئی دن تک حبیب اللہ شاہ مذاق کی داد دیتے اور اعتماد کا شکریہ ادا کرتے رہے یہ وہ زمانہ تھا جب جے پرکاش نارائن ہزاری باغ جیل سے بھاگ نکلے تھے اور ان کی گرفتاری کے لیے تمام ہندوستان کی صوبائی اور مرکزی پولیس کو چوکنا کردیا گیا تھا۔ جے پرکاش ان دنوں لاہور میں روپوش تھے اُن کے پیغام آجا رہے تھے پنجاب سے باہر رہتے تو شاید کبھی نہ پکڑے جاتے لیکن پنجاب نے اُن کی گرفتاری کا سہرا اپنے سر باندھا

لاہور کے شاہی قلعہ میں ان کے ساتھ جو سلوک ہوا وہ غایت درجہ ظالمانہ تھا۔ قلعۂ لاہور (LAHORE FORT) کے نام سے انہوں نے ان دنوں کی آپ بیتی لکھی ہے۔ اس کتاب کے مندرجات سے معلوم ہوتا ہے کہ سی۔ آئی۔ ڈی کے اہل کار اپنے خداوندانِ نعمت کے لیے کیا کچھ کرتے رہے اور انکی اطاعت اپنے اُوپر کیوں کر فرض کرلی تھی۔ مجھ سے خود اس زمانے کے ایک انسپکٹر پولیس نے بیان کیا کہ جے پرکاش سے پُوچھ گچھ پر وہ مامور تھا۔ اُسی کے الفاظ میں اس کراڑ کو اُس نے بُری طرح سیدھا کیا۔ سردی کے دنوں میں برف کی سلوں پر لٹایا۔ پٹائی کی۔ اُلٹی ہتھکڑیاں لگائیں۔ کئی رات سونے نہ دیا۔ غرض ذہنی و جسمانی اذیتوں سے الٹ پلٹ کیا۔ مگر وہ دُھن کا پکا تھا۔

کوئی سی بات نہ مانا۔ ——— اس انسپکٹر کو اپنے اس کارنامے پر بے حد فخر تھا۔ اپنی قابلیت کے لیئے اسے سند گردانتا اور ایک کراڑ کی پٹائی کو داخل حسنات سمجھتا تھا۔ ارونا آصف علی "ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک (۱۹۴۲ء) میں انڈر گراؤنڈ چلی گئیں لیکن پنجاب میں بھول کر بھی قدم نہ رکھا۔ غالباً یہی سبب تھا کہ آخر وقت تک نہ پکڑی گئیں۔ آل انڈیا ریڈیو ان کی گرفتاری کے لیئے انعام کا مسلسل اعلان کرتا رہا لیکن وہ آل انڈیا ریڈیو ہی کے ڈائریکٹر جنرل احمد شاہ بخاری (پطرس مرحوم) کے ہاں "نوکرانی" ہو کر ٹکی رہیں۔ پطرس مرحوم اس راز سے واقف تھے بلکہ ان کا منصوبہ تھا۔

سبھاش چندر بوس ہندوستان چھوڑتے وقت لاہور میں ایک رات رہے اور اسی کمرے میں ٹھہرے جہاں آج کل چٹان کا دفتر ہے لیکن کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ اگلی صبح وہ بھیس بدل کر پشاور چلے گئے۔ وہاں سے پٹھانوں کے مخصوص لباس میں کابل چلے گئے۔ اس کے بعد جرمنی کے سفارت خانے کی معرفت برلن پہنچ گئے۔ لاہور میں ان کا قیام کہیں دوچار روز ہوتا یا معتمدوں میں مقامی لوگ شامل ہوتے تو عجب نہ تھا کہ ایک آدھ دن ہی میں پکڑے جاتے اور سی۔ آئی۔ ڈی کے ہتھے چڑھ کر لاہور کے تاریخی قلعے کی سیاحت کرتے۔ جے پرکاش کی طرح بہیمیت کا شکار ہوتے۔ راتوں کی نیندیں چھین لی جاتیں۔ سردیوں میں برف کی سِلوں پر ننگے بدن لٹائے جاتے صبح و شام سی۔ آئی ڈی کے عشوہ گروں کی ادا ہائے محبوبی کا مزہ چکھتے اور نازنینانِ حکومت کو دعائیں دیتے کہ ان کی مٹی کتنی دلفریب واقع ہوئی ہے!

یہ امتیاز اس قلعہ ہی کو حاصل ہے کہ ہر دور میں استعمار دشمنوں اور عوام دوستوں کیلئے اس نے نہ صرف پٹائی اور کٹائی کی ساعتیں مہیا کی ہیں بلکہ پولیس کے جبر و استبداد کو ہمیشہ اپنی سنگی دیواروں کا غلاف چڑھایا ہے۔ اور نہ جانے کتنے نوجوان اس مرگھٹ

پر جل بجھے ہیں!

المختصر پنجاب میں جو آیا پکڑا گیا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا قول تھا کہ اس صوبہ کا ہر پانچواں آدمی سی آئی ڈی کا اہلکار ہے جن نوجوانوں کا پنجاب سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ کبھی یہاں کسی سیاسی واردات کے مرتکب ہوتے تھے انہیں بھی یہاں شکنجہ میں کس کر وساور کو بھیجا جاتا تھا۔۔۔۔

دو نوجوانوں سے دغا

ایک دن ہماری بارک میں اچانک دو نوجوان آ گئے چہرے مہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ قلعہ سے پٹ کر آئے ہیں۔ لازماً ان کے ساتھ وہی سلوک ہوا تھا جو قلعہ کی روایت بن چکا تھا ان کی عمریں بھی کچھ زیادہ نہ تھیں ایک اٹھارہ بیس برس کے پیٹے میں تھا دوسرا اُس سے دو سال بڑا۔ لیکن دونوں تصویر تھے معلوم ہوتا تھا قدرت نے انہیں دلچسپی لے کر بنایا ہے اتنے خوبصورت تھے کہ اودھ کی شام اور بنارس کی صبح میں گندھے ہوتے معلوم ہوتے شاعری کہہ لیجئے لیکن یہ واقعہ ہے کہ دونوں کی آمد سے ساری فضا جگمگا اٹھی اور جب نہا دھو کر اپنے روپ میں آ گئے تو قیاس کیا کہ انہی بچوں کے متعلق علی حزین نے کہا تھا۔۔۔۔ کہ

ہر برہمن پسر لچھمن و رام است اینجا

جگہ کہاں تھی یامین ڈار اٹھا کر انہیں اپنے کمرے میں لے گئے گھنٹہ بھر میں وہ خود ہی ہمارے ساتھ بے تکلف ہو گئے کوئی دو ماہ کے لگ بھگ قلعہ میں رہے تھے۔۔۔۔

"ہندوستان چھوڑ دو" کی تحریک کے دنوں میں ایک فوجی گورے کو الہ آباد میں قتل کیا، کانپور کے قریب ریل کی پٹڑی اکھاڑی اور بھاگ کر پنجاب آ گئے یہاں لاہور میں پکڑے گئے

قلعہ والوں نے اُن کے ساتھ وہی کیا جو اُن کی فطرت بن چکا تھا پہلے زد و کوب کیا پھر اُلٹا لٹکایا
مشکیں باندھیں منہ میں پیشاب ڈالا حتیٰ کہ بدکاری کی' ان نوجوانوں نے جیسا کہ وہ کہہ رہے
تھے ہر بات سے انکار کیا ان کا ایک ہی جواب تھا کہ ہم بے گناہ ہیں ہمارا کسی سیاسی تحریک سے
کوئی تعلق نہیں ہم گھر سے بھاگ کر آئے ہیں آخر جب پولیس انہیں مارتے مارتے تنگ
آگئی تو ایک دن سی آئی ڈی کے انچارج سپرنٹنڈنٹ ان کے پاس گئے پہلے دم دلاسا
دیتے رہے پھر پھسلانے لگے ان نوجوانوں کی روایت کے مطابق سر پہ قرآن اٹھا کر کہا
(ممکن ہے غلاف میں کوئی اور کتاب ہو) "تم میرے بیٹے ہو۔ یقین کرو تمہیں کوئی نقصان نہیں
پہنچے گا ہمارے پاس سرکاری اطلاع ہے کہ تم نے سیاسی واردات کی ہے صرف میری
تسلی کے لیے بتا دو کہ اس میں صداقت کہاں تک ہے؛ وہ اس کی چکنی چپڑی باتوں
اور قرآن شریف پر قسموں کے فریب میں آگئے اور سب کچھ بتا دیا وہ اس روز سن سنا کر
چلا گیا اگلے دن آیا اور کہنے لگا فکر نہ کرو صبح تک چھوٹ جاؤ گے فی الحال جیل چلے جاؤ
کیونکہ رہائی صرف جیل ہی سے ہو سکتی ہے سرکار کو لکھ دیا ہے حکم آتے ہی رہا ہو جاؤ
گے ظاہر ہے کہ دونوں فریب کا شکار ہو گئے تھے لیکن ان بھولے بھالے برہمن نوجوانوں
کو اب بھی اپنے مسلمان باپ پر بھروسہ تھا ان کے ذہن میں یہ بات نقش تھی کہ مسلمان سبھی
کچھ کر سکتا ہے لیکن جھوٹا قرآن کبھی نہیں اُٹھاتا وہ ہفتہ عشرہ میں رہائی کے منتظر تھے ہفتہ
بھی نہ گزرا تھا کہ انہیں رہائی کے نام پر دفتر میں بلا کر بیڑیاں پہنا دی گئیں وہ چیختے رہے
کہ ہمیں رہائی کے لیے بلایا گیا ہے اور ہم سے یہی وعدہ کیا گیا تھا لیکن سنتا کون اور وعدہ
کس کا؛ دونوں یو پی پولیس کے حوالے کر دیئے گئے' تاہم اُن سے جاتی دفعہ یہی کہا گیا کہ
اپنے صوبہ میں رہا ہو جاؤ گے ۔ پنجاب گورنمنٹ انہیں یہاں رکھنا نہیں چاہتی عرصہ تک

پتہ نہ چلا کہ انہیں کہاں پہنچا یا گیا اور ان پر کیا بیتی ہے؟ ایک دن اچانک اُن کا خط ملا ———

"بھائی شورش ——— ! ہم دونوں کل صبح پھانسی کے تختہ پر جا رہے ہیں اس مسلمان باپ کو ہمارا اسلام کہنا جس نے قرآن شریف اُٹھا کر ہند وبیٹوں کو بچانے کا یقین دلایا تھا لیکن ہم اس کی دغا کا شکار ہو گئے مسلمان باپ نے کافر بیٹوں کو دار پر لٹکوا دیا ہے۔"

یہ خط ہمیں اُس دن ملا جب انہیں پھانسی پاتے ہوئے ہفتہ ہو چکا تھا اور اگر ان کی کوئی چیا جلائی گئی تھی تو اس کی آگ ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

اس سپرنٹنڈنٹ کے متعلق کلبیر سنگھ نے بڑے دلوں بعد انکشاف کیا اور ہم سب ششدر رہ گئے کہ سیفی کاشمیری جس مقدمہ میں ماخوذ ہو کر سزایاب ہوا ہے اس کا پلاٹ بھی اس سپرنٹنڈنٹ کے نہاں خانہ دماغ کی اختراع تھا اور مقصود یہ تھا کہ وہ سردار کشن سنگھ (کلبیر سنگھ کے پتاجی) اور بعض دوسرے نوجوانوں کو پھانسنا چاہتا تھا اس کے پیش نظر ملازمت میں توسیع کا سوال تھا اور اسی غرض سے وہ کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑتا ہی رہتا تھا اس مقدمہ کا نام اسمبلی بم کیس تھا الزام یہ تھا کہ سکندر حیات کے قتل کی سازش کی گئی ہے سیفی خود شکار ہوا یا شکار کیا گیا کچھ نہیں کہا جا سکتا ہو سکتا ہے اس کو سپرنٹنڈنٹ کے آلہ کاروں نے فریب دیا ہو اور سازش کسی رخ سے چلتی رہی ہو بہر حال جب سازش پروان نہ چڑھی تو سیفی کو اپنے کئے دھرے کا خمیازہ بھگتنا پڑا دوسرا معاملہ خاکساروں کے سالار تبلیغ پروفیسر عبدالعزیز کا تھا۔

پروفیسر عبدالعزیز

عبدالعزیز تاریخ میں ایم ۔ اے تھا اور غالباً کسی زنانہ کالج میں ہسٹری کا اُستاد، انتہائی نیک، انتہائی شریف، اول و آخر مسلمان، صابر و شاکر، گورا چٹا، چال ڈھال میں عاجزی اللہ پر بے پناہ بھروسہ، اسلام سے انتہائی لگاؤ اس کی صورت سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ دھوکا کھا سکتا ہے دھوکا دے نہیں سکتا۔ اس کی باتیں سیدھی سادھی اور کسی پیچ و خم کے بغیر ہوتی تھیں وہ اس جرم میں دو سال قید کاٹ رہا تھا کہ اُس سے ایک پستول نکلا تھا جو اس سپرنٹنڈنٹ کی روایت کے مطابق سکندر حیات کو قتل کرنے کے لئے اس کے قبضہ میں تھا اور جب اُسکو گرفتار کیا گیا تو وہ سکندر حیات کو قتل کرنے کے لیے ان کے بنگلہ پر جا رہا تھا ——

مَیں نے پروفیسر سے اصلیت پوچھی تو وہ ٹال گیا مَیں نے بھی اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا وہ اخلاقی قیدیوں ہی کے ساتھ بی کلاس میں تھا سید امیر شاہ نے اس کی بے گناہی کا احساس کر کے اُسے کُھلا چھوڑ رکھا تھا مشقت اس کی مسلمان قیدیوں کو قرآن پڑھانا تھی مجھ سے شیخ الہندؒ کی تفسیر لے کر مہینوں پڑھتا رہا پھر ہم اکٹھے پڑھنے لگے ایک دن مَیں نے دوبارہ پوچھا کہ واقعی تم نے سکندر حیات کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا تھا اسکی آنکھوں میں نمی آگئی لیکن اس نمی کو فوراً ہی پی گیا —— مَیں نے بات ہی چھوڑ دی ——

ہماری وارڈ کے پہلو میں "سیاست خانہ" تھا وہاں اگلے وارڈ میں ایک کالا بھجنگ، دیو ہیکل، دراز ریش قیدی رکھا گیا اُس کے بُشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ بدمعاش بھی ہے اور غنڈہ بھی دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا نام عبدالستار ہے دہلی کا رہنے والا ہے اور وہاں سے غنڈہ ایکٹ کے تحت نکالا گیا ہے اب نوٹ بنانے کے جرم میں گرفتار ہو کر حوالات میں

پڑا ہے سپرنٹنڈنٹ نے اس کی مخصوص شہرت کے باعث اسے سیاست خانہ کی بیرونی چکیوں میں ڈال دیا تھا میں عقبی باغیچہ کی سیر سے لوٹتا تو وہ عموماً مجھے سلام کرتا ایک روز مجھے روک کر اپنا دکھڑا بیان کرنے لگا۔" میں نے مسلمانوں کی بڑی خدمت کی ہے خاکساروں کا دہلی میں سالار رہا ہوں۔ فلاں فلاں ہندو کو فلاں فلاں فساد میں فلاں فلاں کے اشارہ پر مروایا۔ شردھانند کے قتل میں میرا ہی ہاتھ تھا دہلی پولیس نے مجھے غنڈا قرار دے کر نکال دیا۔ پنجاب پولیس نے مجھے جعلی نوٹ بنانے کے مقدمہ میں پھانس لیا ہے میں نے جو کچھ کیا خاکساروں کی اعانت کے لیے کیا ہے کسی بھی مسلمان کو میری تکلیف کا احساس نہیں وہ تسبیح ہاتھ میں لیے یہ باتیں کر رہا تھا کہ پروفیسر عبدالعزیز مجھے ڈھونڈتے ڈھانڈتے وہاں آنکلے انہیں دیکھتے ہی عبدالستار کا رنگ فق ہو گیا فوراً ہی ہاتھ باندھ کر کہنے لگا جناب! میرے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے اس نیک سرشت انسان کی بددعا کا نتیجہ ہے میں نے اس کے ساتھ ظلم کیا تھا اب سزا بھگت رہا ہوں۔

میں حیران رہ گیا کہ معاملہ کیا ہے؟ پروفیسر عبدالعزیز بازو سے پکڑ کر مجھے ساتھ لے گیا اور خود ہی مہر سکوت توڑی۔

"آپ بہت دنوں سے پوچھ رہے ہیں کہ میں واقعی سکندر حیات کو قتل کرنا چاہتا تھا تو یہ شخص تمام اصلیت بتا سکتا ہے میں اسی کا شکار ہوں"

پروفیسر کی آنکھوں میں آنسو آگئے پھر قدرے توقف کے بعد کہا۔

"یہ شخص بڑا بیدرد ہے اس نے سی آئی ڈی کے ایک سپرنٹنڈنٹ (وہی سپرنٹنڈنٹ جس کا ذکر پہلے سے ہو رہا ہے) کی خواہش یا ایما پر مجھے جیل میں ڈلوایا ہے جو کچھ ہوا اُس کی توضیح ملازمت اور اس کی مجرمانہ فطرت کے باعث ہوا میرے پاس یہ شخص آیا اور کہنے لگا کہ مجھے دہلی پولیس نے شہر بدر کر دیا ہے جرم میرا یہ ہے کہ میں نے دہلی میں خاکساروں کو منظم کیا تھا

برسوں سالار شہر رہا۔ علامہ مشرقی اپنی گرفتاری سے قبل میرے ہاں ٹھہرے تھے یہاں میرا کوئی پرسان حال نہیں آبدیدہ ہوگیا تو میں نے ترس کھاکر اپنے ہاں ٹھہرالیا ایک دن میرے یہاں پستول رکھ گیا دوسرے دن مجھ سے کہنے لگا لائیے پستول کہاں ہے میں نے پستول حوالہ کیا پھر کہنے لگا آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے ذرا میرے ساتھ چلئے باتوں باتوں میں "گگڑ گرجے" تک لے آیا وہاں پہنچ کر کہنے لگا میں ذرا اسکی اوٹ میں پیشاب کرلوں تم یہ پستول رکھو، دو منٹ گزرے ہوں گے کہ پیچھے سے سپرنٹنڈنٹ نے آلیا تمہارے پاس پستول ہے؟ عبدالستار غائب تھا اخباروں کے مطالعہ اور پولیس کی تفتیش کے دوران پتہ چلا کہ میرے خلاف سکندر حیات کو قتل کرنے کی سازش کا الزام ہے ہفتوں سوچتا رہا الٰہ العالمین کیا معاملہ ہے؟ آخر بات کھل گئی کہ یہ جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے عبدالستار کی مہربانی ہے۔

عبدالستار نے سپرنٹنڈنٹ کے آلہ کار کی حیثیت سے کام کیا اس کا کام دو رُخہ تھا ایک طرف وہ سی آئی ڈی کا مخبر تھا دوسری طرف ان خدمات کی آڑ میں جرائم کرنا اور روپیہ بنانا تھا اب کئی برس سے نوٹ بنانے میں منہمک تھا خاکساروں کی مخبری کے صلہ میں اس کا ہر جرم ڈھکا رہا اور نہ پولیس ہی کی نگاہ اُدھر گئی لیکن اب قدرت اور قانون دونوں کے شکنجہ میں آگیا تھا۔

پروفیسر عبدالعزیز نے اس سالخوردہ شخص کی فطرت کے مختلف گوشے بے نقاب کرتے ہوئے کہا —— میں نے جب سردار دیوان سنگھ سے اس سارے واقعہ کا ذکر کیا تو انہوں نے یہ سارا قصہ "ریاست" میں لکھا اور میری بے گناہی کی نشاندہی کرتے ہوئے حقائق سے پردہ اُٹھایا انہوں نے لکھا کہ عبدالستار دہلی کا پرانا بدمعاش اور غنڈہ ہے اس شخص کا کیرکٹر یہ ہے کہ اس نے پولیس کے ایما پر ہندو مسلم فساد کرایا یا اور حرام راستوں سے پیسہ کمایا ہے دیوان سنگھ نے حکومت

کو چیلنج کیا کہ وہ ریاست کے پیش کردہ ان حقائق کی تردید نہیں کر سکتی — اس کا ایک خاطر خواہ نتیجہ یہ نکلا کہ سپرنٹنڈنٹ مذکور متنبّہ ہو گیا اور آئندہ اس قسم کی سازشوں کے تیار کرنے سے مجتنب رہا تو سیع تو اس کو انگریزوں کی خواہش کے مطابق ملتی رہی لیکن جو کچھ اس کے دل میں تھا وہ نہ ہو سکا۔ سکندر حیات بھی اصل حقیقت سے باخبر ہو گئے۔

میں پروفیسر کو ساتھ لے کر عبدالستار کے پاس گیا تو اُس نے رونا شروع کر دیا دانتوں کی کھڑکیاں کھول دیں۔

"میں تسلیم کرتا ہوں میں نے سپرنٹنڈنٹ سے سازش کر کے انہیں پکڑوایا ہے یہ بے گناہ ہیں اللہ تعالیٰ میرے گناہ معاف کر دیں آپ مجھے ان سے معافی لے دیں یہ ساری کہانی میں نے سپرنٹنڈنٹ ہی کے اشارہ پر تیار کی تھی وہ سرکار سے انعام و اکرام چاہتے تھے میں نے تھوڑی سی رقم پر ضمیر بیچ دیا اب اسکی سزا بھگت رہا ہوں براہ خدا مجھے معاف کر دیجئے۔"

پروفیسر کا دل چشمۂ صافی تھا فوراً معاف کر دیا اور یہ کہہ کر چلے آئے کہ اللہ بھی تمہیں معاف کر دے۔ پروفیسر کی سزا میں دو ایک ماہ باقی تھے سر منوہر لال جیل کا معائنہ کرنے آئے تو قلیل المیعاد قیدیوں کے ساتھ انہیں بھی چھوڑ گئے وہ جانتے تھے کہ پروفیسر بے گناہ ہے —— عبدالعزیز کے بارے میں ہر شخص یہی کہتا تھا کہ بے گناہ ہے اور دو بدبختوں کی سازش کا شکار ہو کر قید ہوا ہے۔

یامین ڈار

سپرنٹنڈنٹ مذکور کا ایک اور واقعہ سُن لیجئے ایک دن اس نے یامین ڈار کو جیلر کے دفتر میں بلا بھیجا۔ یامین اپنے اس نئے ملاقاتی کو پاکر متعجب ہوا خیر تعارف ہو گیا آنجناب پہلے

تو چکنی چپڑی باتیں کرتے رہے پھر ذرا بہلانا پھسلانا شروع کیا مطلب یہ تھا کہ تمہارے گھر والے سخت مالی پریشانی کا شکار ہیں روپیہ کا انتظام بھی ہو جائے گا رہائی بھی ہو سکتی ہے بس ذرا بعض ساتھیوں کی خبریں مطلوب ہیں کہ وہ کیا کر رہے کیا چاہتے اور کیا سوچتے ہیں یامین یہ سنتے ہی آگ بھبھوکا ہو گیا لال پیلا ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا سخت اشتعال کے عالم میں اُس نے کہا۔

"کیا یہ کہہ دینا کافی نہ ہوگا کہ آپ تشریف لے جائیں؛ یہ بات دوبارہ زبان پر لائی تو آپ کی خیر نہیں مَیں آپ کا گلا گھونٹ دوں گا اپنے ساتھیوں کی مخبری کرنا ایسا ہی ہے جیسا مردار بھائی کا گوشت کھانا۔"

یامین کا غصہ تیز ہو گیا واہی تباہی بکتا اندر آگیا لحاف اوڑھا اور سو رہا۔ مَیں نے چوری چھپے یہ جھگڑا خود دیکھا تھا اگلے روز وارڈ میں جیلر آیا تو یامین اُس سے لڑنے لگا کہ ملاقات کرائی کیوں؛

وہ اختلاج کا مریض تھا لیکن آزردہ ہونا اسکی فطرت کے خلاف تھا خود بھی ہنستا دوسروں کو بھی ہنساتا سال بھر میں ایک دن اپنی بیٹی کی برسی پر روزہ رکھتا اور چپ رہتا اپنی اِس بیٹی سے اُسے بلا کا اُنس تھا وہ بھی ایک قابل اور بہادر لڑکی تھی اُس نے لدھیانہ میں پولیس کے قبضہ سے جھنڈا چھینا اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے دفتر کی چھت پر گاڑا تھا ——

یامین کی بیماری لاعلاج ہو گئی تو سی آئی ڈی نے پانچسو روپیہ کے ذاتی مچلکہ پر چھوڑنے کی پیشکش کی شرط یہ تھی کہ جب تک وہ بیمار ہے سیاسیات میں حصّہ نہیں لے گا یامین نے دوٹوک انکار کر دیا وہ دُھن کا پکا قول کا سچّا اور سیرت کا اُجلا انسان تھا اُس کا مکان مدتوں نو آموز انقلابی نوجوانوں کی تربیت گاہ بنا رہا ان سب کے

کھانے پینے کا انتظام کرتا اور اکثر بڑے بڑے انقلابی اُس کے ہاں آتے جاتے تھے۔

فرار کا منصوبہ

اس واقعہ کے فوراً بعد سحر گل اور کلبیر سنگھ نے فیصلہ کیا کہ انہیں جیل سے بھاگ جانا چاہیئے اس فیصلہ میں مجھے بھی شریک کرنا چاہتے تھے میں نے اختلاف کیا بلکہ صاف صاف کہہ دیا کہ اپنے حوصلہ سے زیادہ کے کام میں شامل ہونا میرے لیے مشکل ہے دوم میں خفیہ سیاسی سرگرمیوں کا قائل نہیں سوم مجھے کھُلا سیاسی کام زیادہ شریفانہ معلوم ہوتا ہے چہارم میں عدم تشدّد کا حامی ہوں میں سمجھتا ہوں کہ پولیٹیکل جدوجہد میں طاقتور حکومتوں کے مقابلہ میں اس سے بہتر کوئی ہتھیار نہیں اکوئی سیاسی جماعت ہتھیاروں سے نہیں لڑ سکتی تاآنکہ کوئی بیرونی طاقت اس کی مددگار نہ ہو میرے نزدیک یہ ایک قسم کی غازنگری ہے عدم تشدد صابروں اور عاجزوں کا ہتھیار ہے تشدد میں تباہی کے سوا کچھ نہیں ہمیشہ چھوٹے تشدد کو بڑا تشدد جیتتا ہے تشدد کرنے والا خود بچنا چاہتا اور عموماً بچ جاتا ہے تشدد کی خاصیت یہ ہے کہ اسکی بدولت بے گناہ مارے جاتے اور گنہگار بچ جاتے ہیں۔ تشدد جان و مال دونوں کا دشمن ہے بلکہ عزت و آبرو بھی اس کی چھری سے ذبح ہوتے ہیں —— کلبیر سنگھ اور سحر گل ہمیشہ کوئی نہ کوئی معرکہ رچانے کی فکر میں رہتے میں چونکہ ڈیوڑھی میں آتا جاتا تھا لہذا میری یہ ڈیوٹی لگی کہ سردارا سنگھ دربان سے بات کروں کہ وہ انہیں بھاگ جانے میں مدد دے۔ میں پہلے تو ہچر مچر کرتا رہا آخر میں نے جی کڑا کر کے سردارا سنگھ دربان سے بات کی وہ کلبیر سنگھ کی وجہ سے مان گیا لیکن پھر جانے اُسے کیا خیال آیا کہ منحرف ہو گیا اس نے گریز کیا تو میں بھی طرح

دے گیا ـــــــ کلبیر سنگھ اور سحر گل دونوں بہادر تھے لیکن فرار ہونے کے بعد کچھ کر سکتے مجھے اس میں شبہ تھا بھاگنے کے فوراً ہی بعد وہ پکڑے جاتے نہیں تو کچھ دنوں بعد گرفتار ہو جاتے لیکن تمام جیل پر مصیبت آجاتی ایک طویل جدوجہد کے بعد سیاسی قیدیوں کو اس وقت جو آرام میسّر تھا سلب ہو جاتا منٹگمری جیل سے بدتر حالات پیدا ہوتے پنجاب سی آئی ڈی قیامت برپا کر دیتی بقول چودھری افضل حق پنجاب پولیس ہوا میں جُرم ـــــ سونگھ لیتی ہے۔ سر مائیکل اوڈوائر کو ایک سکھ نوجوان نے اُس زمانے میں لندن جاکر مارا تو پنجاب سی آئی ڈی کے دیوتا کارہائے نمایاں انجام دینے کے لیے وہاں پہنچ گئے ــــ اس نوجوان نے اپنا نام سردار محمد پریم سنگھ لکھوایا اور عدالت میں بیان دیتے ہوئے کہا۔ کہ مَیں نے جلیانوالہ باغ کی بے عزتی کا بدلہ لیا ہے۔

۲۳ مارچ ۱۹۳۲ء کو بھگت سنگھ اور ان کے ساتھی راجگورو اور سکھدیو اسی جیل میں پھانسی دیئے گئے تھے ہم نے اُس دن اپنے وارڈ میں بھگت سنگھ ڈے منایا علی الصبح بہت سے ساتھی کلبیر سنگھ کی معیت میں پھانسی گھر پہنچے تختہ پر پھول چڑھائے فوجی انداز میں سلوٹ کیا اور واپس آ گئے جلسہ کی صدارت پنڈت کشوری لال نے کی جو بھگت سنگھ کے ساتھی تھے تمام دوستوں نے تقریریں کیں آخر میں مولانا ظفر علی خان کی اُن دو نظموں کے چیدہ چیدہ اشعار پڑھے گئے جن میں بھگت سنگھ کی شہادت کو سراہا گیا۔ ایک نظم کا مطلع تھا ؎

شہیدانِ وطن کے خون ناحق کا جو ست نکلے!
تو اُس کے ذرہ ذرہ سے بھگت سنگھ اور دت نکلے

دوسری نظم کے بعض اشعار یہ تھے ؎

توانائوں کے بس میں ہے سرپائے حقارت سے
ہزاروں ناتوانوں کی تمنائوں کو ٹھکرانا
بہادینا کسی کی راکھ کو ستلج کی موجوں میں
کسی کی نعش اٹک کے پار خاک و خوں میں تڑپانا
زوال اس سلطنت کا ٹل نہیں سکتا ہے ٹالے سے
پڑا ہو جس کو آپ اپنی رعایا ہی سے ٹکرانا

الغرض ہم نے یہ دن ایک خاص جوش وخروش سے گذرا اور عہد کیا کہ جب تک ملک آزاد نہیں ہوگا ہم برطانوی سامراج سے اسی طرح لڑتے رہیں گے۔

دو جیلر

عام قیدیوں سے انسانی سلوک کے بارے میں بہت کم غور کیا گیا ہے سیاسی قیدیوں کو جو مراعات حاصل ہوئیں وہ نتیجہ تھیں ملکی جدوجہد کے روز بروز طاقتور ہونے کا، یا پھر بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی بھوک ہڑتال نے سیاسی قیدیوں کو مراعات لے دی تھیں۔ اگرچہ حکام نے ان مراعات کو بھی اپنی منشا کے تابع رکھا لیکن بہیمیت کا جو خوف جیل خانہ میں تھا وہ ان نوجوانوں کی جاں نثاری کے باعث ٹوٹ گیا اخلاقی قیدیوں کے حالات بھی بہتر ہوتے گئے یاد رہے کہ اس سلسلہ میں عام سکھ قیدیوں نے بڑی جرأت اور پامردی کا ثبوت دیا بارہا ڈٹ کر مقابلہ کیا بید کھائے، قواعد توڑے لیکن قیدیوں کی خوراک و پوشاک میں اصلاحیں کراکے ہی دم لیا۔ لاہور سنٹرل جیل کی ہیبت بہت تھی لیکن ظلم نہیں تھا اور یہی فرق اُسے

دوسری جیلوں سے ممتاز کرتا تھا۔

بہر حال ان مراعات اصلاحات یا اقدامات سے پہلے قیدیوں کو کبھی انسان ہی نہیں سمجھا گیا بلکہ ان سے ظالمانہ سلوک ہوتا رہا تھا اب ان کی جان لینا آسان نہیں رہا تھا عام سیاسی بیداری سے پہلے قیدیوں کا مر جانا ایسا ہی تھا جیسے کوئی چوہا یا بلی مرجائے بعض شقی القلب جیلروں کے قصے جیل خانوں میں نوک زباں تھے مثلاً خیر دین داروغہ کو عام قیدی ہری سنگھ نلوہ کہتے اُس نے اخلاقی قیدیوں کے علاوہ سیاسی قیدیوں پر سخت سے سخت مظالم توڑے تھے چودھری افضل حق مرحوم جیل خانوں کی اصلاحاتی کمیٹی کے ممبر تھے بہت سی اصلاحات ان کی وجہ سے نافذ ہوئیں لیکن چودھری خیر الدین نے ان کے خلاف گورنر کو رپورٹ کر کے نکلوا دیا تھا کہ وہ قیدیوں کو قانون شکنی پر اُکساتے ہیں ——— اسی قماش کا ایک جیلر گیان چند پانچسال قید ہو گیا اُس نے اولڈ سنٹرل جیل ملتان میں ایک قیدی کو جان سے مروا دیا تھا۔ میجر حبیب اللہ شاہ اُس زمانے میں وہاں سپرنٹنڈنٹ تھے انہوں نے ہمت کر کے مقدمہ پولیس کے حوالے کر دیا ہائی کورٹ نے پانچ سال قید کر ڈالا وہ بہتر کلاس کے قیدی کی حیثیت سے لاہور منتقل ہو کر آیا تو میجر حبیب اللہ شاہ ہی سپرنٹنڈنٹ تھے اِدھر گیان چند کے زخم خوردہ بیسیوں قیدی لاہور میں پڑے تھے وہ اُس پر آوازے کستے اور گالیاں دیتے اُس نے میجر حبیب اللہ شاہ سے شکایت کی کہ تمام قیدی مجھے آتے جاتے گالیاں دیتے ہیں میری زندگی اجیرن ہو گئی ہے میجر صاحب نے کہا میں کیا کر سکتا ہوں کبھی تم قیدیوں کو گالی دیتے اور پیٹتے تھے اب خود دکھا رہے ہو یہ دار المکافات ہے جو بویا ہے کاٹو گیان چند اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ ایک دن بعض قیدیوں نے اس پر ہلہ بول دیا اور اکٹھے ہو کر خوب پیٹا سپرنٹنڈنٹ نے بی کلاس بارک سے اُٹھا کر چکیوں میں بھیج دیا۔ قید تنہائی اس کے لئے اور بھی عذاب ہو گئی ——— سپرنٹنڈنٹ سے کہا مجھے یہاں سردی لگتی ہے

ایک کمبل اُور دیجیے۔ میجر حبیب اللہ شاہ نے جواب دیا جتنے کمبل ایک قیدی کو ملنے چاہئیں وہ تمہارے پاس ہیں گیان چند اپنا سا مُنہ لیکر رہ گیا دن بھر کمبل میں منہ لپیٹے پڑا رہتا جب عبرت کا ورق ہو گیا تو قیدیوں ہی نے اس پر رحم کیا یعنی طعن و دشنام سے ہاتھ اُٹھا لیا پولیس اور جیل والوں کے خلاف قیدیوں میں انتقام کا جذبہ قوی اور قدرتی ہوتا ہے۔ اِس قبیلہ میں سے کوئی ظالم پکڑا جائے تو قیدی اُس سے بہت بُرا سلوک کرتے ہیں انہی دنوں ایک ہندو نوجوان سب انسپکٹر کسی زیر تفتیش قیدی کو جان سے مار دینے کے جرم میں قید ہو کر آگیا اس کا بھائی لاہور میں پراسیکیوٹنگ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تھا قیدیوں نے گھیر لیا ایک نے گلے سے پکڑا، دوسرے نے بازو دبائے، تیسرے نے طمانچے مارے، چوتھے نے پیچھے سے ٹھڈا مار کر زمین پر گرا دیا اور منہ پر پیشاب کی دھار چھوڑ کر اپنی بارکوں میں بھاگ گئے میجر حبیب اللہ شاہ سے شکایت ہوئی تو انہوں نے ہنسی میں ٹال دیا اس کی اکڑ کا یہ حال تھا کہ اپیل میں اس کی ضمانت ہو گئی تو رعونت سے دائیں بائیں گھورتا چلا جا رہا تھا قیدیوں نے آوازیں دیں۔

"رسی جل گئی بل باقی ہیں؟ ابھی تک اکڑ نہیں گئی ہے؟ یاد رکھ پھر پٹیں گے" لیکن وہ خود کو اب بھی تھانیدار ہی سمجھ رہا تھا بے تحاشا بکنے لگا قیدی بھی جوش میں آ گئے انہوں نے یکجا ہو کر وہ مغلظات بکیں کہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا نکل گیا۔

مرافعہ خارج ہو گیا لیکن وہ سنٹرل جیل واپس نہ آیا اُس نے استدعا کی تھی کہ اُسے جان کا خطرہ ہے کہیں اور بھیج دیا جائے اور یہ رعایت اُسے مل گئی۔

پولیس کے مخبر

پولیس کے مخبروں کا انجام اکثر عبرت آموز ہوتا ہے جو لوگ زندگی بھر اُن کے مخبر

رہے یا مددگار کام نکل جانے کے بعد پولیس نے اُن سے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں اور جب کوئی ان کا مخبر یا مددگار بوڑھا ہو گیا تو پھر اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو ایک بے سہارا لاش سے گورکن کرتے ہیں جو لوگ عام کارکنوں میں مخبر ہوتے انہیں ایک کنسٹیبل کی تنخواہ کے برابر برابر ماہانہ ملتا تھا اور جو اعزازی مخبر یا مددگار ہوتے وہ ایس پی کے سرٹیفکیٹ پر خوش ہو جاتے بلکہ اُن کے لئے کوتوال شہر کا مصافحہ ہی کافی وشافی ہوتا پولیس نے ان مخبروں کی کبھی عزت نہیں کی ایک پولیس افسر نے بتایا کہ وہ ان مخبروں سے کام ضرور لیتے ہیں لیکن ان کی عزت نہیں کرتے اُن کا معاملہ ایسا ہی ہے جیسا کوئی بے غیرت اپنی ہمشیرہ کو شب باشی کے لیے فروخت کرتا ہو۔

ہدایت شاہ جس نے میرے خلاف لاہور کے ایک مقدمہ میں گورج گرج کے شہادت دی تھی اس بُری طرح خوار ہوا اور اس ذلت کے ساتھ مرا کہ عبرت تکتے رہ گئے لوگوں نے کفن کے لیے چندہ کیا پولیس نے ایک کوڑی تک نہ دی حالانکہ وہ ایک مکمل مخبر اور مددگار رہ چکا تھا جن لوگوں نے اس فن شریفہ سے وابستہ ہو کر پرواز کی وہ بالا بلند ہو کر غضب کا شکار ہو گئے اس سلسلہ کے لوگ ہمیشہ نامرادی کا شکار ہوئے بہت سوں کو پولیس کے ہاتھوں پٹتے دیکھا پیسہ اخبار میں محمد شفیع نام کا ایک بدخصلت نوجوان ہوٹل کرتا تھا اس کی عادتیں اتنی گندی تھیں کہ اُس کے پاس بیٹھتے اور اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے عار آتی تھی چونکہ پولیس کا مددگار تھا اس لئے جس شریف کی عزت چاہتا ٹھوکروں میں اُڑاتا۔

جانے ایک دن کیا صورتحال پیش آئی کہ پیسہ اخبار کے تھانیدار نے اُسے اُلٹا لٹا کر ننگے چوتڑوں پر اتنے جوتے لگوائے کہ سارا علاقہ خبردار ہو گیا آخر اس مار ہی کی شدت سے رحلت کر گیا۔

لاہور کے ایک شاہ صاحب میرے پاس تشریف لائے اب بوڑھے ٹھنڈ ہو چکے ہیں جوان تھے تو پولیس کے مددگار تھے اپنی بپتا بیان کرتے ہوئے انہوں نے کوئی سو کے لگ بھگ سرٹیفکیٹ دکھائے جو حسن خدمات کے صلے میں انہیں پولیس سے ملے تھے ان کی اپنی روایت کے مطابق ایک سرٹیفکیٹ انہیں میرے متعلق اطلاعات بہم پہنچانے پر ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے دیا تھا اُس میں ایک گراں قدر رقم کا انعام بھی درج تھا اور وہ گراں قدر رقم تھی صرف پانچ روپیہ ـــــ کُل پانچ روپیہ[1]

ایک اور مددگار مخبر کا انجام میرے سامنے ہے یہ شخص اب بھی زندہ ہے لیکن اُس نے مخبری کے ساتھ دلّالی بھی کی ایک عجمی ذوق کے کوتوال کو لڑکے مہیّا کرتا رہا اپنی بیوی کو اس عُذر پر پٹرول ڈال کر جلا دیا کہ اُس نیک بخت نے کوتوال شہر کے بستر کی رونق بننے سے انکار کر دیا تھا۔

چار دیواری سے باہر

آیئے کچھ دیر سیاسی چوپال سے نکلیں۔ کوئے جاناں میں چلیں اور سوچیں ــــــ کس حال میں ہیں یارانِ وطن ؟ جن بیٹوں کو ہم بچّہ چھوڑ آئے تھے وہ اب قد آور ہو گئے تھے جن بیٹیوں کا بیاہ نہیں ہوا تھا وہ اپنے گھروں میں آباد ہو چکی تھیں اور بعض کئی کئی بچوں کی ماں تھیں کھُلی فضا کے تصوّر سے کبھی کبھار دل میں ہوک سی اُٹھتی اکثر چہرے نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتے ایک دن

---

[1] اس کا تصویری عکس اس کتاب میں دیا جا رہا ہے۔

سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا۔

"کے سال سے باہر نہیں گئے ہو؟"

"یہ چوتھا سال ہے۔"

"تو پھر باہر کی سیر کا انتظام ہونا چاہیئے؟"

"جو آپ کی مرضی ہو"

"منہ کھولو؟ تو ہاں! تمہارے دانت خراب ہیں اور نزلہ بھی رہتا ہے میں آج ہی حکومت کو لکھتا ہوں اسں بہانہ سیر ہو جائے گی"۔

——— کوئی ہفتہ عشرہ بعد دانتوں کے لیے ڈنٹیل ہسپتال اور نزلہ کے لیے میو ہسپتال کی اجازت آگئی۔ ڈنٹیل ہسپتال سنٹرل جیل کے دوسرے سرے پر واقع ہے شاہی مسجد کے پاس بڈھے دریا سے قریب! میو ہسپتال شہر کے وسط میں ہے تقریباً پندرہ دفعہ ڈنٹیل ہسپتال جانا پڑا دانت صاف کرائے کھوڑوں میں چاندی بھروائی میو ہسپتال میں ڈاکٹر بشیر کے زیر علاج رہا انہوں نے ناک میں فصد لگایا نتیجۃً گندہ خون اور پیپ بہہ گئی یہ تھا علاج یا لاہور کی سیر و سیاحت کا ایک ذریعہ۔ گو سی آئی ڈی کا ملازم سایہ کی طرح ساتھ رہا لیکن یہ موقع ضرور ملا کہ لاہور کے گمشدہ راستے اور ادجھل گلیاں ایک دفعہ پھر نظروں کے سامنے آگئیں معلوم ہوتا تھا گویا صدیوں کے بعد لاہور کے کوچہ و بازار اور در و دیوار سے معانقہ ہو رہا ہے۔

نقشہائے رنگارنگ

بازاروں کا رنگ روپ ہی بدلا ہوا تھا ہر طرف دولت کی ریل پیل تھی جنگ نے شہر کے حسن کی نقابیں اُلٹ دی تھیں۔ چار سال میں جس چیز نے سب سے زیادہ ترقی کی وہ ترک پردہ

تھا دوشیزائیں ہرنیوں کی طرح اُڑی پھرتی تھیں انہیں دیکھ کر یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ جیسے دودھ شہد اور مکھن کا یہ آمیختہ امیر خسرو کی کہہ مکرنیاں ہیں۔ لارنس باغ سے گزرتا تو کتنی ہی صبحیں کتنی ہی شامیں اور کتنی ہی راتیں یاد آجاتیں کیا دن تھے ہم لوگ سیاسی وشت ہی سے ناواقف تھے اپنے دن، اپنی راتیں، اب ان کہانیوں کو حوالہ قلم کرتے ہوئے بھی حجاب آتا ہے۔ حجاب اس لیے کہ بڑے انسانوں کی کمزوریاں اُن کا آرٹ ہوتی ہیں اور غلطیاں تجربہ، چھوٹے انسانوں کی کمزوریاں ان کے خلاف فردِ جرم بنتی ہیں اور غلطیاں رسوائی کے چھینٹے۔ اردو کے نامور ادیب رشید احمد صدیقی نے اپنی کسی تحریر میں لکھا ہے "کمزوروں کو اپنی کمزوریوں کا انکشاف نہ کرنا چاہیے کیونکہ وہ پولیس کی دست اندازی اور ملاؤں کی زبان درازی سے بچ نہیں سکتی ہیں۔" سیاست میں کیوں کر قدم رکھا؛ اس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے جس طرح شاخ سے کوئی کونپل ٹوٹ جائے بس اسی طرح مجھے ادبیات سے سیاسی صحرا میں آنا پڑا۔ طبعاً میں ایک رومانی شاعر تھا مجھے ادبیات میں انہماک کا موقع نہیں ملا ورنہ اس وادی میں ریاض کرتا تو لازماً قدرت میرے قلم کو بہت سی ادائیں بخشتی۔ میں سمجھتا ہوں اور یہ کسی اَنا کا حصہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک بڑا ذہنی سرمایہ بخشا ہے۔ یار لوگ کوچہ جاناں کی طرف نکل گئے اور میں سیاسی بیابان میں چلا آیا۔ کوچہ جاناں میں رہتا تو ادب میرا راہوار ہوتا شاعری مرکب حسن و عشق کے معاملات جس طرح چاہتا اُچھالتا۔ لاہور میرا ادبی گھر تھا۔ راوی کی سیریں میرے دل پر آج تک نقش ہیں بہت سے لوگ راوی کو اِس لیے یاد کرتے ہیں کہ اس کے دامن میں آل انڈیا کانگرس نے پہلی دفعہ مکمل آزادی کا ریزولیوشن پاس کیا تھا اور تمام ہندوستان کی سیاسی روح اس کے ذخیروں میں کھچ آئی تھی یا پھر ہمارے انقلابی نوجوان اس کے ڈھکے چھپے کناروں پر بم بنانے کے تجربے کرتے رہے میرے لیے

راوی بیں کشش کے اور پہلو بھی تھے انہیں بے نقاب کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اختر شیرانی نے کیا عمدہ بات کہی ہے کہ —— ع

عشق اور اس کے مظاہر کی کہانی یہ ہے —— شاعروں کو نہ سنائی جائے

اب تو راوی بوڑھا ہو گیا ہے اور یہ احساس خاصا پریشان کن ہے کہ اس کی رگوں میں جوانی نہیں رہی اس کے شاداب کناروں کی رونق مر چکی ہے اس کی موجیں جس خرام کی عادی تھیں وہ خرام ہی نہیں رہا۔ آہو چوکڑی بھول گئے ہیں کامران کی بارہ دری منجدھار میں آکر کھنڈر ہو گئی ہے بائیں رخ پر ایک سبزہ لالاؤں کی چوپال تھا لیکن نہ جانے کہاں ڈوب گیا کشتیوں میں وہ حسن نہیں رہا اب نہ کوئی کنتیا کسی سے پریم کی ڈوری باندھتی ہے نہ کسی دوشیزہ کو پیمانِ شوق کا احساس ہوتا ہے —— "یارانِ سرِپل" کی ترکیب اردو میں ابھی تک مستعمل ہے حالانکہ اس کو اب تک متروک ہو جانا چاہیئے تھا۔ نہ پل رہا نہ یار رہے۔ رہے نام اللہ کا ؎

سنبھلنے دے مجھے اے نومیدی کیا قیامت ہے

کہ دامانِ خیالِ یار چھوٹا جائے ہے مجھ سے

مَیں نے برسوں راوی کی سیر کی ہے اکیلے بھی اور دوستوں کے ساتھ بھی۔ جوانی الھڑ ہوتی ہے انسان اس میں سبھی کچھ کر گزرتا ہے ہم نے کوچۂ معصیت میں تو قدم نہ رکھا بلکہ اللہ کا احسان ہی رہا لیکن اس کے علاوہ جوانی میں جو کچھ ہوتا ہے کر گذرے جوانی کے دن بھی کہاں تھے، لڑکپن تھا جوانی سے ہمقدم یا متعاقب —— لارنس باغ ہماری آوارہ گردیوں کا دوسرا مرکز تھا بہت سی چاندنی راتیں اس کی آغوش میں گزریں ہمیشہ اِس کی شاخیں پکارتی رہیں اس کی مصنوعی پہاڑیوں کے پیچ و خم اشارے کرتے رہے اس

کی پگڈنڈیاں اُن گئے دنوں کی یاد دلاتی تھیں جب عنبریں گیسوؤں کے سائے ان پر مہربان تھے جب زلفوں کے خم کھول کر ہم غزل کو ساز دیا کرتے تھے انہی شاخوں کے سائے میں مطلعے اور مقطعے موزوں ہوتے تھے۔

غرض لارنس کی تمام رونقیں اُن خوبصورت یادوں کا عکس تھیں جن یادوں کی فصلیں اس کی روشوں پر سرسبز ہوئی تھیں کتنی ہی مسکراہٹیں ان شاخوں میں جذب ہیں اور کتنے ہی قہقہے درختوں کی اس قدآوری پر طعن کرتے ہوئے نکل چکے ہیں لارنس گارڈن جو اب باغ جناح ہو چکا ہے مشرف بہ اسلام ہونے سے پہلے راجکماریوں کا گہوارہ تھا وجدان آج بھی محسوس کرتا ہے کہ یہ دلکشا باغ دلفریب صبحوں سہانی شاموں اور چاندنی راتوں کے خمیر سے تیار ہوا اور ہر لحظہ تر و تازہ ہے ——— منٹگمری ہال اس کے چمپئی رخساروں پر ایک سنگین طمانچہ ہے۔ ہمارے سفید فام حکمرانوں اور اُن کے سیاہ فام گماشتوں نے اپنی شبینہ خلوتوں کے لیے اسے تعمیر کیا تھا وہ ہر رات اس کے شرابی ماحول میں قہقہوں کے غبارے چھوڑا کرتے تھے ——— بریڈلا ہال مٹ گیا لیکن یہ حال زندہ ہے۔ اُس ہال کے وارث نہیں رہے اس حال کے وارث باقی ہیں ——— یہ ہال گناہ کی افسرانہ تمکنت کا اظہار ہے۔

ایک دن میو ہسپتال سے نکلتے ہوئے مَیں نے پولیس گارد کے انچارج سے کہا ——— ذرا انارکلی بازار سے ہوتے چلو وہ راضی ہو گیا لیکن سی آئی ڈی کے حملہ ترکانہ سے ڈرتا رہا انارکلی کو مَیں اس طرح تک رہا تھا جیسے کوئی جاں بلب دم واپسیں در و دیوار پر ٹکر ٹکر نگاہ ڈالتا ہو ہمیشہ کی طرح انارکلی میں خاصی رونق تھی اور یہ رونق انارکلی کا طغرائے امتیاز ہے اس روز کچھ اس لیے بھی رونق تھی کہ انتیسواں روزہ تھا اور اگلی صبح عید ہو جانے

کا امکان تھا۔ میں دن ہی میں ہلال دیکھتا چلا جا رہا تھا میرے سامنے سے بیسیوں ہلال نکل گئے ——— ع

اب چاہے چاند ہو کہ نہ ہو عید ہو گئی

ادھر ادھر عیدیں اُڑی پھر رہی تھیں معاً میرا دل ایک آزردہ سوچ میں ڈوب گیا لوگ اپنے لیے عید کا سامان خرید رہے تھے اور میں اُن گلابی چہروں کی ایک مسکراہٹ بھی ساتھ نہ لے جا سکتا تھا جو یمین و یسار سے نکلتے جا رہے تھے یہ مسکراہٹیں ان سیاہ پھاٹکوں کی متحمل ہی نہ ہو سکتی تھیں جو سالہا سال سے ہماری اسیری کا سرنامہ ہو چکے تھے کچھ ثانیوں کے لیے میں کھو سا گیا ——— سال میں دو عیدیں ہوتی ہیں۔ ۳۵ء سے لیکر ۴۵ء تک گیارہ برس میں ۲۲ عیدیں جیل ہی میں آئی تھیں۔ مجھے عیدین کا احساس ضرور تھا لیکن یہ احساس بس اُسی طرح کا احساس تھا جس طرح پہلو سے دل اُڑ جائے تو کسک رہ جاتی ہے پھر وہی کسک شاعر کے تخیل میں سما کر غزل ہو جاتی ہے۔

دانت بنوانے کا بہانہ مفید رہا جن راستوں کو بھول چکا تھا وہ سامنے آ گئے لوہاری دروازہ سے لے کر موری دروازے تک ہیئت ہی بدلی ہوئی تھی۔ موری دروازہ کی میونسپل لائبریری کا حلقہ یاراں اُجڑ چکا تھا لاہوری دروازے سے لے کر بھاٹی دروازے تک کا باغ ویران تھا۔ کندن شاہ کا مزار سالخوردہ بزرگوں کی مختلف منڈلیوں کا مرجع تھا لیکن اب وہاں سناٹا تھا ادھر سامنے باغ میں کانگرس کے بڑے بڑے جلسے ہوتے اور بڑے بڑے لیڈر خطاب کرتے تھے اُدھر عقب میں چرسی بھنگی اور افیونی جمع ہوتے تھے جنہیں سلفہ کا کش بھنگ کا کاسہ اور افیون کی چسکی دنیا و مافیہا سے غافل رکھتی بائیں طرف مسجد کی سمت کھاتے پیتے گھرانوں کے ادھیڑ عمر اکٹھے ہوتے جہاں نصف دن "طلسم ہوشربا"

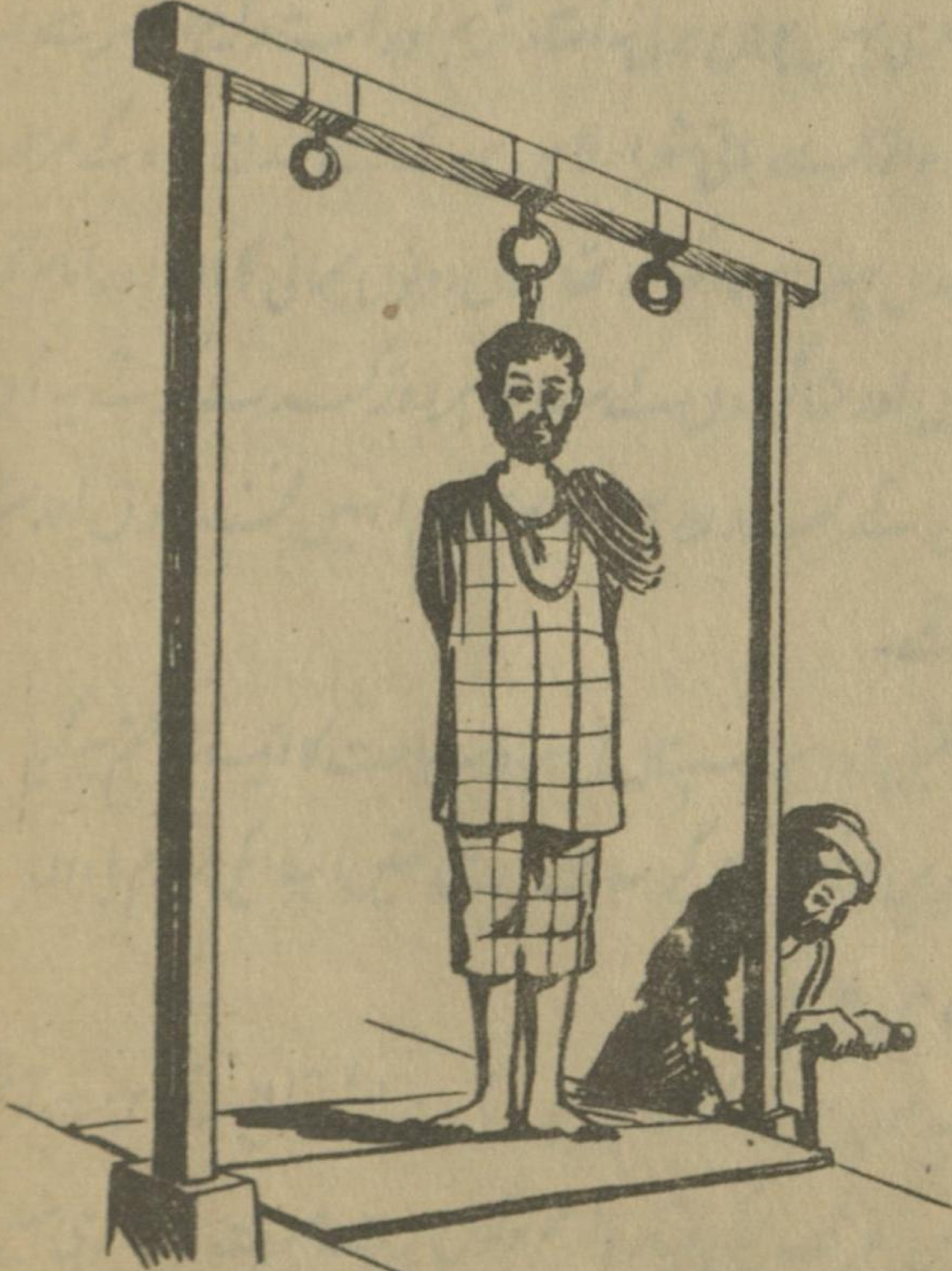
اور نصف دن ہیر وارث شاہ سُنی اور پڑھی جاتی تھی۔ اس مجلس کا خاصہ یہ تھا کہ اس میں طرح طرح کے حقّے گردش کرتے کبھی کبھار ہم بھی کھڑے ہی کھڑے اس مجلس کو سُن آتے تھے۔ کندن شاہ کے مزار سے لے کر نگار سینما تک ایک بڑا ہی خوبصورت باغ تھا جہاں گرمیوں کے دنوں میں مسلمان طلبہ امتحان کی تیاری کرتے غرض بھاٹی دروازے سے ٹکسالی تک پہلو دار یادوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا۔

پنجابی کے مشہور شاعر اُستاد ہمدم، اُستاد عشق لہر، اُستاد شرم، اُستاد شرف، اُستاد کرم، اور ڈاکٹر فقیر محمد انہی باغوں میں مشاعرے رچاتے۔ کبھی یکجا کبھی علیحدہ، اُن لوگوں کی شاعری یہیں جوان ہوئی۔ اُستاد شرم اور اُستاد کرم امرتسر سے آتے ڈاکٹر فقیر محمد فقیر گوجرانوالہ سے باقی شعراء لاہور ہی کے تھے کندن شاہ کے مزار سے ملحق رستم زماں گاماں پہلوان کا اکھاڑہ تھا جہاں دونوں بھائی گاماں اور امام بخش اپنے بیٹوں بھتیجوں اور شاگردوں کے ساتھ ہر روز کسرت کرتے یہ اُن کی جوانی اور ناموری کے عروج کا زمانہ تھا ہم انہیں فخر شوق اور مسّرت سے دیکھا کرتے تھے۔

ڈنٹیل اور میو ہسپتال کی سیر و سیاحت کا ایک ماہ ختم ہو گیا
تو یہ تصویریں جو اُبھر اُبھر کر سامنے آ رہی تھیں ایکا ایکی مرحوم یادوں
کی خوابگاہ میں چلی گئیں۔

انسان مجرموں میں رہ کر خود مجرم ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس سے تو محفوظ رکھا لیکن یہ احساس آخر تک چٹکی لیتا رہا کہ ہم لوگوں پر جیسے مسرت کا دور ہی نہیں آیا لڑکپن اسکول میں گذرا ذرا جوان ہوئے جوان بھی کہاں؛ بس جوانی کی سرحد کو تاکتے

شروع کیا تھا کہ جیل کا پھاٹک کھُل گیا تقریباً ساڑھے دس سال اس فرات کا پانی پیتے رہے نتیجتہً لڑکپن نے اپنی عنان بڑھاپے کو سونپ دی۔ جوانی بیچ میں سے اس طرح چھُٹ گئی جس طرح کوئی نازنین پہلو چھڑا کر نکل جائے اور آتشکدۂ خیال میں حسرتوں کی چنگاریاں رہ جائیں۔



لدھارام سرکاری رپورٹر

یہ ذکر آچکا ہے کہ جنگ عظیم چھڑنے سے چند روز پہلے سکندر وزارت نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو زیر دفعہ ۱۲۱۔الف و ۱۲۴۔الف و ۱۵۳۔الف اور ۳۰۲/ ۱۱۷ (تعزیرات ہند) گرفتار کر لیا دفعات بڑی سنگین تھیں ان میں سزائے موت بھی ہو سکتی تھی اور کم سے کم عمر قید' اس مقدمہ کا بنیادی گواہ لدھارام پولیس رپورٹر تھا۔ شاہ جی عدالت میں پیش ہوئے تو لدھارام گواہی سے منحرف ہو گیا اُس نے کہا میرے سامنے ایک ایسا شخص کھڑا ہے جس کو اس حالت میں دیکھ کر —— میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے کہ میں اس کے خلاف جھوٹی شہادت دوں۔ میں نے جو تقریریں قلمبند کی ہیں وہ حکومت کے ایما پر تیار کی ہیں مجھے اجازت دی جائے کہ اصل حقیقت کا انکشاف کروں —— اس بیان نے تحیر پیدا کر دیا۔ تمام صوبہ میں کھلبلی مچ گئی وزارت کے لیے اخلاقی طور پر کوئی ٹھکانہ نہ رہا —— مقدمہ لاہور ہائیکورٹ

میں منتقل ہو گیا سر ڈگلس ینگ چیف جج نے خود سماعت کی بنچ میں اس کے ساتھ جسٹس دیوان رام لال بیٹھے تھے شاہ صاحب کی طرف سے میاں عبدالعزیز بار ایٹ لا اور دیوان چمن لال پیش ہوئے میاں صاحب نے لدھا رام کی شہادت کو اس طریق سے قلمبند کرایا کہ سکندر وزارت کے لیے "جائے رفتن نہ پائے ماندن" کا معاملہ ہو گیا لدھا رام کا بیان تھا کہ شاہ صاحب کو پھانسنے کے لیے گجرات کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے وزارت کے ایما پر اُسے یہ ہدایات جاری کی تھیں کہ شاہ صاحب کی تقریر میں اس قسم کے کلمات شامل کر دیئے جائیں جو ان دفعات کی زد میں آتے ہوں وزارت کے معتمد راویوں کا بیان تھا کہ لدھا رام کو آلۂ کار بنا کر سپرنٹنڈنٹ پولیس نے بلیک میل کیا ہے اس کے خلاف رشوت ستانی کے بعض مقدمات زیر تفتیش تھے اور اسے معطل کیا جا چکا تھا۔ جب دیکھا چھٹکارا محال ہو گیا اور گلو خلاصی ناممکن ہو گئی ہے تو اس نے بہ لطائف الحیل لدھا رام کو ساتھ ملا کر یہ کھڑاگ رچایا ہے۔ ایک دوسری روایت یہ تھی کہ سپرنٹنڈنٹ نے وزیر اعظم کی مبینہ چٹھی اپنے قبضہ میں لیکر لدھا رام کو میدان میں لا کھڑا کیا ممکن تھا لدھا رام راضی نہ ہوتا لیکن سپرنٹنڈنٹ نے جب اُس سے کہا کہ رشوت کے ان مقدمات میں وہ بھی ماخوذ ہو رہا ہے تو اس کارنامہ کو انجام دینے کے لیے تیار ہو گیا نتیجہ یہ نکلا کہ برآر (سپرنٹنڈنٹ پولیس) حکومت سے معاملہ کر کے بچ رہا لدھا رام پھنس گیا اُس کو انحراف شہادت کے جرم میں تین سال قید سخت کی سزا ہو گئی اور شاہ صاحب بے گناہی کے باعث رہا کر دیئے گئے۔ لدھا رام مختلف جیلوں سے پھرتا پھراتا لاہور آگیا تو سید امیر شاہ نے شاہ صاحب کے صدقہ میں اس کی مشقت جیل پریس میں لگا دی جو کسی اخلاقی قیدی کے لیے سب سے بڑا آرام تھا۔

میں نے لدھا رام کو پہلی دفعہ یہیں دیکھا اور یہیں ملاوہ پہلے احاطہ کی دوسری یا

تیسری بارک میں رہتا تھا گرمجوشی سے بغل گیر ہوا لیکن بہت جلد اس کی حقیقت کھلنے لگی

اس میں برطانوی عہد کے ایک روائتی کانسٹیبل کی تمام خصوصتیں موجود تھیں چالاک،

عیار، خائن، بدمعاش، جھوٹا اور بے اعتبار،

سب کو یقین دلا رکھا تھا کہ اُنہی کا ہم خیال ہے۔ ہمیشہ ڈون کی لیتا اور گپ مارنے میں آندھی

تھا۔ شاہ جیؒ کا نام۔ بیچ کر پیسے کھرے کرنا اور ٹکے کمانا اُس کا شعار ہو چکا تھا۔ سیّد امیر شاہ

رجیلیہ، اس کے ہر عیب سے چشم پوشی کرتے۔ بلکہ شاہ جیؒ کی وجہ سے اتنی مراعات دے رکھی

تھیں کہ قیدی ہو کر بھی آزاد تھا۔ لیکن اس آزادی کو نہ صرف وہ اپنا حق سمجھتا بلکہ کھلے بندوں

اُڑا پھرتا اور اٹھکھیلیاں کرتا تھا۔

بعض ساتھیوں نے اُس کے عادات سے مجھے شروع ہی میں آگاہ کیا اور بتا دیا تھا کہ وہ

ابھی تک کنسٹیبل ہی ہے۔ اس کی عادتیں پختہ ہو کر اس کی فطرت بن گئی تھیں۔ سچ بولنے سے

طبعاً محروم لیکن جھوٹ بولنا اُس کا روزمرّہ ہو چکا تھا —— یہ باتیں سُنیں تو مجھے تعجب ہوا

بلکہ افسوس کہ ایسا شخص جو اتنا نام پیدا کر چکا ہے اور جس نے اپنے آپ کو ایک دُرویش پر قربان

کر دیا ہے، یہاں تک گرا ہوا ہے کہ اُسے مطلقاً احساس ہی نہیں کہ وہ کہاں سے کہاں پہنچا اور اب کس مقام

سے گر رہا ہے! یہ تمام باتیں افسوسناک ہی نہیں، دردناک تھیں۔ اور کوئی سا شخص جس

کے سامنے شاہ جیؒ کے مقدمے میں اس کا "حوصلہ وایثار" تھا" یہ باور نہیں کر سکتا تھا کہ

عناصر اربعہ کے اس پیکر میں ایک ایسا شخص بس رہا ہے! ان روایتوں اور حکایتوں

کو تجربہ و مشاہدہ کی ترازو میں تولا تو ٹھیک ٹھیک اس کا وزن وہی نکلا جو دوست

بیان کرتے تو یقین نہ آتا تھا۔ حیرت ہوتی کہ آدمی اس حد تک ساقط الاخلاق اور

ساقط الاعتبار ہو سکتا ہے!

لیکن لدھا رام یہاں بھی اُڑتی چڑیا کے پر گنتا۔ ہتھیلی پر سرسوں جماتا۔ آسمان میں تھگلی لگاتا اور ہوا کو مٹھی میں تھامتا اس کا ایک ہی شغل تھا کہ ٹھگی کرے، چغلی کھائے۔ اِدھر لگائے، اُدھر بجھائے۔ اُس کی ان حرکتوں سے تقریباً تمام دوست اور ساتھی بیزار تھے ایک روز ـــ اُس نے مجھ سے شکایت کی کہ ڈاکٹر گوپی چند بھارگو چودھری کرشن گوپال دت اور ان کے ساتھی اس سے نفرت کرتے ہیں سبب یہ بتایا کہ ڈاکٹر گوپی چند بھارگو اور چودھری کرشن گوپال دت اثنائے مقدمہ میں اُس کے پاس آئے تھے کہنے لگے ایک مسلمان کے لیے اپنی زندگی برباد نہ کرو میں نے انکار کیا تب سے مخالف ہو گئے ہیں میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا تو انہوں نے کہا یہ شخص جھوٹا ہے۔ میں اس سے کبھی نہیں ملا اُس نے جو کام کیا ہے وہ سید عطاء اللہ شاہ کو بچانے کے لیے نہیں بلکہ اپنی اور سپرنٹنڈنٹ کی حفاظت کے لئے کیا ہے چودھری کرشن گوپال دت سے چوں کہ میں نے بولنا بند کر رکھا تھا لہٰذا اُن سے دریافت تو نہ کیا لیکن مجھے یقین تھا کہ ان کے بارے میں بھی اُس نے جھوٹ بولا ہے شاہ صاحب نے لدھا رام کی بے حد مدد کی اپنے مریدوں اور معتقدوں سے اتنا روپیہ دلوایا کہ عمر بھر کے لیے کافی تھا لیکن اس کو اُس نے ایک کاروبار بنا لیا سارا روپیہ لہو ولعب میں لٹاتا رہا وہ عیبوں کا مرقع تھا جب اس نے لوگوں کو خود ٹھگنا شروع کیا تو شاہ جی نے ہاتھ اُٹھا لیا آخر کار وہ ایک ٹھگ ہو گیا اُسے یاد نہ رہا کہ وہ کس بلندی پر پہنچا تھا اور اب کس تیزی سے گر رہا ہے۔

دہلی کے مسلمانوں نے ہاتھی پر اُس کا جلوس نکالا ہزاروں روپے اکٹھا کر کے دیئے لیکن وہ ہر چیز بھول گیا اس کی ٹھگی کا یہ حال تھا کہ عادی مجرم ہو گیا۔ عام رضاکاروں سے آٹھ آٹھ آنے لے جاتا ایک دن مولانا مظہر علی اظہر سے ان کی لوئی مانگ کر لے گیا اُن

سے کہا میری اہلیہ بیمار ہے مجھے گاؤں جانا ہے میرے پاس گرم کپڑا نہیں کل ہی واپس کردوں گا لوتی بازار میں فروخت کردی اور جو رقم ملی جوئے میں ہار دی بہاولپور کے راشن ڈیپارٹمنٹ کو فریب دیا جعلی کاغذات تیار کیے لیکن بروقت پکڑا گیا آخر شاہ صاحب کی سفارش پر رہا ہو گیا۔ غرض یہ اُس کا ہر روز کا دھندا تھا۔ جیل میں اُس نے کمیونسٹوں سے دوستی گانٹھی اور نظر بہ ظاہر انہی کا ہو رہا۔ سید امیر شاہ (جیلر) نے شاہ صاحب کی وجہ سے اُسے پریس میں لگا دیا تھا لیکن اُس نے وہاں بھی کرتب دکھانا شروع کیے پریس کے گودام سے کاغذ کے رِم چراتا رہا ہر روز ایک دو رِم چوری کر کے کمیونسٹوں کو دیتا وہ اس سے کاپیاں بناتے اور استعمال میں لاتے تھے کاغذ زیادہ ہوتا تو باہر پارٹی کے دفتر میں بھجوا دیتے۔ ایک دن اُس نے نہایت اعلیٰ کاغذ کے بہت سے رم چوری کیے پریس کی دیوار سے کوٹ موقع کی طرف پھینکے وہاں سے اشتراکی دوست اٹھالائے یامین کو پتہ چلا تو اُس نے شور مچا دیا کہ سارا مال کمیونسٹ ہی کھائے جا رہے ہیں مَیں ابھی سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع کرتا ہوں کمیونسٹوں نے ہاتھ جوڑنے شروع کیے خود لدھا رام بھاگم بھاگ آیا۔ ہاتھ باندھے الغرض مال غنیمت سب میں تقسیم ہوا۔

چوری کا یہ کاغذ "لال ڈھنڈورہ" میں بھی لگتا رہا پنجاب سی۔ آئی۔ ڈی کو اپنی ذہانت و فطانت پر بڑا ناز تھا اُس نے سر توڑ کوشش کی کہ سائیکلوسٹائل مشین پکڑے یا اس امر کا سراغ لگائے کہ لال ڈھنڈورہ آتا کہاں سے ہے؟ مگر آخر وقت تک ناکام رہی۔ لال ڈھنڈورہ ایک عرصہ تک ٹیررسٹ وارڈ میں سائیکلوسٹائل ہوتا رہا۔

پھر جب کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں میں جنتا کی جنگ کے مسئلہ پر کھلا تصادم و اختلاف ہو گیا تو یہ سلسلہ منقطع کرنا پڑا کیوں کہ اب اُس کے افشاء ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ یہ کہنا

مشکل ہے کہ سپرنٹنڈنٹ یا جیلر اس سے آگاہ تھے یا نہیں؟

جب بہت سا کاغذ نکل گیا اور بڑھیا کاغذ گودام میں نہ رہا تو لدھا رام نے اس اندیشہ کے پیش نظر کہ ورکس مینیجر کو شبہ ہو رہا ہے اور چیکنگ پر مصیبت پڑنے کا امکان ہے آگ کا ایک توڑا کاغذوں کے ڈھیر میں رکھ دیا یہ توڑا ابتدائے شام سے آدھی رات تک سلگتا رہا جب رات تابہ کمر آ پہنچی تو گودام کو آگ لگ گئی یکایک سٹور سے شعلے نکلے اور پھیل گئے تمام جیل میں گھڑیال کھڑکنے لگے قیدیوں کی نیندیں ہوا ہو گئیں لاہور سنٹرل جیل کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ نصف شب کو اس کے دونوں پھاٹک بیک وقت کھلے اور آگ بجھانے والا انجن اپنے شور و غل کی طغیانیوں کے ساتھ اندر داخل ہوا لدھا رام یہاں بھی بچ نکلا اُس نے دفتر کے اہلکاروں کو ذمہ دار ٹھہرایا اور بیان دیتے ہوئے کہا کہ فلاں فلاں آفیسر نے کاغذ کی چوری چھپانے کے لیے آگ لگوائی ہے اس سے اندازہ کر لیجئے کہ لدھا رام کیا شے تھا!

روپ اور بہروپ

گاندھی جی کی تحریک میں ایک خوبی تھی کہ کھدر نے ایک طرح کی یکسانی پیدا کی لباس سے بھی انسانی نفسیات پر گہرا اثر پڑتا ہے اس سے گو باطن نہ بدلا لیکن ظاہر میں یکرنگی سی پیدا ہو گئی اس یکرنگی نے عام کارکنوں کے احساس کہتری کو بھی دبا دیا بعض لوگ کھدر کی تحریک کا مذاق اُڑاتے رہے اسے دیہاتی گنواروں کا لباس کہا لیکن کھدر پہنو کی تحریک نے بڑا کام کیا۔ مثلاً

(۱) انگلستان کی ملوں سے جو کپڑا آتا تھا ہندوستان میں اس کی مانگ اور کھپت

کم ہو گئی تو انگلستان میں ہندوستان کی قومی تحریک کے لیے توجہ پیدا ہوئی مانچسٹر اور لنکاشائر کی ملوں کی آمدنی گھٹنے سے کارخانہ داروں میں اضطراب پیدا ہوا مزدوروں کی اجرتوں میں کمی ہونے لگی بیکاری کا دروازہ کھلا نتیجتہً تاجروں اور آجروں نے حکومت پر زور دیا کہ وہ ہندوستان کی سیاسی تحریک سے سمجھوتہ کرے۔

(۲) ہندوستان کے لاکھوں کپڑا بننے والوں کو روزگار ملا جولاہوں کی مانگ بڑھ گئی۔

(۳) لباس کی یکسانی سے ہر شخص میں برابری کا حوصلہ پیدا ہو گیا۔

لیکن طبقاتی امتیاز معاشری زندگی کے دوسرے تمام دوائر میں باقی رہا جن لوگوں کے پاس دھن دولت تھی وہ بنگلوں میں اسی ٹھاٹھ سے رہتے جس ٹھاٹھ کے خلاف احتجاج کیا جاتا تھا سر پہ دوپلی، نیچے دس سے چالیس ہزار روپے کا موٹر، کوٹھیوں میں نوکر چاکر، دستر خوانوں پر شاہانہ بھوجن غرض ان کے ہاں اسراف وتبذیر کا پورا جلوہ پایا جاتا تھا یہی نظارہ جیل میں تھا۔ غریب کارکن چکیاں پیستے، بان بٹتے، کولھو چلاتے، خراس میں جتتے، مہینوں قید تنہائی میں رہتے اور انتظار کرتے کہ ان کی خوشی کا سورج کب طلوع ہو گا؟ لیکن امراء کے لیے جیل میں بھی علیش تھا ہر عنوان کا علیش، دیوان چمن لال سپیشل جیل گجرات میں تھے تو ہر روز اُن کا نوکر لاہور سے ان کے لئے مٹی کے گھڑے میں پانی لے جاتا تھا۔ میاں افتخار الدین پوتڑوں کے رئیس تھے ایک تو انہیں ہر جگہ پارٹی بنانے میں مزہ آتا دوسرے دولت کا اظہار ان کی عادات مستمرہ میں داخل تھا انہوں نے کمیونسٹ کارکنوں کو جیل میں خوب نوازا دوسرے تیسرے روز دعوت کرتے اور گھر سے طرح طرح کے کھانے منگواتے اس سے ان کی شاہانہ فیاضیوں

کا اظہار ہوتا تھا اپنی دولت کو وہ قومی خدمت کے بجائے سیاسی رشوت کے لیے استعمال کرتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ سبھی کچھ روپیہ ہے اور اس کے بل پر وہ ہر چیز خرید سکتے ہیں حتیٰ کہ لیڈری بھی! اُن کی لیڈری روپے کی نمود و نمائش سے پروان چڑھی اور اسی کے بل پر ختم ہو گئی لیکن اسی کے ہاتھوں وہ رحلت کر گئے ان سے سیاسیات میں ایک رونق ضرور تھی۔ ان کے گھر سے اتنا پھل آتا کہ بہت سا بچ رہتا اور غلاظت خانہ میں پھینکنا پڑتا۔ یہی حال سیٹھ سدرشن کا تھا جو لوہے کی چور بازاری کے تاجر تھے اور لاکھوں روپیہ کے مالک تھے ان کے ہاں سے ہر روز مٹھائی آتی اور دوستوں میں تقسیم ہوتی لیکن سی کلاس کے بعض نوجوان جو کانگرس ہی کی تحریک میں نظر بند ہو کر آئے تھے اس طبقاتی گھاؤ پر چڑتے تھے سدرشن میں غصہ بالکل نہیں تھا انتہائی نرم گفتار تھے وہ کسی لیڈر کے نائب ہو سکتے تھے لیکن خود لیڈر نہیں بن سکتے تھے وہ ایک سیٹھ تھے ان کی یہی کمزوریاں تقسیم ملک کے بعد اُن کی سیاسی چیتا کا نوشتہ بن گئیں اور وہ ہمیشہ کے لیے اس وادیٔ پرخار سے نکل گئے۔

مہاشہ ویریندر مہاشہ کرشن کے بڑے بیٹے تھے وجیہہ تندرست تیز و طرار، اُن کے پتا انگریزوں کے مقابلہ میں پکے نیشلسٹ اور مسلمانوں کے مقابلہ میں پکے ہندو تھے یوں کہئیے کہ وہ ہندو احراری تھے یعنی انگریزوں کے مقابلہ میں نیشلسٹ اور ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمان لیکن ویریندر نیشلزم اور کمیونزم کا حد اوسط تھا۔ اس میں باپ کی سی قابلیت اور ذہانت نہ تھی اور نہ اتنا تحمل و ضبط ہی تھا لیکن وہ باپ کی طرح مغرور بھی تھا مزاج میں اگر کسی قدر ترشی یا تلخی تھی تو طبیعت کے اعتبار سے باغ و بہار تھا اس کا خیال تھا کہ اس کے نیشنلزم پر جو اعتراض کئے جاتے ہیں ان میں ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ وہ مہاشہ کرشن کا بیٹا ہے کانگرس کے پنجابی نیتا اس کو پنجاب کا نہرو کہتے لیکن اس کو یہ احساس بھی

تھا کہ وہ موتی لال کا بیٹا نہیں ورنہ اس کی پشت پر کوئی گاندھی ہے ——— اُس کا مدِ مقابل پربودھ تھا دونوں میں اختلاف تھا ویریندر، گوپی چند اور پربودھ ستیہ پال گروپ میں تھے پربودھ کو اس کے احباب پنجاب کا سبھاش بوس کہتے بظاہر یہ ایک مذاق تھا لیکن دوستوں میں چل نکلا لطف کی بات یہ ہے کہ ویریندر نہرو نہ بن سکا صرف اخبار نویس ہو کر رہ گیا لیکن پربودھ کو سیاسیات میں نہرو کی سرپرستی حاصل ہو گئی اور وہ ہمیشہ کے لیے انہی کا ہو گیا۔

غذا اور دوا

کانگرس کے تمام بڑے بڑے لیڈر گجرات سپیشل جیل میں تھے بلکہ جتنے اے اور بی کلاس کے کانگرسی لیڈر تھے انہیں وہاں رکھا گیا ڈاکٹر گوپی چند بھارگو بیماری کے نام پر گجرات سے لاہور آ گئے تو پھر یہیں ٹک گئے بیماری انہیں کوئی ضرور تھی لیکن کیا تھی؟ یہ کہنا مشکل ہے! وہ آتے تو ان کے ساتھی بھی گجرات سے آ گئے حتیٰ کہ لاہور سنٹرل جیل غیر مشخص بیماریوں کے تندرست مریضوں کا ہسپتال بن گیا ایک کے بعد دوسرا چلا آ رہا تھا بیشتر لاہور اگر لاہور ہی کے ہو جاتے ان کے واپس جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا لیکن بعض بے سہارا لوگ جو واقعی بیمار تھے لاہور آتے۔ کچھ دن ٹھہرتے اور واپس چلے جاتے۔ ان بیماروں ہی میں یامین ڈار کے بھائی مولوی عبدالغنی لدھیانوی بھی تھے جو ہفتہ کے اندر اندر لوٹا دیئے گئے خطا یہ تھی کہ وہ ڈاکٹر گوپی چند بھارگو کے سخت مخالف تھے ان صحت مند بیماروں کو ہر روز جو خوراک ملتی وہ بلا مبالغہ سولہ اور بیس روپے کے درمیان ہوتی ——— بیش قیمت دوائیں مہیا کی جاتیں۔

میں کوئی تین سوا تین سال منٹگمری سنٹرل جیل میں رہا وہاں ایسی خوراک ملتی رہی کر صحت کی دیواریں ہی ڈھے گئیں بدن سوکھ کر کانٹا ہو گیا بھوک ہڑتال نے تندرستی کی تمام علامتوں کو مجروح کر دیا تھا یہاں سپرنٹنڈنٹ نے میرے لیے جو خوراک مقرر کی اسی سے اندازہ کر لیجئے کہ ان بڑے رہنماؤں کو کیا ملتا ہوگا۔

چوزہ برائے شوربا	———	ایک
گوشت برائے یخنی	———	آدھ سیر
ڈبل روٹی	———	ایک
چاول	———	آدھ سیر
آٹا	———	ایک پاؤ
دودھ	———	دو سیر
دہی	———	آدھ سیر
انگور	———	تین پاؤ
میٹھے	———	ایک درجن
لیمن	———	چار عدد
سوڈا	———	ایک درجن
مکھن	———	دو چھٹانک
گھی	———	دو چھٹانک
گلوکوز	———	فی ہفتہ ایک ڈبہ
دلیہ	———	فی ہفتہ ایک ڈبہ

جالی ________ ہر روز ایک پکیٹ

موسم کے مطابق پاؤ بھر خوبانی آدھ سیر آم اور آدھ سیر آلو بخارہ بھی ملتے تھے۔

ظاہر ہے کہ یہ چارٹ میرے معدہ کی برداشت سے باہر تھا میں خوراک کا بھگوڑا ہوں ایک دن کی خوراک ہفتہ بھر کی خوراک سے بھی زیادہ تھی تمام راشن مشترکہ کچن میں جاتا تھا اور وہاں سے مجھے بھی وہی خوراک ملتی جو سبھی ساتھی کھاتے تھے میں کھانے پینے کا زیادہ شوقین نہیں سوکھا پھیکا جو ملا جب ملا، کھالیا خدا نے اس معاملہ میں مجھے قناعت بخشی ہے جو چیزیں لوگوں کو مرغوب ہوتی ہیں مجھے اُن سے کوئی رغبت نہیں انسان غذا کا غلام ہو کر گھاٹے میں رہتا ہے میرے لیے بادشاہ کا دسترخوان اور قیدی کی روکھی پھیکی روٹی یکساں ہیں۔

طبقاتی احساس

طبقاتی احساسات مجلسی و معاشی تفاوت کے اُن سنگین تجربات کا نتیجہ ہیں جو انسان کو روزمرہ کی جدوجہد میں حاصل ہوتے ہیں مارکسزم عملاً کوئی مشکل فلسفہ نہیں ممکن ہے نظراً مشکل ہو بہر حال عملی زندگی میں یہ بہت جلد سمجھ میں آتا ہے سرمایہ دار سوسائٹی کی مخصوص عادات ہیں وہ ان عادات کو ایک لحظہ کے لیے بھی ترک نہیں کرسکتی چونکہ اس فلسفہ کے حسن و قبح پر بحث کا یہ محل نہیں اس لیے یہاں اس کے مختلف پہلوؤں کو زیر بحث لانا عبث ہے مرحوم چودھری افضل حق کہا کرتے تھے "ایثار پیشہ سرمایہ دار رجعت پسند سرمایہ دار سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے" ________ تجربہ نے یہی ثابت کیا اور اپنی آنکھوں سے اس کے برگ و بار دیکھے سرمایہ دار کسی طبقہ کسی فرقے کسی جماعت کسی گروہ اور کسی مذہب کا ہو وہ پرائیوں ہی سے نہیں اپنوں سے بھی نفرت کرتا ہے وہ غریبوں سے الگ رہنے ہی میں

عافیت دیکھتا ہے غریب کے مقابلہ میں اس کو یہ خصوصیت حاصل ہوتی ہے کہ وہ ایک خاص قسم کا کلچر رکھتا ہے جس میں قول کی نرمی ہوتی ہے لیکن عمل کے لحاظ سے وہ ایک ظالم قسم کا انسان ہے۔

میاں افتخار الدین

مثلاً میاں افتخار الدین سیاسیات میں پہلودار انسان تھے جہاں تک خود اعتمادی کا تعلق ہے وہ ان میں سرے سے تھی ہی نہیں وہ اپنے ساتھیوں پر بھی شبہ کرتے تھے۔ جس بت کو تخلیق کرتے خود ہی توڑ دیتے اپنے ہر فعل کو انہوں نے اپنی دولت کے زور پر جائز ٹھہرالیا تھا انہیں کبھی اس کی پروا نہیں رہی کہ وہ کیا کرتے ہیں یا لوگ ان کے بارے میں کیا سوچتے ہیں وہ یہی سمجھتے تھے کہ میری دولت اور ترقی پسندی کا نعرہ یہ دونوں میری شخصیت کو قائم رکھنے کے لیے کافی ہیں وہ غریبوں سے ہمدردی کا راگ بڑی اونچی سُر میں چھیڑتے تھے لیکن ان کا درد اُن میں بالکل مفقود تھا۔

اُن میں یہ کمال تھا کہ انسانی فطرت کے ہر پہلو سے فائدہ اُٹھاتے۔ مثلاً مولانا حبیب الرحمٰن کو الراعی برادری کے نام پر متاثر کر رکھا تھا نوجوانوں کو ترقی پسندی کے روپ میں کانگرس کے ہر گروپ سے سمجھوتہ کرتے اور توڑتے رہے مولانا ابوالکلام آزاد نے انہیں اُٹھایا اور بہت دور لے گئے جواہر لال نے انہیں اپنا بازو بنا لیا لیکن ان کی سیمابی فطرت کو قرار ہی نہ تھا انہیں بھی جھکیہ دے گئے وہ ایک ہی رات میں سب کچھ بن جانا چاہتے تھے ان میں جاگیردار طبقے کی وہ ساری خوبیاں اور برائیاں موجود تھیں جو انہیں قومی سیاست کے اس مقام پر نہ لے جاسکیں جس مقام پر وہ جانا چاہتے تھے ——

اصل میں جو کچھ تھے اس میں اُن کی اپنی کوئی خطا نہ تھی وہ گرد و پیش کی بوالعجبیوں کا ردعمل تھے والدین کے اکلوتے بیٹے تھے اور اکلوتا ہی رہنا چاہتے تھے وہ ممبر منتخب ہونے کے لیے ہر حربہ استعمال کرتے اور ووٹروں کی خرید و فروخت جائز سمجھتے تھے وہ پارٹی کی طاقت اور اپنی شخصیت سے نہیں اپنی دولت کے زور پر منتخب ہوتے تھے ـــــ اور یہی وجہ تھی کہ جس طرح چاہتے اور جو چاہتے کر گذرتے نتیجتہً انہوں نے اپنے گرد و پیش دولت اور نظریئے کی اساس پر ایک حلقہ یاراں پیدا کر لیا تھا اور دونوں ہی ایک دوسرے کے "مخلص" تھے ـــــ میاں صاحب کو ستائش کاروں کی ضرورت تھی اور ستائش کاروں کو میاں صاحب کی وہ خلقی طور پر ایک بڑے زمیندار تھے ـــــ آنکھیں کھولیں تو مولوی دیدار علی کی مشیخیت کے ہتھے چڑھ گئے مولوی صاحب لاہور کی بریلوی جماعت کے سردار تھے میاں صاحب نے لمبی سی داڑھی رکھ لی تب فرض ہی نہیں تہجد بھی پڑھتے اور میلاد کی محفلیں رچاتے تھے چونکہ مذہب کی جس دکان پہ گئے تھے اس کا مال خالص نہ تھا اس لیئے ردعمل ہوا اور میاں صاحب کمیونسٹ ہو گئے پہلے ان کی خداپرستی کا یہ حال تھا کہ اپنے مرشد کی ذات میں خدا کا جلوہ دیکھتے تھے اب ان کی بغاوت کا یہ عالم تھا کہ خدا کو خدا ہی نہیں مانتے تھے وہ عملاً تو نہیں لیکن دماغاً کمیونسٹ ضرور تھے اور ایک کمیونسٹ کی اساس یہ ہے کہ وہ مادی ہو اور مادی ہونے کے لیے دہریہ ہونا ضروری ہے جو کمیونسٹ یہ کہتا ہے کہ وہ مارکسزم کو بھی مانتا ہے اور خدا کو بھی' وہ جھوٹا ہے یا وہ کمیونزم میں کاملاً دستگاہ نہیں رکھتا یا پھر اپنے نفس کے علاوہ وہ مخلوق خدا کو فریب دیتا ہے کمیونزم کا ایک ہی نعرہ ہے زمین سے سرمایہ داری اور آسمان سے خدا کو نکال دو۔ یہ الگ بات ہے کہ میاں صاحب خود ایک سرمایہ دار تھے اور آسمان سے خدا کو نکالنا اُن کے بس میں

نہ تھا۔ ان میں بلاشبہ بعض خوبیاں بھی تھیں مثلاً وہ جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے اُس طبقہ کی عالم آشکار برائیوں سے اونچے تھے وہ ایک عیاش انسان بالکل نہیں تھے اُن کا عیش یہ تھا کہ وہ چوپال پر بٹیر لڑانے کے بجائے سیاست میں چونچیں لڑایا کرتے اور چہلیں دکھاتے تھے وہ مجموعہ اضداد تھے مسلمان بھی تھے اور دہریہ بھی۔ کمیونسٹ بھی تھے اور لیگی بھی۔ سرکار کے دوست بھی اور دشمن بھی۔ اپوزیشن کے لیڈر بھی اور حزب اقتدار کے خوشہ چیں بھی، کہا جاتا ہے انہوں نے اپوزیشن کو تقویت بہم پہنچائی لیکن حقیقت اُس کے اُلٹ ہے انہوں نے اپوزیشن کو اپنی ذات میں مرتکز کیا نئی قیادت کو اُبھرنے ہی نہ دیا بلکہ کچل ڈالا مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی نے چودھری افضل حق کو بارہا زور دیا کہ وہ میاں افتخار الدین کو احرار میں لے لیں۔ چودھری صاحب نے ہمیشہ انکار کیا۔ جب مولانا حبیب الرحمن کا اصرار بڑھا تو چودھری صاحب نے فرمایا۔

"مولانا! معاف کیجئے یہ سرمایہ دار غریبوں کی جماعت میں کھڑا ہونے کی جگہ بنالیں تو غربا احساس کمتری کے باعث بیٹھنے کی جگہ خود خالی کر دیتے ہیں اور جب بیٹھنے کی جگہ مل جائے تو صدارت خود آگے بڑھ کر ان کے پاؤں چوم لیتی ہے افتخار الدین کا صحیح مقام کانگرس ہی ہے کیونکہ وہاں اس قسم کے لاڈلے بچوں کے لیے بڑی گنجائش ہے ——"

میاں صاحب نے احرار سے کبھی بالواسطہ اور کبھی بلاواسطہ انتقام لیا ان کے نزدیک احرار کنگوں کا ایک گروہ تھا وہ کانگرس ہائی کمانڈ سے کہتے رہے کہ احرار اسلام کا نام لے کر پنجاب میں قومی تحریک کو پیدا نہیں ہونے دیتے اس کے راستہ میں مزاحم ہیں پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک دفعہ مولانا حبیب الرحمن کو پیش کش کی کہ احرار کانگرس میں آجائیں تو وہ انہیں صوبہ

کانگرس حوالے کرنے کو تیار ہیں۔ میاں افتخار الدین نے سنا تو ڈاکٹر گوپی چند کی معرفت سردار پٹیل سے رسم وراہ پیدا کرلی اور اس ہوشیاری سے پیچ لڑایا کہ جواہر لال کی بیل ہی منڈھے نہ چڑھی۔ چودھری افضل حق گذشتہ تجربوں کی بناء پر ویسے ہی اس پیشکش کے خلاف تھے غرض یہ تجویز مولانا حبیب الرحمٰن تک رہ گئی جب میاں صاحب مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تو وہاں بھی احرار ہی کو ہدف ملامت بنایا پاکستان بن جانے کے بعد کوڑا کرکٹ جمع کرکے اپوزیشن کو اپنی ذات کا محور بنایا لیکن یہ محور ہی غلط تھا اپوزیشن کیا بنتی؟ میاں صاحب نے یہاں بھی احرار کو ——— اندر خانہ ——— تباہ کرنا چاہا وجہ ظاہر تھی کہ احرار زعماء اتنے قدآور اور عظیم تھے کہ میاں صاحب کا سیاسی چراغ ان کے مقابلہ میں روشنی ہی نہ دے سکتا تھا وہ ان کی صف میں شریک ہوکر یا انہیں اپنی صف میں لاکر عوامی مقبولیت کے لحاظ سے دوسرے درجے میں رہ جاتے تھے۔

میاں صاحب کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ وہ ایک ہی جماعت کے ارکان کو آپس میں بدگمان کر دیتے اُن کا یہ کمال جیل میں بھی اُنکے ساتھ رہا جن لوگوں میں سیاسی قیدی ہونا وحدت کا سب سے بڑا نشان تھا اور وہ اس اصل کی بنیاد پر اکٹھے تھے میاں صاحب نے اپنی دوغلہ باتوں سے اس وحدت کو توڑ ڈالا دولت کی نمائش کی آخر کار ایک اختلافی خط کھینچ کر چلے گئے نتیجتہً ایک ہی کشتی کے ان سواروں سے اخلاص رخصت ہوگیا اور وہ بکھرے ہوئے دانوں کی طرح ہو گئے غرض میاں صاحب اس فن کے ماہر اُستاد اور چابکدست تھے۔

سرمایہ داری کی رُوح

یہ ایک المیہ ہے کہ جن غریب اور مخلص نوجوانوں نے قومی تحریکوں میں حصہ لیا وہ برطانوی

حکومت کے ہاتھوں ذلیل ہوتے رہے اس ذلّت نے بے شک ان نوجوانوں میں سیاسی غلامی کے خلاف نبرد آزمائی کا جذبہ پیدا کیا اور وہ جذبہ ایک تحریک بن گیا لیکن طبقاتی شعور اُن سرمایہ داروں کی روش نے پیدا کیا جو ان تحریکوں میں آگھُسے تھے یہ ایک حادثہ ہے کہ بیسیوں نوجوان اس تفاوت کے ہاتھوں پِٹ گئے بعض جاں ہار ہو گئے بعض بددل ہو کر کنارہ کر گئے مسلمان سرمایہ داروں کی بہ نسبت ہندو سرمایہ داروں میں ایک قومی روح پیدا ہو چکی تھی وہ اپنے طبقاتی مفاد کے پیش نظر مجبور تھے کہ کانگرس کا ساتھ دیں کیونکہ جو انقلاب آرہا تھا اس میں اسی طبقے کا مفاد مضمر تھا اس کے برعکس مسلمان سرمایہ دار، سرمایہ دار کیا جاگیردار (الاماشاء اللہ) ابھی تک اٹھارویں اور انیسویں صدی میں رہ رہے اور اپنے حزبی مفاد کے غلام تھے یہی مفاد اسلام کے ضعف اور مسلمانوں کے انحطاط کا باعث ہوا۔ غرض اسلام کی حقیقی روح سرمایہ داری کے ہاتھوں پامال ہو گئی یہی پامالی نوجوانوں کی مذہب سے برگشتگی کا باعث بنی اور حقیقی مذہب کی جگہ رسوم و رواج کا مذہب آگیا مسلمان اُمراء نے مسلمان غربا کو سیاسی زندگی میں اُبھرنے ہی نہ دیا جن مسلمانوں نے انگریزی حکومت کے خلاف لگاتار جدوجہد کی جب تک انگریز رہا وہ ان سیاسی اُمرا کی سزاؤں کا شکار رہے انگریز چلا گیا تو اسکے جانشینوں نے پنپنے ہی نہ دیا بلکہ ان کی عزت و آبرو کے دشمن ہو گئے۔

ہندوستان کو آزادی یونہی نہیں ملی لاکھوں نوجوانوں نے قیمت ادا کی ہے گاندھی جی ایک عظیم المرتبت لیڈر تھے اُنھوں نے ستیہ اور اہنسا کی طاقت سے برطانوی حکومت کو ہلا ڈالا یہ اُن کا اعجاز تھا کہ سینکڑوں نوجوان ملک پر قربان ہو گئے خون دینا، پھانسی پر چڑھنا، گولی کھانا، دولت لٹانا اور قید ہونا کھیل نہیں، یہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھیں قدرت نے حوصلہ اور یقین دیا ہو۔ ایک دفعہ کچھ مسلمان نوجوانوں نے مولانا آزاد سے پوچھا "ہندو نوجوان اور

ہندو لڑکیاں گولی کیونکر چلاتیں اور بم کیسے پھینکتی ہیں ؟" مولانا نے ہنس کر فرمایا "میرے بھائی! ایمان دل کی چیز ہے کسی دوکان سے مل سکتا تو ضرور بتاتا ۔"

آزادی اور مسلمان

مسلمان نوجوانوں نے قربانی واستقامت میں کمی نہیں کی لیکن انہیں ارادۃً ختم کیا گیا ۱۸۵۷ء کی تحریک کے ننانوے فی صد جانباز مسلمان تھے اس کے بعد علماء کی مختلف تحریکیں اور مجاہدین سرحد کی جھڑپیں کچھ کم ولولہ انگیز نہ تھیں جاں نثاری کا اعلیٰ نمونہ تھیں تحریک خلافت میں مسلمانوں نے کس دلیری سے حصہ لیا کیا کچھ نہیں لٹایا یہی حال موپلا تحریک کا تھا سرحد کے سرخپوش اور پنجاب کے احرار کتنے جگر دار تھے کتنے ہی مسلمانوں نے جلیانوالہ باغ میں جانیں دیں خاکسار نکلے شہید گنج کا ہنگامہ اُٹھا ختم نبوّت کے پروانے آئے ذرا سوچیے جن لوگوں نے ان تحریکوں میں حصہ لیا اور فنا ہو گئے وہ کیا ہوگئے ؟ افسوس انہیں تاریخ نے اس لیے گم کر دیا اور اپنے تذکروں میں جگہ نہ دی کہ ان کشتگان حریت وایثار کا ایک ہی جرم تھا کہ مسلمان تھے اور جن کے ہاتھ میں قلم ہے وہ ان کا ذکر اس لیے نہیں کرتے کہ انہیں اپنے ماضی کے رسوا ہونے کا اندیشہ ہے منگدلی کے ایک ہجوم نے ایثار پیشہ مسلمانوں کو تباہ کر دیا تفصیلات بڑی ہی لرزہ خیز ہیں لیکن ان کے اظہار کا یہ محل نہیں بھگت سنگھ ہندوستان کا ایک نامور فرزند تھا اس نے جان لیکر اور جان دیکر ملک کی سیاسی زندگی کو رونق بخشی لیکن جس قوم کا فرزند تھا اُس نے دیدہ و دل میں جگہ دی ۔ مسلمان ہوتا تو آج اشفاق اللہ کی طرح کسی کو یاد ہی نہ ہوتا ؟ کسے یاد ہے کہ لارڈ میو کا جان لیوا شیر علی تھا ۔ حبیب نور کے ساتھ پشاور میں کیا بیتی ؟ یہ حبیب نور ہی تھا جس نے قصّہ خوانی بازار میں بے گناہوں پر گولی چلوانے والے انگریز کرنل کو اس کی کوٹھی میں جا کر

گولی کا نشانہ بنایا دہیں پکڑا گیا اُسی دن مقدمہ چلا اور شام کو چونے کی ایک بھٹی میں گرم پانی ڈال کر بھسم کر دیا گیا۔ ایک سرخپوش سالار کے خصیئے نکال دیئے گئے امرتسر کے چاچا محمدی کو جلیانوالہ کی پاداش میں عمر قید ہوئی بلبیس سال گذار کے رہا ہوئے ابھی حال ہی میں اُن کا انتقال ہو گیا ہے۔ ایک نہیں سینکڑوں گمنام مجاہد ہیں جنہیں وقت چبا رہا ہے اور جو کسی کتاب میں تو کیا کسی زبان پر بھی نہیں ہیں اور شاید انہیں خال خال افراد کے سوا کوئی جانتا بھی نہیں ہے احرار کے بے شمار کارکن ایثار کے بعد افلاس کا شکار ہو گئے اور اس بُری طرح خوار ہوئے کہ لیل ونہار کے اس تماشا پر حیرت ہوتی ہے بعض لیڈروں کی اولاد تعلیم و تربیت سے محروم ہو گئی اب وہ زندگی نہیں گزار رہے بلکہ زندگی انہیں گذار رہی ہے کتنا اندوہ گیں حادثہ ہے کہ جن بزرگان ایثار کے خلاف ٹکے ٹکے کی زبانیں چلتی رہیں اُنکی اولاد کو پیٹ کی مار نے قبروں کے کتبے بنا دیا ہے ؎

بیکسی ہائے تمنا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیدلی ہائے تماشا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

پربودھ چندر نے ٹھیک کہا تھا کہ قربانی مسلمانوں کی ہے جن کے سامنے کوئی معاوضہ نہیں مسلمان ناراض، ہندو متعصب، انگریز مخالف، اس کے برعکس ہندوؤں کا معاملہ یہ ہے کہ ان کے ایام قید ان کا بینک بیلنس ہیں جب چاہیں اپنا چیک کیش کرا سکتے ہیں جن مسلمانوں نے استخلاص وطن کی تحریک میں حصہ لیا وہ اپنا سب کچھ گنوا چکے ہیں ان کی مثال اُس عورت کی سی ہے جو نوجوانی ہی میں بیوہ ہو جائے عمر بھر روتی دھوتی رہے بچہ جنے تو مردہ ہو۔

آخری شخص ——— اسیروں کے اس قافلہ میں پربودھ تھا ہر نئے ساتھی کی آمد کا ایک آدھ روز پہلے علم ہوجاتا پھر جس سے جتنا تعلق ہوتا اُس کے آنے کی اُتنی ہی خوشی ہوتی لیکن پربودھ کی آمد پر کسی حلقہ میں کوئی خوشی یا جوش نہ تھا جو کانگرسی یہاں تھے وہ تقریباً سب گوپی چند بھارگو کی پارٹی کے تھے پربودھ ستیہ پال گروپ میں تھا یہ دونوں گروپ ایک دوسرے کے سخت مخالف تھے مولانا داؤد غزنوی پربودھ سے واقف نہ تھے لہذا اُن کی منفی یا مثبت رائے کا سوال ہی نہ تھا ان کانگرسی لیڈروں نے پربودھ کی آمد کا نوٹس ہی نہ لیا سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں میں ایک مدت سے چل رہی تھی اور دونو ایک دوسرے کی جان کے بیری تھے لیکن پربودھ کے معاملہ میں دونوں ہمرائے، سوشلسٹ انہیں اس لیے پسند نہ کرتے کہ وہ ان کے مقابلہ میں کانگرسی تھا ———

——— رہ گئے کمیونسٹ تو ان کے لیے اس کا نام خنجر بُرّاں تھا جو کمیونسٹ یہاں تھے اُن میں سے کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں رہا تھا اور شاید اس سے

پہلے اُس کے صورت شناس بھی نہ تھے لیکن انہوں نے پربودھ کی آمد سے ایک دن پہلے اس قسم کی باتیں اُڑائیں کہ پربودھ کے خلاف عام فضا میں ناخوشگوار تاثر پیدا ہو گیا ہم لوگ جو اس کے کبھی دوست نہیں رہے تھے ظاہر ہے کہ ساتھیوں کا تاثر ہی قبول کر سکتے تھے وہ پہنچا تو ہم نے اُس کا مطلقاً خیر مقدم نہ کیا اس طرح آیا جیسے کوئی اجنبی چلا آتا ہے کسی گوشہ میں کوئی سی خوشی نہ تھی۔ اس نے بھی یہ محسوس کیا کہ اس کے ساتھ یہ بے توجہی برتی جا رہی ہے؛ جب سبھی متفق تھے کہ یہ شخص کسی توجہ یا توقیر کا مستحق نہیں تو پھر عام جذبات اس سے کیا مختلف ہو سکتے تھے لیکن پربودھ نے ایک دو روز ہی میں اپنی جگہ پیدا کر لی محسوس ہونے لگا کہ وہ اس پروپیگنڈا سے مختلف انسان ہے سوشلسٹوں کی ناراضی کا سبب یہ تھا کہ وہ سٹوڈنٹس یونین میں اُن کا مدمقابل رہا اور جماعت سے زیادہ اس میں انفرادیت کا احساس تھا یہ کوئی ـــ خرابی نہ تھی۔ معاصرت میں اس قسم کے اختلافات ہوتے ہیں لیکن کمیونسٹوں کی برہمی کے اسباب واضح تھے۔ مثلاً وہ ان کا سخت دشمن تھا اور جہاں کہیں اس کا بس چلتا انہیں زِچ کرتا۔ وہ ان کے ہتھکنڈوں کو ہر محفل اور ہر مجلس میں بے نقاب کرتا۔ اُس نے "پیپلز وار" کے نظریئے کو بُری طرح رسوا کیا وہ علی الاعلان کہتا اور یہاں بھی اس نے پہلے ہی دن آ کر اعلان کیا کہ وہ کمیونسٹوں کے سوا ہر شخص کا دوست ہے اس کا عقیدہ تھا کہ یہ لوگ مطلب نکال لینے کے بعد کسی سے مخلص نہیں ہوتے انہیں کمیونزم یا کمیونسٹ پارٹی کے سوا کسی شخص یا جماعت سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی یہ پارٹی کی ہدایت پر انسانی قدروں کو برباد کر دینے پر تل جاتے ہیں غرض وہ کمیونسٹوں کی تحریک کا سب سے بڑا دشمن تھا ان کے مقابلہ میں وہ نہ صرف نوجوانوں کی تنظیمیں بناتا بلکہ بڑے بڑے لیڈروں کو بلا کر کانفرنسیں کرتا اور جہاں تہاں موقع ملتا کمیونسٹوں کو آڑے ہاتھوں لے کر پٹخنی دینے کی کوشش کرتا۔

وہ بڑے ہی جی گردے کا دھان پان آدمی تھا دبلا پتلا، نازک اندام، گورا چٹا سرخ و سپید، ستواں ناک، میانہ قد، متحرک اور روشن آنکھیں، طبیعت میں حلم، کم گفتار، آنکھیں حیا سے جھکی رہتیں۔ پلکوں میں تناؤ پیدا ہو تو یہ اس کا غصہ تھا کمیونسٹوں نے اس کے خلاف نہ صرف ساتھیوں میں برہمی پیدا کی بلکہ اس کو پیٹنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ سمجھتے تھے انہوں نے سیاسی طور پر اس کو نہتا کر دیا ہے لیکن جب پربودھ نے اپنا نقش جما لیا اور ہم لوگ دو ایک روز میں صورتحال کے شناسا ہو گئے تو کمیونسٹوں کا حوصلہ ٹوٹ گیا ——

پربودھ نے بتایا کہ بعض لوگ اس سے صرف اس لیے برہم ہیں کہ اُس نے اپنی زندگی خود بنائی اور عمر کی دشوار گھاٹیوں سے ہو کے نکلا ہے جب وہ جدوجہد کے راستہ پر تھا کسی نے اس کا ہاتھ نہ پکڑا بلکہ کوشاں رہے کہ وہ ڈوبتا کیوں نہیں؟ اب زندگی حاصل کی ہے تو وہی لوگ حسد کرتے ہیں نہ تب جلنے دیتے تھے نہ اب جینے دیتے ہیں۔

پربودھ کے پتا جی صوبہ کے بعض اسکولوں میں ہیڈ ماسٹر رہے —— گھر میں کوئی تنگی نہ تھی کھاتا پیتا گھرانا تھا باپ کا پیار اور ماں کی مامتا دونوں حاصل تھے ملک میں "سیاسی جدوجہد" کا شباب تھا بالخصوص ٹیررسٹ نوجوانوں نے سارے ملک کو ہلا رکھا تھا ہر جگہ انقلابی دہشت پسندوں کا شہرہ تھا ان میں لڑکے ہی نہیں لڑکیاں بھی شامل تھیں کلکتہ سے لے کر پشاور تک ہر روز کہیں نہ کہیں کوئی معرکہ ہوتا۔ بنگال اور پنجاب خاص طور پر ان کے مرکز تھے عدالتوں میں گولیاں چلائی جاتیں۔ گاڑیاں روک کر خزانہ لوٹ لیا جاتا بم پھٹنا روزمرہ ہو چکا تھا آئے دن کسی نہ کسی شہر میں بم پھٹتا۔ بسا اوقات مختلف شہروں میں ایک ہی وقت میں ایک ہی طرز کے بم پھٹتے انقلابی نوجوانوں نے نوکر شاہی کو آگے لگا لیا تھا وائسرائے اور گورنر آسانی سے آ جا بھی نہ سکتے تھے پولیس بالخصوص سی۔ آئی۔ ڈی کا خوب و خوار حرام تھا

دسمبر ۱۹۲۹ء میں لارڈ ارون کی سپیشل ٹرین پر نظام الدین ریلوے اسٹیشن پر بم پھٹا۔ اس واقعہ نے نوجوانوں کو اور بھی تیز کر دیا۔ ہر نوجوان میں یہ خواہش پیدا ہونے لگی کہ وہ کیونکر انقلابی بن سکتا ہے ——————————

—————— پربودھ دسویں جماعت میں تھا جب اس خبر نے تمام ملک کو چونکا دیا کہ پنجاب کے سات شہروں امرتسر، لاہور، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، لائلپور، جہلم اور راولپنڈی میں بیک وقت بم پھٹے ہیں تو اُس نے بھی انقلابیوں میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ عام لوگوں نے انقلابیوں کی اس کیمپ کا نام بھگت سنگھ پارٹی رکھ دیا تھا کچھ عرصہ تو وہ پارٹی کی تلاش میں رہا فرسٹ ایئر میں داخل ہوا تو کامریڈ احسان الٰہی کی نگاہ میں آ گیا ان دنوں پارٹی کے اخراجات اسی طرح چلتے تھے کہ نووارد انقلابی گھر سے زیور چُرا لاتے ڈاکہ ڈالا جاتا یا بڑے بڑے سیٹھوں کو ڈرا دھمکا کر اُن سے روپیہ ہتھیایا جاتا تھا پربودھ نے انقلابی بننے کے شوق میں ماں کا زیور چرایا اور لاہور آ گیا یہاں نوجوان بھارت سبھا کے راہنماؤں سے رابطہ پیدا کیا زیور پارٹی کے حوالے کیا بھگوتی چرن کی موت سے پارٹی کا شیرازہ منتشر ہو گیا تو پربودھ لدھیانہ میں یامین ڈار کے ہاں تربیت لینے لگا اُس نے اپنی کہانی سناتے ہوئے بیان کیا کہ

میں ان دنوں وشنو تھا یامین گوشت خور، وہ سالن میں سے بوٹیاں نکال کر سبزی بھجوا دیتا اور میں کھا لیتا تھا اس طرح گویا میرے وشنو ہونے کا فریب قائم رہا مرتا کیا نہ کرتا انقلابی بننے کا شوق سب کچھ کروا رہا تھا پارٹی منتشر ہو گئی تو سال بھر بے ٹھکانہ رہا گھر کیسے جاؤں ؟ ماں کا زیور چرایا تھا فاقوں نے آ گھیرا، ایک ایک سیاسی دروازہ پر دستک دی لیکن کسی نے ہاتھ نہ پکڑا

کھلے دروازے بھی بند ہو گئے۔ بند دروازوں کو کھولنا تو اور بھی مشکل تھا۔ یہ شوق ٹھنڈا ہوا تو تحصیل علم کا شوق عود کر آیا ظاہر ہے کہ مَیں آوارہ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جن نوجوانوں کی تعلیم ادھوری رہ جاتی ہے وہ کیا سے کیا ہو جاتے ہیں۔ مَیں نے حصول تعلیم کے شوق میں دوڑ دھوپ شروع کی ـــــ ناگہاں میری ماں کا انتقال ہو گیا (پر بودھ یہ کہہ کر ڈھائیں مار مار کے رونے لگا اور دیر تک روتا رہا) اب کوئی شخص ماں کہتا ہے تو میرا دل اندر سے ہل جاتا ہے میری ماں میرے فراق میں بلک بلک کر مر گئی۔ پتا کے نزدیک میرا یہی جرم شدید تھا کہ مَیں گھر چھوڑ کر بھاگ آیا تھا ایک مدرس کے بچے کا یہ سب سے بڑا جرم تھا اُن کا خیال تھا کہ جس اُستاد کا اپنا بچہ اس طرح بھاگ جائے وہ دوسروں کے بچوں کو کیا پڑھا اور لکھا سکتا ہے مَیں ماں کی چتا بھی نہ دیکھ سکا پربودھ کا چہرہ دوبارہ اشکبار ہو گیا اُس نے اپنی یہ کہانی سکون پیدا ہونے تک ملتوی کر دی ـــــ تھوڑی دیر بعد اُس نے بیان کرنا شروع کیا جب فاقوں سے نڈھال ہو گیا اور لاہور کے بڑے بڑے دیش بھگتوں کے دل مقفل ہو گئے تو مَیں نے اخبار بیچنے شروع کئے شاہی محلہ میں سکھوں کا ایک لنگر تھا وہاں سے روٹی کھاتا رہا پھر اپنے ایک مسلمان دوست کی معیت میں جو آجکل پاکستان میں ایک بڑے عہدہ پر ہیں مسجد کا درویش بنا۔ ہم دونوں ہر روز مختلف گھر سے روٹی مانگ کر لاتے اور کھاتے اور اکثر منتظر رہتے کہ کب کسی کے ہاں موت ہو اور چالیس دن روٹی ملتی رہے۔ مذہباً مَیں ہندو تھا۔ پیٹ کی خاطر مَیں نے اذان سیکھی مؤذن بنا رہا جب میرا ساتھی مجھے چھوڑ گیا تو مَیں گرتا پڑتا ڈاکٹر ستیہ پال کے ہاں پہنچا۔ اُنہیں اپنی بپتا سنائی وہ بے حد

کی ضرورتوں کا خیال رکھتی جو چیز منگواتے بھیج دیتی تھی۔

ایک دن قمیصوں، پاجاموں، کرتوں، دھوتیوں اور چادروں کا ڈھیر آگیا۔ جن سی کلاس سیاسی قیدیوں کی ملاقات نہ ہوتی تھی یا جن کا کوئی پرسان حال ہی نہ تھا پربودھ نے ان سب میں یہ کپڑے بانٹ دیئے وہ اپنے ماضی کی بنا پر جانتا تھا کہ غریبوں کا کیا دکھ ہوتا ہے اور جو بے آسرا نوجوان تحریک استخلاص وطن میں حصہ لیتے ہیں ان کی احتیاج کیا ہوتی ہے اس کو حوادث کی مختلف منزلوں نے قدرے خودسر بنا دیا تھا اس میں اَنا کا جذبہ بھی تھا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اَنا نہ ہو تو انسان ہی انسان نہیں رہتا کوڑا کرکٹ ہو جاتا ہے۔ بہت کم لیڈر تھے جن پر اُسے اعتماد تھا یا جنہیں وہ اپنی راہنمائی کے قابل سمجھتا وہ روپیہ جمع کرنا روپیہ کمانے کی توہین سمجھتا تھا اس نے جلد ہی ٹیررسٹ وارڈ میں اپنی ایک طاقت پیدا کر لی جس سے کمیونسٹ بد کنے لگے لیکن ان شدید اختلافات کے باوجود ان لوگوں میں ایک خوبی تھی کہ کبھی ایک دوسرے پر ذاتی حملے نہیں کرتے تھے جب آمنے سامنے ہوتے تو اس طرح ہاتھ باندھ کے ملتے جیسے دل میں کوئی میل ہی نہیں ہے حکومت کے مقابلہ میں سب ایک تھے۔

ساورکر ہندو مہا سبھا کے صدر اور کانگرس کے حریف تھے یہ ذکر پچھلے صفحوں میں بھی آچکا ہے کہ وہ ایک دفعہ بھاگل پور میں پکڑے گئے تو مہاتما گاندھی نے حکومت کو ڈانٹا تھا کہ اُس نے انہیں گرفتار کر کے شہری آزادی کا گلا گھونٹا ہے پنڈت جواہر لال نہرو کو انفرادی ستیہ گرہ میں چار سال قید ہوئی تو ساورکر نے حکومت کی سخت الفاظ میں مذمت کی۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے جو سیاسیات کے نزدیک پھٹکتے بھی نہ تھے ایک بیان میں کہا تھا کہ جو حکومت جواہر لال کو جیل میں ڈالتی ہے وہ کیونکر مہذب

کہلا سکتی ہے؟

جے پرکاش نارائن اور دوسرے سینکڑوں نوجوانوں نے دیولی کیمپ میں بھوک ہڑتال کی تو گاندھی جی نے بیان دیتے ہوئے کہا "حکومت ہند کو ان کے مطالبات تسلیم کر لینے چاہئیں وہ ان نوجوانوں کے دل میں ضد پیدا کر رہی ہے اگر ان میں تشدد کا میلان پیدا ہو گیا اور ملک نے ان کی پیروی کی تو وہ اس تحریک کو روک نہیں سکیں گے یہ سب نوجوان قوم و ملک کا قیمتی سرمایہ ہیں۔"

اِدھر عام مسلمانوں کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے نوجوانوں کو جو انگریزی حکومت سے ٹکر لیتے قابل توجہ ہی نہ سمجھتے تھے رہ گئے خواص تو وہ انہیں مطعون کرتے ہوئے نہ تھکتے تھے باقی صوبوں کا حال خدا بہتر جانتا ہے پنجاب کا حال تو یہی تھا۔

پربودھ ستیہ وادی بھی تھا اور اہنسا وادی بھی اور یہ دونوں خوبیاں اُس نے اپنی ذات میں بکمال و تمام جمع کر لی تھیں اس نے اپنے کمرے (walls) میں رابندر ناتھ ٹیگور کی دستخطی تصویر لٹکا رکھی تھی۔ اس کے سیاسی خیالات وہی تھے جو گاندھی جی اور جواہر لال کے تھے —— مولانا آزاد کا وہ شیدائی تھا مولانا ہی نے اسے پہلی دفعہ اسمبلی کا ٹکٹ دیا تھا جب اسے ٹکٹ ملا تو بریڈلا ہال کے دروازہ پر ٹریبیون کے ابناش چندر بالی سے اُس کی ملاقات ہوئی بالی جی گوپی چند گروپ میں تھے اور سخت ہندو، انہیں ملال تھا کہ انہیں یا دیر بندر کو مولانا نے ٹکٹ نہ دیا بلکہ پربودھ اور تلک کو ٹکٹ دیا ہے پربودھ نے بالی جی سے رسماً آشیرباد حاصل کرنی چاہی لیکن بالی جی نے دو ٹوک جواب دیا کہ ٹکٹ غلط ملا ہے تم ٹکٹ کے حقدار نہ تھے پربودھ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا لیکن وہ جانتا تھا کہ اس کے خلاف یہ حسد صرف اس لیے ہے کہ وہ ذاتی محنت سے اُبھرا ہے۔

دوست پہلے بنتے پھر بنائے جاتے ہیں پربودھ ایک ہیرا تھا اس کی ذاتی خوبیاں بے پناہ تھیں وہ ہلکا نہیں تھا لیکن اس کی دشمنی اور دوستی عظیم تھی وہ سرتاپا مہر و وفا تھا اس کے لغت میں فریب و دغا کے الفاظ ہی نہ تھے۔ شاعروں نے دوستوں کا بڑا ماتم کیا ہے کہ اس دنیا میں کوئی دوست نہیں دشمن عام ہیں لیکن پربودھ فی نفسہٖ ایسے تمام مفروضوں کی نفی تھا وہ سچا سونا تھا اس کو مل کر انسان محسوس کرتا تھا۔ ع

ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

قدرت نے مجھے اکل کھرا طبیعت دی ہے مَیں نے زندگی میں کم ہی لوگوں کے احسان اُٹھائے ہونگے تاہم انسان کو ایک دوسرے کے تعلقات کی معاونت پر بھروسہ کرنا ہی پڑتا ہے جس زمانے میں مَیں نے سیاسی زندگی شروع کی پھٹے حالوں میں تھا فاقوں پہ فاقے آتے رہے لیکن کبھی سوال نہ کیا جو شخص زبان کو سوال سے داغدار کرتا یا اپنے پیٹ سے کپڑا اُٹھاتا یا ہاتھ کو کشکول کی صورت دیتا ہے وہ نہ صرف عزت نفس کھوتا بلکہ خود سوال ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس ساری زندگی میں پربودھ ہی ایک ایسا شخص تھا جس نے برادرانہ تعلق کو اتنا محکم کیا کہ ہم دونوں جسم واحد ہو گئے اُس نے میری دامے درمے قدمے اور سخنے مدد کی آج ہم دو مختلف مملکتوں کے شہری ہیں لیکن یہ اعتراف کرتے ہوئے مجھے خوشی ہوتی ہے کہ وہ زندگی کی آبرومندانہ راہوں میں میرا معمار رہا ہے وہ انسان کے لباس میں دیوتا ہے اس نے میری زندگی پر بڑا اثر ڈالا ہے میں اس کو اپنا دوست اور اپنا بھائی سمجھتا رہا مَیں نے اس کے خاندان سے اور اس نے میرے خاندان سے اتنی محبت کی ہے کہ جیسے ہم ایک ہی شاخ کے پھول ہیں ہم میں کبھی جھگڑا نہیں ہوا اور نہ ہم نے کبھی آزادی کے بعد کسی بھی سیاسی موضوع پر گفتگو کی ہے اس کو ہندوستان

عزیز ہے مجھے پاکستان ——

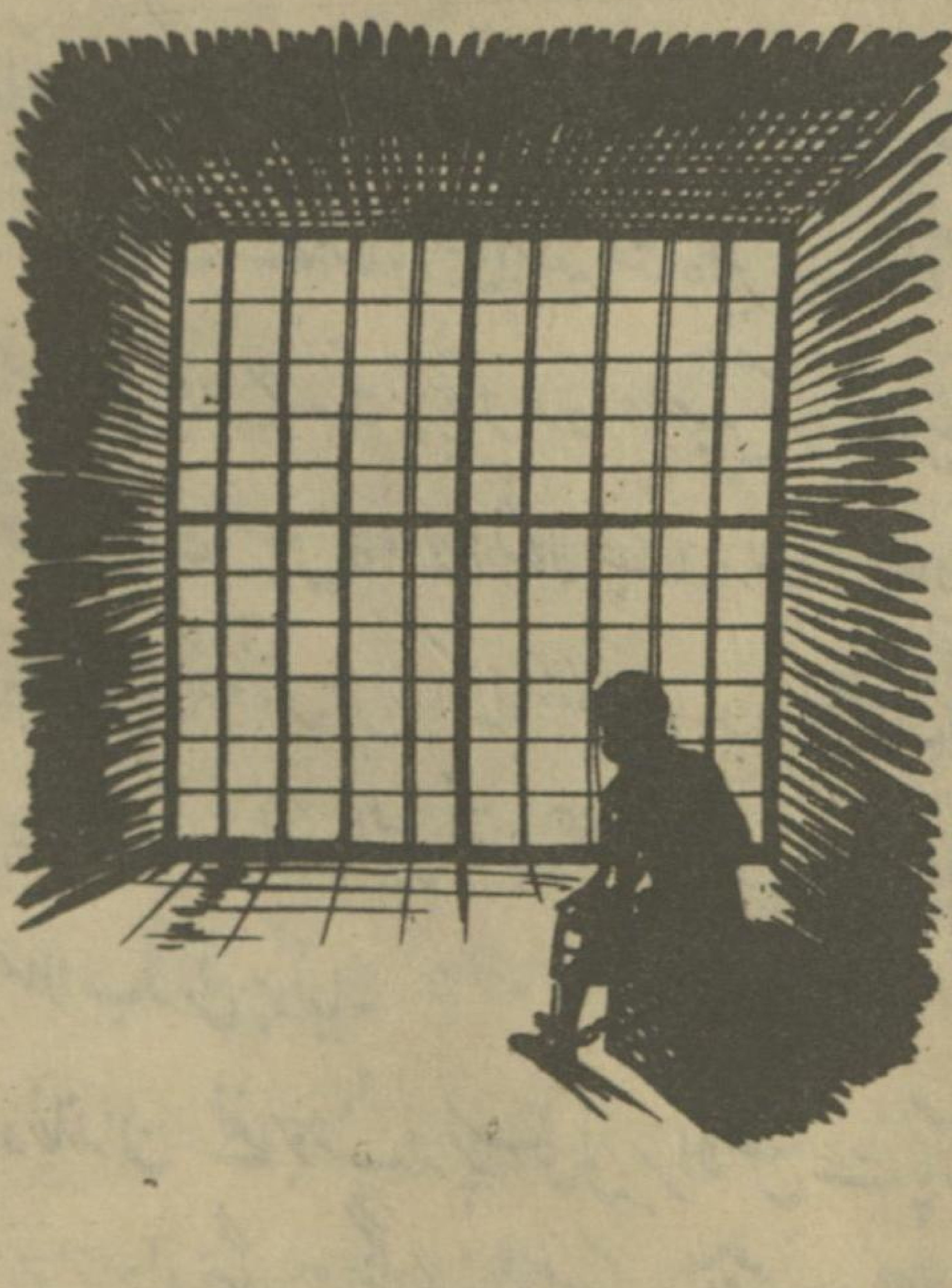
دیوالی کی رات جتنے ہندو ساتھی تھے انہوں نے اپنی کوٹھڑیوں پر دیپ مالا کی رات کو جو اکھیلا بچہ بالو نے (جس کا ذکر پہلے بھی ہو چکا ہے) پھونکیں مار مار کر سبھی چراغ اور موم بتیاں گل کر دیں کچھ ساتھیوں نے بُرا مانا اور احتجاج کیا لیکن اُس سے کچھ کہنا سننا مشکل تھا وہ خود بھی ہندو تھا اُس نے للکار کر جواب دیا "یہاں دیپ مالا غلط ہے ہمیں راون نے قید کر رکھا ہے قید میں چراغاں کرنے کا مطلب ہے کہ ہم اس سے خوش ہیں پہلے راون کو مارو پھر چراغاں کرو رام قید ہو تو دیپ مالا کا مطلب ؟ — یہ بدشگونی ہے —— ان چراغوں کو بجھا دو ——"

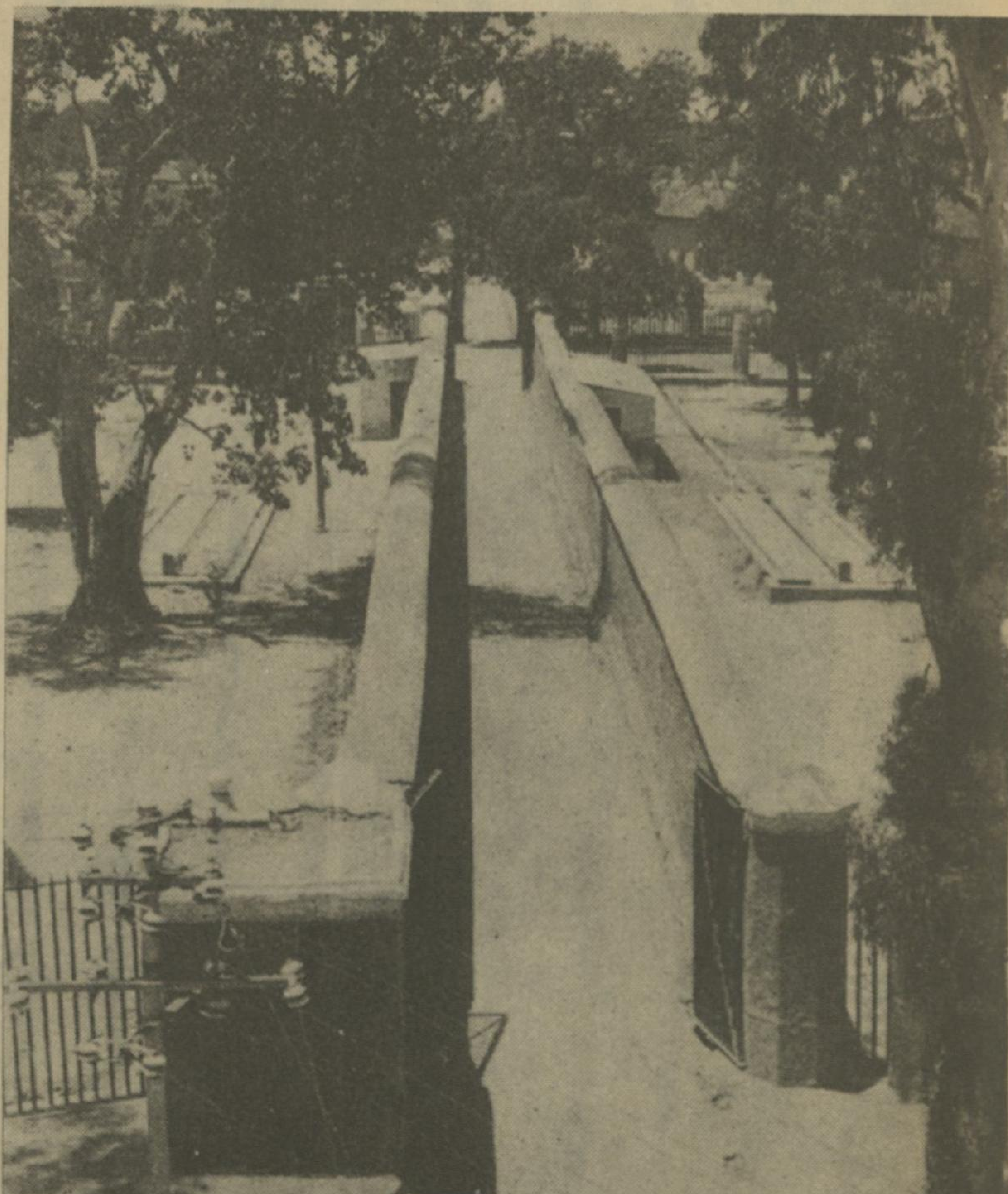
پربودھ میں ایک ہی کمزوری تھی کہ بیوی بچوں کے خطوط کا بے چینی سے انتظار کرتا جیل میں خطوط دیر سے ملتے تھے مقامی خط بھی ہفتہ عشرہ میں ملتا خط آتا اگلے روز سی آئی ڈی کے دفتر میں سنسر کیلئے چلا جاتا وہ چوتھے پانچویں روز واپس کرتے۔ یہ لائحہ عمل پربودھ کے لیے صبر آزما تھا میں نے اس کا علاج نکالا جب سپرنٹنڈنٹ اور جیلر دوپہر کے وقت گھروں کو چلے جاتے تو میں ڈیوڑھی میں جا کر پولیٹیکل قیدیوں کی ڈاک کا بکس کھولتا اور جو خط پربودھ کے نام ہوتا اُڑا لاتا۔ یہ ایک ایسی نقب تھی جس کو میں نے اپنا معمول بنا لیا تھا۔ نتیجۃً پربودھ کا اضطراب رفع ہو گیا۔

پنجاب میں دو خاندان تھے جو فرقہ پرستی کی ہر آلائش سے پاک رہے ایک سردار کلبیر سنگھ کا خاندان جو سردار بھگت سنگھ کا خاندان کہلاتا تھا دوسرا لالہ پنڈی داس کا خاندان جہاں پربودھ خانہ داماد تھے۔

اس ساری قید میں دو ہی نوجوان میری کمائی تھے۔ ایک تلک راج چڈھا

دوسرا پربودھ چندر لیکن دونوں ایک دوسرے سے نزدیک ہو کر بھی دور تھے دونوں کی شاہراہیں ہی مختلف تھیں۔





سنٹرل جیل لاہور (اندرونی زاویہ)

کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں



ہم نے اُس وقت سیاست میں قدم رکھا تھا
جب سیاست کا صلہ آہنی زنجیریں تھیں

رہائی کا سال تو ۱۹۴۴ء ہی تھا کیونکہ پانچ سال پورے ہو رہے تھے لیکن یہ معلوم نہیں کونسا مہینہ اور کونسا دن تھا میرا حافظہ ہر معاملہ میں چوکس رہا ہے لیکن سال و تاریخ مجھے اکثر و بیشتر یاد نہیں رہتے بہر حال رہائی کی تاریخ مقرر ہو چکی تھی دو ماہ باقی تھے کہ دوستوں نے دعوتوں کا سلسلہ شروع کر دیا میں روکتا رہا وہ مصر رہے یہ وہ زمانہ تھا جب بنگال میں قحط پڑا تھا قحط پڑا نہیں بلکہ ڈالا گیا تھا۔ آزاد ہند فوج برما تک آپہنچی تھی انگریز خوفزدہ تھے مبادا بنگال ہاتھ سے نکل جائے انہیں بنگال کے نوجوانوں کی جرأت و غیرت کا تجربہ بھی تھا اور اندازہ بھی، ٹیررسٹ موومنٹ کا آغاز بھی یہیں سے ہوا تھا اس بے قابو تحریک کو روکنے کے لیے سکاٹ لینڈ یارڈ سے افسر منگوائے گئے سبھاش بابو کا بنگال پر بے پناہ اثر تھا وہی آزاد ہند فوج کے نیتا تھے اس خطرہ نے حکومت کو بدحواس کر رکھا تھا ـــــ

آزاد ہند فوج بنگال کے دروازے پر کھڑی تھی ظاہر ہے کہ یہ فوج بنگال میں آجاتی اور نیتاجی ساتھ ہوتے تو سارا ہندوستان باغی ہو جاتا انگریزوں کے لیے بھاگ جانے کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہ رہتا دہلی تک تو ہندوستان آن واحد میں انگریزی عملداری سے محروم ہو جاتا۔ لازماً سرحد میں بھی یہی حالات پیدا ہوتے البتہ پنجاب کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے کہ اس وقت کس طرف ہوتا جنگ کا پانسہ اس تیزی سے پلٹا کہ نقشہ ہی بدل گیا لیکن بنگال کو کڑی سزا ملی وہ کسی بغاوت کی تیاری کرنے کے بجائے بھوک مٹانے میں لگ گیا جن کو گولی سے مرنا چاہیئے تھا وہ بھوک سے مرنے لگے اور مر گئے کمیونسٹوں کو معلوم تھا کہ آزاد ہند فوج رنگون تک آپہنچی ہے اور بنگال کا ذہن باغی ہے انہوں نے قحط میں امداد کو تحریک بنالیا حکومت نے ریلیف فنڈ قائم کیا کمیونسٹوں نے بھی اور مہا سبھا کے لیڈر شیام پرشاد مکرجی نے بھی۔ احرار نے بھی امداد کا بیڑہ اُٹھایا اور بنگال پہنچ گئے ہمارے ساتھیوں میں جانے کس کو یہ خیال سوجھا کہ ہمیں آپس میں چندہ کرنا چاہیئے جیل میں روپیہ کہاں؟ بہر حال ایک معقول رقم جمع ہو گئی میرے پاس کل پچاس روپے تھے فنڈ میں دیدیے اب سوال یہ تھا کہ جو رقم جمع ہوئی ہے کہاں بھیجی جائے؟ بیشتر کا خیال تھا کہ حکومت کو بھیجی جائے کمیونسٹ اپنی پارٹی کو بھجوانا چاہتے تھے کانگرس کے راہنما شیام پرشاد مکرجی کو، لیکن کسی ایک پر اتفاق نہ ہوا قحط کی ذمہ دار حکومت تھی شیام پرشاد ہندو مہا سبھائی تھے کمیونسٹوں کو عام ساتھی پیپلز وار کا نعرہ لگانے کی وجہ سے مجرم گردانتے تھے جب اتفاق ہوتا نظر نہ آیا تو میں نے احرار کا نام پیش کیا لیکن سب ناک بھوں چڑھا کر رہ گئے کسی نے کہا احرار اور ہندو مہا سبھا میں کیا فرق ہے؟ دونوں فرقہ وار جماعتیں ہیں اب صحیح یاد نہیں آرہا کہ روپیہ کہاں گیا؟ لیکن میرا خیال ہے کہ یہ روپیہ شیام پرشاد مکرجی ہی کو بھیجا گیا کیونکہ جن لوگوں نے کثیر رقمیں

دی تھیں ___ اُن کا ذہنی جھکاؤ اسی طرف تھا اور وہ باطناً انہی کے حق میں تھے۔

میری دو اعی دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو مَیں نے ساتھیوں پر زور دیا کہ رقم اکٹھی کر کے بنگال ریلیف فنڈ میں دے دیں کوئی نہ مانا ہر کوئی دعوت میں لگ گیا رگھونندن سرن نے تجویز کی کہ رہائی پر روپوں ایک تھیلی نذر کی جائے خود پانچہزار روپے کی پیشکش کی پر بودھ تو پہلے ہی پیش پیش تھا دس ہزار روپے جمع ہونے کا امکان تھا میرے علم میں بات آئی تو مَیں نے سختی سے روک دیا۔ "معاف کیجئے! مَیں قید کی قیمت وصول کرنے نہیں آیا کسی اور ساتھی پر یہ طبع آزمائی کیجئے"

رگھونندن جی میری اسی قلندری سے خوش تھے اور خوب جانتے تھے کہ اب جو نہ ہوئی ہے تو ہاں نہیں ہو گی۔

سب سے پہلے خاکساروں نے دعوت دی اکبر اور یوسف دونوں میزبان تھے تمام ساتھی عش عش کر اُٹھے دوسری دعوت مولانا داؤد غزنویؒ نے کی اُن کے گھر سے کھانا پک کے آیا۔ تیسری دعوت سردار گلاب سنگھ نے، چوتھی یامین ڈار نے، پانچویں کلبیر سنگھ نے، چھٹی رگھونندن سرن نے، ساتویں دیوان چمن لال نے، آٹھویں چودہری عبدالستار نے اور آخری دعوت پر بودھ نے، یہ تمام ضیافتیں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کے تھیں انفرادی سلسلہ ختم ہو گیا تو اجتماعی دعوتوں کا دور چلا۔ کانگرس گروپ نے دعوت کی سوشلسٹ گروپ نے مدعو کیا کمیونسٹ گروپ نے لنچ دیا ٹرسٹ گروپ نے ڈنر اور آخر میں ہانگ کانگ کے قیدیوں نے، یہ ایک ایسا سلسلہ تھا جو رکتا ہی نہ تھا پر بودھ نے سب کو مات کر دیا اس نے شاہی دسترخوان بچھایا سب سے آخری دعوت جو میری رہائی کے دن ہوئی وہ تمام پولیٹیکل قیدیوں کا ڈنر تھا اگلے دن مَیں

رہا ہو گیا۔ پربودھ نے تقریر کرتے ہوئے کہا ـــــــ

"شورش ایک بہادر دوست اور بہادر دشمن ہے۔"

اور دوستوں نے بھی اپنے مخلصانہ جذبات کا اظہار کیا مولانا داؤد غزنوی نے تقریر کرتے ہوئے کہا ـــــــ

"قربانی و ایثار کے ان شدائد میں ہندو و مسلمان کی تفریق غلط ہے لیکن اس غلط خیال کو باطل کرنے کے لیے کہ مسلمانوں میں جگر دار نوجوان نہیں ہیں، مَیں شورش کا نام فخر سے پیش کر سکتا ہوں شورش نے پانچ سالہ قید دلیرانہ روایات کے ساتھ گذار کے نہ صرف اپنے مؤقف کی لاج رکھی ہے بلکہ ہمارا سر بھی اونچا کر دیا ہے۔"

یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز تھا کہ میرے بزرگوں اور ساتھیوں نے مجھے اس تعریف کا مستحق سمجھا۔

رہا ہونے والے قیدی کی نفسیات آخری ہفتہ عشرہ میں عجیب وغریب ہوتی ہیں کئی قسم کے خیالات دماغ میں آتے اور چلے جاتے ہیں محسوس یہ ہوتا ہے کہ جیسے یہ گھڑیاں طویل ہو گئی ہیں جانے کل کیا واقعہ پیش آ رہا ہے؟ تعین کے باوجود رہائی کا تیقن نہیں ہوتا۔ انسان خیالات کی زنجیروں میں جکڑا ہوا سوچتا ہے کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ خواب تو نہیں ایک ایک گھڑی پہاڑ ہو جاتی ہے۔

پانچ سال بہر حال کٹ گئے منٹگمری میں قیامت کے دن تھے معلوم ہوتا تھا کہ زندگی چند روز کی مہمان ہے کسی وقت سناؤنی آ سکتی ہے لاہور میں دماغ کا علیش میسر آ گیا لیکن

انسان ہر حال میں محشر خیال ہے اضطراب ساتھ ساتھ رہا جب تک بے چینی اور بے قراری نہ ہو دل ٹھہرتا ہی نہیں ہجر جا چکا اور وصال کے لمحے بالکل ہی قریب بلکہ سامنے کھڑے تھے اب جس گھڑی کا انتظار تھا اس میں صرف ایک رات حائل تھی لیکن وہ رات پانچسال کی راتوں کا خلاصہ ہو گئی۔ دل کے معاملات کا حال یہ تھا جیسے رہائی کا خواب دیکھ رہا ہوں۔ جس محبوب کا انتظار ہے وہ ایشیائی ہے اور ایشیائی محبوب کے وعدے عموماً پورے نہیں ہوتے وصال کے لمحات قریب ہوں تو فراق کی راتیں اور بھی طویل ہو جاتی ہیں۔ رہائی اور اضطراب دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے میں اپنے ساتھیوں کا سرخیل تھا وہ محسوس کر رہے تھے کہ جیسے کسی خلا کا شکار ہو رہے ہیں اور یہ ایک قدرتی بات تھی پانچ سال کا عرصہ ایک لمبی مدت ہے قید ہوا تو دوستوں کا دل ڈوبا جا رہا تھا کب رہائی ہو گی؟ دوبارہ ملیں گے بھی یا نہیں؟ ان حالات میں وسوسے عام ہوتے ہیں۔ میرے دوست بھی آخر انسان ہی تھے انسان بڑا با اختیار ہے انسان بڑا بے بس ہے جن عزیزوں کو یہ فکر تھا کہ اب شاید ہی ملاقات ہو آج وہی استقبال کی تیاریاں کر رہے تھے۔

آخر وہ صبح آ ہی گئی کہ جس صبح کو رہا ہونا تھا سب سے پہلے خاکساروں نے ٹرسٹ وارڈ کے دروازہ پر آکر سلامی دی۔ اکبر اور یوسف دونوں آبدیدہ ہو گئے اکبر اس طرح رو رہا تھا جیسے کوئی بچہ بلک بلک کے روتا ہوا اخلاقی قیدیوں کا ایک انبوہ ہو گیا جب کبھی انہیں کوئی مشکل پیش آتی میں اُن کے کام آتا اکثر خوش تھے کہ میں رہا ہو رہا ہوں اکثر مغموم تھے کہ وہ ایک دوست یا سرپرست سے محروم ہو رہے ہیں یہ ان کے تعلق خاطر کا احساس تھا میں نے ایک ایک سے معانقہ کیا ہر شخص اُداس بھی تھا اور خوش بھی۔ اداس اس لیے کہ اُن کی محفل سے ایک ایسا ساتھی جا رہا ہے جو ان کی آزردگیوں اور خوشیوں کا ساتھی تھا اور

خوش اس لیے کہ بہر حال ایک ساتھی کی رہائی ہو رہی تھی جس رہائی کے وہ خود بھی منتظر تھے۔ کئی ایک کے آنسو آ گئے میں خود ڈیوڑھی تک اشکبار رہا پلٹ کر ٹیرسٹ وارڈ پر نگاہ ڈالی اور ساتھیوں کو بھرپور سلام کہا پھر وارڈ کی دیواروں کو نگاہوں سے بوسہ دیا پہلا سیاہ پھاٹک کھلا اور بند ہو گیا جن دیوہیکل کالے پھاٹکوں نے وصول کیا تھا وہی بہ اغذ رسید واپس کر رہے تھے ان سیاہ پھاٹکوں کے آہنی تختوں پر ان گنت حسرتوں کا اظہار تھا سید امیر شاہ جا چکے تھے اُن کی جگہ کوئی اور صاحب جیلر تھے انہوں نے مبارک باد دی میجر حبیب اللہ شاہ سے مل کر باہر نکلا تو سلاخوں کے باہر دوستوں کا ایک ہجوم کھڑا تھا ہر ایک نے ہاتھ ہلا ہلا کر خوشی کا اظہار کیا۔ رہائی کے کاغذات مکمل ہو گئے تو سی آئی ڈی کے ایک سب انسپکٹر سید اعجاز حسین شاہ اپنے ایک اسسٹنٹ شیخ نذیر احمد کے ہمراہ نمودار ہو گئے انہوں نے ہوم سیکرٹری کی طرف سے ایک حکمنامہ دیا جس میں درج تھا کہ گورنر پنجاب مفاد عامہ کے پیش نظر محسوس کرتے ہیں کہ شورش کاشمیری کو ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت پیسہ اخبار پولیس اسٹیشن کی حدود میں تا حکم ثانی نظر بند رکھا جائے اس دوران میں نہ وہ ان حدود سے باہر جا سکتے ہیں نہ پانچ سے زائد آدمیوں میں بیٹھ سکتے ہیں نہ کسی سیاسی گفتگو میں حصہ لے سکتے ہیں تحریر و تقریر دونوں ممنوع ——

یہ گویا دوسری قید کا آغاز تھا لیکن اس کا اطلاق اور آغاز چوبیس گھنٹے بعد ہوتا تھا — اس نظر بندی کا ذلیل پہلو یہ تھا کہ ہر ایتوار کو پرانی انار کلی کے تھانے میں حاضر ہو کر رپورٹ لکھوانے کا حکم دیا گیا تھا بہر حال —— ؏

وادیٔ عشق میں ایسے بھی مقام آتے ہیں

میں یہ آرڈر لے کر باہر نکلا تو احباب نے ہاروں سے لاد دیا۔ اندر اور باہر کی فضا

ایک لحظہ کے لیے زندہ باد سے گونج اُٹھی دوستوں کا حال یہ تھا کہ رخساروں پر موتی ڈھلک رہے تھے اِدھر خاکسار بھوٹ بھوٹ کر رونے لگے پر بودھ آبدیدہ ہو گیا چودہری عبدالستار کی ہچکی بندھ گئی ان ساتھیوں کو چھوڑتے وقت میرے دل میں ایک کسک ضرور تھی لیکن زندگی طلوع و غروب کے انہی سلسلوں کا نام ہے۔ مَیں نے ایک لحظہ کے لیے جیل کے سیاہ پھاٹکوں کو مڑ کے دیکھا تو وہ بند ہو چکے تھے لیکن ان پھاٹکوں کی ڈراؤنی آنکھیں گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں مَیں نہیں کہہ سکتا کہ اس تعاقب سے ان کا منشاء کیا تھا لیکن محسوس ہوتا تھا جیسے انہیں بھی میری پانچسالہ جوانی کے کھا جانے کا قلق ہے وہ شرمارہی ہیں۔

رہائی کے بعد نظر بندی

جیل سے نکلتے ہی احباب کے ساتھ سیدھا چودہری افضل حقؒ کے مزار پر پہنچا فاتحہ پڑھی دیر تک ان کی یاد میں آبدیدہ رہا وہاں سے ہمشیرہ کے ہاں گیا معلوم ہوا مستری شمس دین نے میرے لیے پیسہ اخبار کے نکڑ پر ایک بیٹھک کرایہ پر لی ہے۔ جو ٹیررسٹ وارڈ کے ڈربوں (cells) کی طرح ہے اس میں بمشکل ایک چارپائی اور دو کرسیاں بچھ سکتی تھیں سامان ہی کیا تھا وصندوق چند کتابیں کھانے پینے کے دو چار برتن! خیر تھوڑی دیر ہمشیرہ کے ہاں ٹھہرا۔ پھر مولانا ظفر علی خاں سے ملنے دفتر زمیندار چلا گیا بڑے تپاک سے ملے معانقہ فرمایا دعائیں دیتے رہے ان کا سیاسی راستہ میرے سیاسی راستے سے مختلف تھا اور اب تو وہ ایک مدت سے سیاسیات ہی چھوڑ چکے تھے لیکن اس کے باوجود ایک تحریک اور ایک ادارہ تھے۔ اظہر امرتسری، اختر علی خاں حاجی لق لق اور حسنِ اتفاق سے مولانا عبدالمجید سالکؔ بھی وہاں فروکش تھے ان سے مشفقانہ

الفاظ میں ذکر کرتے رہے ان کے لیے شعر کہنا مشکل نہ تھا ہم لوگ اتنی عجلت سے بات نہیں کر پاتے جتنی جلدی وہ شعر کہہ لیتے تھے حقہ کی نے منہ میں، انگوٹھے پر انگلی، دائرہ سا بنا اور کھٹ سے شعر ہو گیا اب جو ایک شعر ہوا تو دوسرا متعاقب تھا فرمایا "کیسے کٹی؟" عرض کیا "تین برس منٹگمری سنٹرل جیل میں اسی جگہ رہا ہوں جہاں آپ نے پانچ سال کاٹے تھے" ایکا ایکی کسی خیال میں کھو گئے پھر سکوت توڑتے ہوئے کہا تو ہاں! ذرا لکھو ؎

لائی ہے خبر حلقہ یاراں میں صبا آج
شورش ہوا زندانِ حکومت سے رہا آج
اُڑنے لگا احرار کی جرأت کا پھریرا
آنے لگی آزادیٔ کامل کی صدا آج
طائر ہیں نوا سنج خطابت کے چمن میں
الفاظ و مطالب کو نیا رنگ ملا آج
لگتا ہے کنارے پہ دعاؤں کا سفینہ
پہنچی ہے سرِ عرشِ بریں، آہ رسا آج
اب ایسی حکومت سے کوئی شخص کہے، خاک
زنداں سے نکالا تو نظر بند کیا آج

یہی حوصلہ افزائیاں تھیں جس سے دل باغ باغ ہوتا تھا مولانا سے مل کر میں سیدھا دفتر احرار پہنچا وہاں بہت سے احباب جمع تھے دو چار گھنٹے وہاں رہا پھر اپنے ہاں چلا آیا رات بھر دوستوں کا مجمع رہا صبح نو بجے چوبیس گھنٹے ختم ہو گئے نظر بندی شروع ہوئی سی آئی ڈی کا نگران کنسٹیبل سامنے مشرقی ہوٹل میں بیٹھا رہتا کبھی کبھی پیسہ اخبار پولیس اسٹیشن

کا تھانیدار بھی آ جاتا جو شخص ملنے آتا اُس کا اِدھر اُدھر سے نام اور پتہ پوچھا جاتا پتہ چل گیا تو ٹھیک ورنہ حلیہ ہی سہی کئی ماہ یہی معمول رہا نہ جانے کتنے کاغذ سیاہ ہو گئے پھر یہ ڈیوٹی پیسہ اخبار کے معززین نے سنبھال لی ان کے منشی مصدی جس کسی کو آتا جاتا دیکھتے رپورٹ کر دیتے نگران صبح و شام پھیرا ڈال جاتا سید اعجاز حسین شاہ اُس زمانے میں سی آئی ڈی میں مسلم سکیشن کے انچارج سب انسپکٹر تھے۔ اب اُن کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ عام پولیس آفیسروں سے مختلف تھے ان میں ایک انسان بسا ہوا تھا صوبہ کا ہر پولیٹیکل قیدی جس کا ان سے واسطہ پڑا اُن کا مداح ہو گیا۔ جب ان کا انتقال ہوا تو سرکاری حلقوں کے علاوہ مقامی سیاسی حلقوں میں بھی اُن کی موت کو محسوس کیا گیا وہ ایک با اخلاق اور شریفانہ خو بو کے انسان تھے فرائض اور اخلاق دونوں کو ہاتھ میں رکھتے اور کبھی کسی کی دل آزاری کا باعث نہ ہوتے وہ اپنے ساتھیوں کی طرح نہ تھے جو لاہور کے شاہی قلعہ میں پولیٹیکل قیدیوں کی کھال کھینچنا گئی کٹی نفلوں کا ثواب سمجھتے تھے شاہ صاحب کا معمول تھا کہ گاہے ماہے میرے ہاں چلے آتے اصلاً وہ مولانا مظہر علی اظہر کے دوست تھے انہی کی معرفت میرے شناسا ہوئے اور شناسائی کا رشتہ مرتے دم تک مجروح نہ ہونے دیا بڑے خوش گفتار تھے جب کوئی غلط سلط رپورٹ آتی خود ہی تصحیح کر دیتے یا کسی حوالہ کے ضمن میں کوئی افسر کچھ پوچھتا تو ماتحتوں پر بھروسہ نہ کرتے بلکہ ڈائریکٹ دریافت کر لیتے وہ اعزازی مخبروں کی رپورٹوں کے بالکل قائل نہ تھے ——— ایک روز مجھ سے کہنے لگے "سپرنٹنڈنٹ نے پوچھا تھا شورش کا گذارہ کیسے ہوتا ہے؟ میں نے کہا احباب مدد کرتے ہوں گے؟ کہنے لگا ان کے نام معلوم ہونے چاہئیں۔ کہا جماعت احرار مدد کرتی ہے رپورٹ لی گئی تو پتہ چلا کہ مجلس احرار کے تنخواہ داروں کی فہرست میں شورش کا نام ہی نہیں ہے اور نہ

وہ اس سے کوئی مشاہرہ یا الاؤنس لیتے ہیں۔ ——————

——— سپرنٹنڈنٹ مصر تھا کہ ان لوگوں کا پتہ لگانا چاہیئے جو امداد کرتے ہیں۔

——— تو پھر آپ نے کیا لکھا شاہ صاحب! میں نے پوچھا

"فضول سوال تھا لکھ آیا ہوں کہ کرنال شاپ انار کلی کے مالک شیخ عبدالمالک امداد کرتے ہیں۔" مجھے بے اختیار ہنسی آئی اور غصہ بھی کہ سی آئی ڈی کا محکمہ ہے کیا؟ کیا اس کی گذر بسر جھوٹی رپورٹوں اور خود ساختہ جوابوں پر ہوتی ہے عجیب محکمہ ہے کہ انسان کے رزق پر بھی نگاہ رکھتا ہے۔

شیخ عبدالمالک اور ان کے بھائی شیخ عبدالواحد میرے ذاتی دوست ضرور تھے لیکن وہ میری امداد کرتے یا میں ان سے امداد کا خواہاں ہوتا دونوں غلط تھے نہ انہیں یہ حوصلہ ہو سکتا تھا نہ میں یہ گوارا کر سکتا تھا یہ ضرور ہے کہ بعض دوستوں نے اس اثنا میں میری مدد کی لیکن وہ احرار کے معاون یا ہمدرد تھے اور میرے ساتھ ان کے اخلاص کا ایک طبعی رشتہ تھا مثلاً مستری شمس الدین تھے جو ہر ماہ بیٹھک کا کرایہ ادا کرتے تھے ملک محمد حیات تھے جنہوں نے دو چار دفعہ میری ضرورتوں کا احترام کیا۔ چائنہ مارٹ انار کلی لاہور کے مالک عبدالقادر چشتی تھے آپ نے ایک آدھ مشکل میں میرا ہاتھ بٹایا۔ یا پھر ان میں سرفہرست اچھرہ لاہور کے رئیس میاں قمرالدین (علیہ الرحمۃ) تھے جو گاہے ماہے میری امداد کرتے رہے میں کسی موڑ پر کسی شخص سے اعانت کا خواہاں نہ تھا یہ لوگ اپنے طور پر میرا ہاتھ بٹاتے رہے ایک بے لبسی تھی سال بھر رہی اور ختم ہو گئی کھانا ہمشیرہ کے ہاں سے آجاتا کچھ لکھنا پڑھنا بھی شروع کر دیا تھا اس سے کچھ روپے مل جاتے جو عام ضرورتوں کے کام آتے یہ تھا کھلی نظر بندی کے سفر کا آغاز۔

جانگداز المیہ

پہلا صدمہ جس سے دوچار ہونا پڑا وہ خورشید کا انتقال تھا اس کا قاتل مَیں ہی تھا وہ کبھی نہ مرتی لیکن مجھ پر قربان ہوگئی رہائی تک معلوم نہ ہو سکا کہ وہ مر چکی ہے۔ مسعود نے جیل کے دروازہ پر صرف اتنا کہا کہ وہ لاچار ہو کر گجرات چلی گئی تھی۔ وہاں زیر علاج ہے کل ہی اس کی والدہ کا خط آیا تھا کہ صبح لاہور آجائے گی —— دوسرے دن مسعود نے بتایا کہ خورشید کو فوت ہوئے سال ہو چکا ہے تپدق کی مار کھا کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی ہے اس کی چھوٹی بہن ثریا نے بتایا کہ وہ مرتے دم تک آپکو یاد کرتی رہی اُس نے مسعود بھائی سے بار بار تقاضا کیا کہ ایک دن کے لیے آغا جی کو لے آؤ۔ مَیں اللہ کے ہاں جارہی ہوں وہ پیرول پر نہیں آسکتے۔ لیکن اس پگلی کے علم میں نہ تھا کہ پیرول ہر کہ ومہ کے لیے نہیں اعلیٰ خاندانوں کے لیے تھا اس سے شورش نہیں گوپی چند یا افتخار الدین متمتع ہو سکتے تھے۔ میرا دل آزردہ ہو گیا میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ نکلے۔ دیر تک ملول رہا جی ذرا ہلکا ہوا تو مَیں نے مسعود سے کہا آؤ اس کی قبر پر چلیں یونیورسٹی گراؤنڈ کے نزدیک نگران کانسٹیبل نے روکا آپ کے حدود یہاں ختم ہو جاتے ہیں۔ اس سے آگے مزنگ کے تھانے کا علاقہ ہے۔

"تو کیا مَیں اس کے آگے نہیں جا سکتا؟"

"جی نہیں۔ انار کلی تھانہ کی حدیں یہاں ختم ہو جاتی ہیں۔"

"اور اگر مَیں جانا چاہوں؟"

آپ کی مرضی ہے لیکن قانون شکنی ہو جائے گی۔"

"کسی عزیز یا عزیزہ کی قبر پر بھی نہیں جاسکتا؟"

"نظر بندی کی حدیں یہاں تک ہیں۔"

ثریا مسعود اور میں کھڑے کھڑے دیر تک سوچتے رہے ثریا نے کہا ——

"بھائی جان۔ نظر بندی توڑنے کا مطلب ہے آپ دوبارہ جیل چلے جائیں۔ اس سے فائدہ؟ آیئے واپس چلتے ہیں۔"

"اچھا تم جاؤ اور یہ پھول اس جان ہار کی تربت پر چڑھا آؤ۔ میں نے ثریا سے کہا اور ہاں! مسعود تم میری طرف سے فاتحہ پڑھنا اور کہنا —— تم نے بہت جلدی کی —— تم لوگ جب تک واپس نہیں آتے میں یہیں کھڑا ہوں ——"

ثریا اور مسعود چلے گئے میں جین مندر کے پاس کھڑا سوچتا رہا محبت حدبیان سے ماوریٰ ہے اُس وقت اور بھی اندوہگیں ہو جاتی ہے جب ادھوری رہ جائے اس کا قلق اس وقت اور بڑھ جاتا ہے جب حسن قضا کی زد میں آکر جوانمرگ ہو جائے اور عشق جاں ہار! خورشید جیسی لڑکیاں عشق کی معراج ہوتی ہیں اُس نے مجھ سے بے پناہ محبت کی حتیٰ کہ فنا ہو گئی خود بوئے گل تھی اپنے پیچھے نالہ دل چھوڑ گئی۔ اس شمع کی یاد ہر اداس رات کو جگمگا اٹھتی ہے وہ ایک ناکام محبت تھی؟ اصلاً وہی کامیاب رہی اس نے جان دے کر وفا کی آبرو رکھی اور ثابت کیا کہ عورت کی پہلی محبت ہی اس کی آخری محبت ہوتی ہے میرے سامنے اس وقت بھی اس کی تصویر ہے میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ میرے ساتھ شملہ پہاڑی کی ٹہنیوں کے سائے میں بیٹھی وفا کا عہد کر رہی ہے لارنس گارڈن کی شاخوں میں اس کی مسکراہٹیں ابھی تک پھول بن کر کھلی ہوئی ہیں شاہی مسجد کے میناروں کی سلیں اس کے سرخ رخساروں کی آگ سے دہک رہی ہیں راوی اُسی کے گیت

الاپ رہا ہے بارہ دری نے اس کی گمشدہ یادوں کے تصور سے پریشان ہو کر اپنا سر جھکا لیا ہے وہ لوٹ سکتی تو اس کو ضرور منا لاتا۔ عورت جلد ہی من جاتی ہے وہ تاخیر سے روٹھتی اور تعجیل سے منتی ہے لیکن اُسے موت کھا گئی زندہ ہو سکتی تو میں اُس سے ضرور پوچھتا خورشید کیوں روٹھ گئی ہو؟ چلی آؤ گھڑی دو گھڑی ہی کے لیے آ جاؤ۔ ناراضی کی وجہ؟ اچھا میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں نے سیاسیات ترک کر دی ہیں اب میں بازی گروں کے اس ناٹک میں نہیں۔" پہلے دنیا تماشا تھی اور ہم تماشائی۔ اب ہم تماشا ہیں اور دنیا تماشائی" عبرت کے ورق کھلے پڑے ہیں چل پھر رہے ہیں ایک نظر انہیں دیکھ لو"——— لیکن یہ الفاظ کی مینا کاری ہے کبھی لفظوں نے بھی موت کا رُخ موڑا ہے کبھی نوحے بھی مشیت کے فیصلوں کو بدلنے پر قادر ہوئے ہیں انسان کے آنسوؤں میں جان ہار کے لیے آبِ حیات کی ایک بوند بھی نہیں۔ انسان اضافی چیزوں پر مرتا اور اِن چیزوں کی خواہش کرتا ہے جو ناممکن ہوں خورشید مر گئی وہ وفا کی اس سرگذشت ہی کے لیے پیدا ہوئی تھی تاہم وہ زندۂ جاوید ہے دل کے افق پر اس کا نام خورشید ہی کی طرح چمک دمک رہا ہے۔

ثریا اور مسعود فاتحہ پڑھ کر لوٹے تو گھر تک اُسی کا تذکرہ رہا حتیٰ کہ پوری رات بیت گئی اس کے یادگار خطوط شیر سنگھ ڈکار چکا یا سی آئی ڈی کھا گئی تھی لیکن یہ تحریریں جذبات کے جواہر پارے تھے۔ قبیلۂ مجنوں میں سے کوئی ہوتا تو ان خطوط کے مافی الضمیر کو سمجھتا یہ متاع ان لوگوں کے ہاتھ آگئی جو پیٹ سے سوچتے اور ہاتھ سے بولتے تھے جن کے لغت میں عشق کا نام گناہ اور گناہ کا نام عشق ہے۔

ایامِ نظر بندی

ایامِ نظر بندی میں دوستوں کا ایک نیا حلقہ پیدا ہو گیا قریب ہی لا کالج اور اُس کا

ہوسٹل تھا کئی طلبہ دوست بن گئے کچھ سیاسی مزاج کے اور کچھ ادبی مزاج کے۔ ع

میری دونوں سے آشنائی ہے

گوپال متل خود انسٹ تھے لیکن نوائے وقت کے ادارۂ تحریر میں تھے انہی کی معرفت ساحر لدھیانوی سے تعارف ہوا ساحر لدھیانہ سے آتے تو لا کالج کے ہوسٹل میں رام پرکاش اشک کے ہاں ٹھہرتے کبھی کبھار میرے ہاں ٹک جاتے اشک راولپنڈی کے رہنے والے ایک مخلص نوجوان[1] تھے۔ تقی الدین پال اور غلام مرتضیٰ سے بھی اسی زمانہ میں دوستی ہوئی دونوں علم و ادب میں گہری بصیرت رکھتے تھے دن بھر اُن سے ہر موضوع پر گفتگو رہتی روکھی پھیکی کھا کے اِدھر اُدھر کی بحث میں لگے رہتے کبھی مشرقی ہوٹل کی تنوری روٹیاں توڑی جاتیں کبھی چٹنی بنا کر پھلکے اڑائے جاتے کلبیر سنگھ رہا ہو گئے تو انہوں نے بھی اسی بیٹھک کو دن بھر کی نشست گاہ بنا لیا اب دوہری تہری رونق ہو گئی سی آئی ڈی کا نگران سٹاف بڑھ گیا اختر شیرانی بھی دوسرے تیسرے روز آ براجتے اور مطالبہ کرتے کہ —— ع

شراب لا مری حالت خراب ہے ساقی

ہم لوگ صوفی صافی تھے اختر شراب پینے میں لا شریک، ہم سے چھینا جھپٹی کر کے پیسے لے جاتے سرِ عام پیتے پلاتے ہمیں اس سے ایک خاص فائدہ پہنچا کہ سی آئی ڈی کا شبہ ہلکا ہو گیا انہیں معلوم ہو گیا کہ یہ ایک دوستانہ مجلس ہے جس میں اختر شیرانی سا شرابی اور کلبیر سنگھ سا انقلابی دونوں جمع ہوتے اور ان کی گفتگو گپ بازی تک رہتی ہے جب بیٹھک

---

[1] حال ہی میں سرطان کے مرض سے امریکہ میں اُن کا انتقال ہو گیا ہے۔

سے دل اکتا جاتا تو ہم لا کالج کے ہوسٹل میں چلے جاتے اور وہاں منڈلی لگاتے اس کے باوجود سی آئی ڈی ہماری یہ نشستیں ہضم نہ کر سکی اُس نے لا کالج کے پرنسپل کو شکایت کی اُس نے نوٹس ہی نہ لیا۔ کلبیر سنگھ اس فکر میں تھا کچھ ہونا چاہیئے یہ "کچھ ہونا چاہیئے" میرے میرے نزدیک کسی لحاظ سے بھی مفید نہ تھا میں نے کلبیر سے کہا کہ اول تو جنگ اتحادیوں کے حق میں ہو گئی ہے دوم اس مرحلہ میں مار دھاڑ قسم کا پروگرام خودکشی کے مترادف ہے سوم میں تشدد کا مطلقاً حامی نہیں اور نہ سیاسیات میں خفیہ کارروائیوں کو درست سمجھتا ہوں چہارم میرے نزدیک قومی تحریکوں میں عدم تشدد سے بہتر کوئی ہتھیار نہیں مجھے اپنے پروگرام سے خارج کر دیجئے کلبیر سنگھ کچھ کرنے کے حق میں سوچتا اور مسلسل سوچتا تھا ایک دن وہ دو پستول لایا اور کہا کہ انہیں اپنے پاس رکھو میں نے کہا یہاں رکھنا مصیبت کا باعث ہو گا پولیس ذرہ ذرہ سے باخبر ہے اُس نے کہا میں بھی گھر میں نہیں رکھ سکتا سوچنے پر شمس العلماء مولانا تاجور نجیب آبادی کا نام ذہن میں آیا مولانا ـــــــ چونی لال کاوش کے ہمراہ اکثر میرے ہاں آتے تھے۔ کلبیر سنگھ سے بھی انہیں لگاؤ تھا میں نے کلبیر سے کہا آؤ تاجور کے ہاں چلتے ہیں نظر بندی مانع تھی کیونکہ میں اپنے حدود سے باہر جا ہی نہیں سکتا تھا علامہ تاجور موجودہ اورینٹ ہوٹل (چوک قلعہ گوجر سنگھ) کے عقب میں فلیمنگ روڈ پر رہتے تھے میں نے کلبیر سے کہا تم تانگہ میں چلو اور گلی کے نکڑ پر پہنچ جاؤ لیکن ان گلیوں سے اس طرح نکلو کہ نگران کی نگاہ نہ پڑے میں شریف خالد کو ساتھ لے کر نکلتا اور بیچ بچا کر پہنچتا ہوں۔ میں نے حلیہ بدلا اور خالد کی سائیکل پر سوار ہو کر علامہ کے ہاں پہنچ گیا دروازہ کھٹکھٹایا تو معلوم ہوا کہ گھر میں نہیں ہیں کاوش موجود تھا دیکھا تو حیران رہ گیا "بڑی جسارت کی ہے" کاوش نے کہا اور اندر لے گیا مولانا رات بارہ بجے

تک لاپتہ رہے ہم ان کا لحاف لے کر فرش پر لیٹے رہے کوئی سوا بارہ بجے مولانا تشریف لائے انہیں بھی حیرت ہوئی کہ ہم اور یہاں ؟ پھر اس وقت ؟ کچوکا دے کر کہنے لگے "پکڑے جاؤ تو پھر کیا ہو ؟"

"کچھ بھی نہیں" میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا" اور جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ہم اُن کے پاس اپنے دو پستول رکھنے آئے ہیں تو ایک لحظہ کے لیے سہم گئے۔

"اچھا تو کیا مجھے جیل بھجوانے کی سوجھی ہے ؟"

"جی ہاں - ارادہ تو کچھ ایسا ہی ہے"۔

"بھئی سی آئی ڈی کے فلاں سپرنٹنڈنٹ نے بلوایا تھا وہیں سے آ رہا ہوں تمہارا ذکر کرتے رہے میرے متعلق رپورٹ ہوتی ہے کہ میں تمہارے ہاں آتا جاتا اور وہاں کلبیر سنگھ سے باہمی مشورے ہوتے ہیں انہوں نے مجھے تمہاری اور کلبیر سنگھ کی خبروں سے آگاہ رکھنے کے لیے پانچ سو روپے ماہانہ کی پیشکش کی ہے"۔

"مولانا روپیہ نہ چھوڑیئے موذیوں کا مال ہے یہ ہم بتا دیا کریں گے کہ آپ رپورٹ کیا کریں"۔

"تو قید ہونے کا ارادہ ہے ؟"

گھنٹہ آدھ گھنٹہ گپ شپ رہی آخر یہ دونو پستول مولانا کے پاس رکھ کر ہم اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے پیسہ اخبار میں اس وقت تحریک رفاقت کے معتمد کی تحقیق کا قمقمہ جاگ رہا نگران اونگھ رہا تھا یا پھر سڑک پر کُتے بھونک رہے تھے میں شپاشپ سیڑھیوں کو چیرتا پھاڑتا بیٹھک میں آگیا دروازہ چوپٹ کھُلا تھا اور کوئی غیبی طاقت میرے تمام مسودات اٹھا کر لے جا چکی تھی۔

اگلے روز کلبیر نہ آیا تو تشویش ہوئی شاہ نور سٹوڈیو کے پاس اُس کی کوٹھی تھی جائے کون ؟ تاجور صاحب کا پیغام ملا کہ اپنے دونوں "مسودات" لے جاؤ میں نے نظر ثانی کر لی ہے ان کا خوف بھی جائز تھا وہ بھلا پستول کیسے رکھ سکتے تھے شام کو پتہ چلا کہ کلبیر سنگھ صبح تین بجے گرفتار کر لیے گئے اور اس وقت پیسہ اخبار کے تھانے میں ہیں پولیس کا خیال تھا کہ ہم ان کا پیچھا کریں گے شاید کچھ ہاتھ آجائے ہم نے چپ سادھ لی دوسرے تیسرے روز کلبیر سنگھ لاہور سنٹرل جیل میں چلا گیا اسکی گرفتاری نے ہمیں چونکا دیا پتہ نہ چلا ہوا کیا ہے ؟ حکومت نے ایک صراحتی بیان میں کہا کہ کلبیر سنگھ کو بیماری کی بناء پر چھوڑا گیا تھا اور یقین تھا کہ وہ اپنی سرگرمیاں علاج معالجے تک محدود رکھیں گے لیکن انہوں نے مفاد عامہ کے خلاف بعض ایسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا کہ انہیں اس طرح کھلا چھوڑنا ملکی دفاع کے خلاف تھا لہذا انہیں واپس جیل بھیج دیا گیا ہے۔

اس کا ایک فوری نتیجہ یہ نکلا کہ اختر شیرانی کا نشہ ہرن ہو گیا۔ لا کالج کے دوستوں نے کچھ دن کے لیے آنا جانا ترک کر دیا۔ سی آئی ڈی کے نگران سٹاف کا پہرہ تیز ہو گیا۔ دنوں تک یہ خدشہ رہا کہ حکومت شاید مجھے بھی گرفتار کر لے گی لیکن بلا ٹلی ہی رہی علامہ تاجور ایک دن بیگ اٹھائے ہانپتے کانپتے آنکلے فرمایا

"کیسے ہو ؟"

"دعا ہے آپ کی"

"میاں یہ حرامی بچے میرے ہاں چھوڑ آئے ہو ان کی ماں کے ہاں پہنچاؤ۔ اس بڑھاپے میں قید ہو گیا تو نعش ہی باہر نکلے گی۔"

"لیکن مولانا! گلبیر تو قید ہو گئے ہیں؟"

"تو مَیں انہیں کہاں رکھوں؟"

"آپ ایسا کیجئے کہ ان دونوں بچوں کو راوی میں بہا دیجئے سب خدشے ڈوب جائیں گے۔" اور کوئی چارہ کار بھی نہ تھا مولانا نے راوی سے واپس آ کر شکرانہ پڑھا اور سو گئے۔

نظر بندی تو خیر تھی ہی۔ زبان بندی بھی سمجھ میں آتی تھی لیکن قلم بندی سمجھ میں نہ آئی طبیعت لہرانے لگی تو اسرار بصری کے قلمی نام سے لکھنے لگا "زمزم" لاہور "الہلال" بمبئی اور "احرار" سہارنپور سیاسی طور پر ہم زلف اور ہم خیال اخبار تھے ان تینوں میں لکھتا رہا پابندیاں ختم ہوئیں تو اسرار بصری مستقل شعری نام ہو چکا تھا۔

نظر بندی کی وجہ کیا تھی خود میرے لیے معمہ تھا تقریباً سبھی احرار زعما۔ ان پابندیوں سے مستثنیٰ تھے مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی دھرم سالہ جیل میں تھے بایں تھا جسے پانچ سالہ قید کے بعد بھی نظر بند رکھا گیا چودھری افضل حق کی وفات کے بعد مولانا مظہر علی اظہر قائدِ احرار کہلانے لگے انہوں نے ملک خضر حیات ٹوانہ کے ساتھ رشتہ موالست استوار کر لیا لیکن بے سود اور بے بیکار، نہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رہا ہوتے نہ میری نظر بندی کا ٹنٹا ختم ہوا۔ ایک دن اچانک ہی یہ خبر آ گئی کہ مولانا محمد گل شیر کو سوتے وقت گولی مار کر شہید کر دیا گیا ہے۔ زمیندار نے اس خبر کو پہلے صفحہ پر شہ سرخی دے کر شائع کیا۔ مسلم لیگ کے صوبائی زعماء نے ملزموں کی گرفتاری اور قرار واقعی سزا کا مطالبہ کیا لیکن مولانا مظہر علی اظہر جو مولانا کی شہادت کے صدمے کو بُری طرح محسوس کرتے تھے ملک خضر حیات سے یہ کام بھی نہ لے سکے کہ حقیقی ملزم ہی پکڑے جائیں اور انہیں عبرت آموز سزا ہو مولانا علیہ الرحمۃ کا خون پولیس کے رازدرانہ قہقہوں میں گم ہو گیا اس قیمتی انسان کے

اُٹھ جانے سے ایک ایسی جگہ خالی ہوئی کہ نہ احرار میں اس قسم کا انسان دوبارہ آسکا نہ کیمبلپور کی مٹی ہی سے ایسا شخص اُٹھا وہ بلاشبہ ان لوگوں میں سے تھے جن کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اس دھرتی پر قدرت کا عطیہ تھے۔

عبداللہ ملک کی شادی

انہی دنوں عبداللہ ملک کی شادی قرار پائی۔ برات کو امرتسر جانا تھا عبداللہ ملک میرا جگری دوست تھا ہم دونوں میں رشتہ موانست انتہائی گہرا تھا ہم ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے یہ سیاسی بال و پر تو اس کو بہت دیر میں لگے جب ہم دوست بنے تھے اس وقت گل و بلبل کی طرح ہم ایک دوسرے کے لیے ضروری ہو گئے تھے۔

مَیں نے قاعدہ کے مطابق ڈپٹی کمشنر کو درخواست دی کہ مجھے اپنے اس عزیز دوست کی شادی پر امرتسر جانا ہے خود میرا گھر وہاں ہے اجازت دی جائے اجازت ہو گئی برات میں کمیونسٹوں کا ایک ہجوم تھا خفیہ پولیس کا ایک سپاہی میری نگرانی کر رہا تھا لاہور سے جس ڈبہ میں ہم سوار ہوئے وہ اُسی میں آ بیٹھا حالانکہ یہ ڈبہ ریزرو تھا کامریڈوں نے دھکے مار کر باہر نکال دیا اس کم بخت نے واپسی پر رپورٹ کی کہ شورش کے ایماء پر اُس سے یہ بدسلوکی ہوئی ہے حالانکہ اس کی اپنی جسارت نے اُسے خراب کیا تھا نقصان یہ ہوا کہ دوسری دفعہ جب مَیں نے ہمشیرہ کی شادی پر انبالہ جانے کے لیئے اجازت مانگی تو ٹکا سا جواب آ گیا اللہ بخشے ڈاکٹر عالم اپنی ہی وضع کے آدمی تھے مستقل مزاج ہوتے تو آل انڈیا لیڈر ہو جاتے لیکن استقلال نہ تھا اس لیے سیاسیات میں کٹے ہوئے پتنگ کی طرح رہے آخر ہمیشہ کے لیئے کنی کٹا بیٹھے اپنے مفاد کے علاوہ کسی معاملہ میں بھی مخلص نہ تھے

نہ اصولوں سے نہ دوستوں سے ایک دن ان کا منشی میرے ہاں آیا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب یاد کرتے ہیں۔ میں نے کہا — ان سے کہیئے میرے حدود نظر بندی ان کی کوٹھی سے بیس پچیس قدم ادھر رہ جاتے ہیں کس طرح آسکتا ہوں؟ ڈاکٹر صاحب نے ملک خضر حیات کو خط لکھا کہ نظر بندی ختم کر دی جائے یا لاہور کارپوریشن تک بڑھا دی جائے اُن کا خط گھومتا پھرتا سی آئی ڈی تک پہنچا ایک دن سید اعجاز حسین شاہ تشریف لائے اور مجھے اپنے انگریز سپرنٹنڈنٹ کے پاس لے گئے۔

"جناب! یہ ہیں شورش کاشمیری"

"شورش کاشمیری"

"جی ہاں"

"بالکل نوجوان"

دو اور انگریز آفیسر پاس ہی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ میں بھی کرسی کو کروٹ دے کر بیٹھ گیا۔

"آپ کی درخواست پہنچی ہے!"

"کونسی درخواست"؟

"نظر بندی ختم کرنے یا حدود بڑھا دینے کے متعلق"

"جی میں نے کوئی درخواست نہیں دی"

"ڈاکٹر عالم نے خط لکھا ہے"

"انہوں نے اپنے طور پر لکھا ہوگا"

قدرے توقف کے بعد ——— جنگ کے بارے میں تمہارا خیال

کیا ہے؟"

"خیال؟"

"ہاں"

"آپ خیال پوچھتے ہیں یا خواہش؟"

"فرق کیا ہے؟"

"ان میں بڑا فرق ہے"

"خیال کیا ہے؟"

"اتحادیوں کی فتح کے آثار روشن ہیں"

"اور خواہش ——— ؟"

"جس کے لیے پانچ سال قید کاٹی ہے اور اب بھی نظر بند ہوں"

"وہ گورا کرسی سے اچھل پڑا۔ آپ پہلے شخص ہیں جس نے اس بے باکی سے بات کہی ہے"۔

"اچھا تمہارے حدود نظر بندی لاہور کارپوریشن تک بڑھا دیئے جاتے ہیں۔"

ڈار اور چڈھا

ناگاہ معلوم ہوا کہ پروفیسر تلک راج چڈھا اور ریاض ڈار لبغرض علاج میو ہسپتال کے فیملی وارڈ میں داخل ہو گئے ہیں دونوں پولیس کے زبردست پہرے میں تھے ایک دن پیغام ملا کہ چڈھا جی یاد کرتے ہیں ظاہر ہے کہ بلا اجازت اُن سے ملنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ تاہم سوچ ساچ کر پیغام بھجوا دیا کہ آج بارہ بجے شب حاضر ہوں گا سر پر ڈیڑھ فٹ

کا طرہ لٹکا یا ٹوانوں کی سی شکل بنائی اور ہسپتال پہنچ گیا ایک اونگھتا ہوا کنسٹیبل ڈیوٹی پر تھا ملاقات ہو گئی اس کے بعد بھی کئی ملاقاتیں ہوئیں لیکن ان کا مقصد کبھی پولیٹیکل نہ تھا محض ایک دوستانہ اخلاص تھا ——— ایک دن مولانا مظہر علی اظہر نے بلا بھیجا کہنے لگے "چڈھا سے تمہاری ملاقاتوں کا سی آئی ڈی کو علم ہو گیا ہے اب گئے تو پکڑے جاؤ گے۔ پولیس گھات میں بیٹھی ہے" یہ اطلاع انہیں سی آئی ڈی کے ایک مسلمان آفیسر سے ملی تھی جو مجھے گرفتار کرنے کے لئے مقرر ہوا تھا میں چوکنا ہو گیا اور دوبارہ میو ہسپتال کا رخ ہی نہ کیا۔

اخلاقی زوال

پربودھ چندر اور لالہ جی ابھی تک جیل میں تھے مکان ان کی اپنی ہی بلڈنگ ویرا ہوٹل کے بالائی حصہ میں تھا گھر میں صرف بچیاں ہی تھیں یا گود کا بچہ، جس شخص نے ہوٹل کرایہ پر لے رکھا تھا اُس نے سارے ہوٹل کو شراب خانہ یا چکلہ بنا دیا تھا اس دردناک صورتحال سے سارا خاندان پریشان تھا پولیس نے کان بہرے کر لیے تھے ایک رات ان حالات کا جائزہ لینے کے لیے میں ویرا ہوٹل — جا پہنچا شریف خالد میرے ساتھ تھے وہ سب کچھ موجود پایا جس کا چرچا تھا ٹھیکیدار سے بہت کچھ کہا لیکن اس کی غیرت مر چکی تھی پہلے بھی کئی دوست اُسے سمجھا چکے تھے لیکن وہ ٹھیکے اور دھندے میں سے کوئی چیز چھوڑنے کے لیے تیار نہ تھا اس کے نزدیک یہ بزنس تھا غصہ میں جھلا کر کہنے لگا آپ عجیب مسلمان ہیں کہ ایک ہندو کے لیے میرے بزنس کو ختم کرنا چاہتے ہیں ——— میں نے یہ تمام واقعات سی آئی ڈی کے ڈی آئی جی کو لکھے اس کی ایک نقل سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس لاہور کو بھیجی ان دونوں شریف انگریزوں نے وعدہ کیا کہ وہ ہفتہ عشرہ میں ٹھیکیدار کو نکال دینگے

یہی ہوا جس ٹھیکیدار کی مونچھیں نیچی نہیں ہوتی تھیں وہ اس طرح نکلا جس طرح دودھ میں سے مکھی نکال دی جاتی ہے تھوڑے دنوں بعد پربودھ جی بھی رہا ہو گئے ان کے مہینہ دو مہینہ بعد لالہ پنڈی داس بھی آگئے میرا حلقہ نظر بندی کارپوریشن تک بڑھ چکا تھا پربودھ نے مجھے پیسہ اخبار کا ماحول چھوڑ دینے پر آمادہ کیا بظاہر پیسہ اخبار کے لوگ مفلس اور مخلص تھے لیکن اُن میں ہر تیسرا آدمی پولیس کا مخبر تھا۔ میں وہاں سے اُٹھ کر ویرا ہوٹل میں آگیا اور یہاں ایک الگ کمرے میں رہنے لگا۔

یامین ڈار کی رحلت

تلک راج چڈھا واپس چلے گئے تو ان کی جگہ کلبیر سنگھ آگئے کبھی ہسپتال کی دیواروں کے پاس سے گزرتا تو اُن سے اور یامین ڈار سے علیک سلیک ہو جاتی۔ کلبیر انتڑیوں کی دق میں مبتلا تھا۔ یامین اختلاجِ قلب میں۔ حکومت نے ان دونوں کو بارہا پیش کش کی کہ وہ ذاتی مچلکہ پر رہا ہو جائیں اور یہ وعدہ کریں کہ جب تک صحت یاب نہیں ہونگے پالیٹکس میں حصہ نہیں لیں گے لیکن دونوں اپنی دھن کے پکے تھے اور ٹکا سا جواب دے چکے تھے۔

ایک روز ابھی پَو نہیں پھٹی تھی کہ پربودھ نے جگا دیا ایک سوہان روح خبر تھی "اُٹھو یامین وفات پا گیا ہے"

"اناللہ وانا الیہ راجعون آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"میو ہسپتال سے فون آیا ہے کہ ویرا ہوٹل میں پربودھ کی معرفت شورش کو اطلاع کر دو کہ یامین ڈار رحلت کر گیا ہے دل کا آخری دورہ پڑا تو اُس نے سٹاف سے کہا میرا

آخری وقت آپہنچا ہے ویرا ہوٹل میں پربودھ کے ہاں شورش کاشمیری ٹھہرا ہوا ہے اُسے فون کرو کہ آکے مل لے بظاہر کسی سیاسی قیدی کے متعلق اطلاع دینے کا سٹاف تو کیا کسی ڈاکٹر میں بھی حوصلہ نہ تھا۔ اُس وقت سٹاف نے سنی اَن سنی کردی لیکن جب تھوڑی دیر بعد دل کا حملہ مہلک ثابت ہوا تو اُس نے پربودھ کو فون کیا ہم دونوں فوراً ہی ہسپتال پہنچے بابین اپنے کمرے میں ابدی نیند سو رہا تھا پولیس کے جوان بدستور پہرہ دے رہے تھے تھانیدار نے روکا "جب تک ڈی آئی جی نعش کو ملاحظہ نہ کرلیں اور ریلیز آرڈر (Release order) نہ ملے اس وقت تک آپ مرحوم کی نعش کے پاس اندر نہیں جا سکتے ہیں کلبیر زار وقطار رو رہا تھا وہ خود پولیس کی نگرانی میں تھا لیکن ہمیں دیکھتے ہی بے قابو ہو گیا گلے مل مل کر رو دیا اور اس طرح رویا کہ ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔ کئی گھنٹے کے بعد ڈی آئی جی سی آئی ڈی نے لاش ہمارے حوالے کی جنازہ اس بے لبسی کے عالم میں اُٹھا کہ مہینوں ملال رہا۔ بابین کے چار بھائی تھے ایک بمبئی میں پروفیسر تھا جس کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ دوسرے مولوی عبدالغنی مشہور کانگرسی لیڈر، تیسرے لاہور کی احمدیہ جماعت میں تھے۔ چوتھے شیخ غلام محی الدین جو اُس وقت سیکرٹریٹ میں سپرنٹنڈنٹ تھے اور اسسٹنٹ ہوم سیکرٹری کے عہدہ سے ریٹائر ہوتے آجکل انجمن حمایتِ اسلام میں آنریری اسسٹنٹ سیکرٹری ہیں۔ مؤخرالذکر دونوں بھائی لاہور ہی میں تھے ہم نے ان کے عزیزوں کو اطلاع کی تو محسوس ہوا انہوں نے اس خبر کو سرد مہری سے قبول کیا ہے گمان یہ تھا کہ وہ پولیس کے عتاب سے بچنا چاہتے ہیں ہم نے فوراً ہی کفن کا انتظام کیا اس اثنا میں پولیس کے اعلیٰ افسروں سے بھی جھڑپیں ہو گئیں شاید انہیں اندیشہ تھا کہ یہ انسان جو سو گیا ہے جاگ اُٹھے گا بہر حال ہم نے ان کی نعش کو ایک ریڑھی میں رکھا۔ کانگرس کے بعض راہنماؤں نے ازراہ عقیدت

اس پر تر نگا ڈالا اور ہم بس بچیس دوست یامین زندہ باد کہتے ہوئے بسوں کے اڈہ کو روانہ ہو گئے لاش امرتسر پہنچی تو ان کے اعزہ و اقربا میں کہرام مچ گیا۔ سینکڑوں خواتین نے اس شدت سے ماتم کیا کہ زمین و آسمان ہل گئے لیکن سی آئی ڈی والے بدستور تانک جھانک میں تھے کہ کون کیا کرتا ہے۔

یامین کی موت کا ہفتوں قلق رہا رہ رہ کے یہ خیال ستاتا رہا کہ ایک مخلص دوست اُٹھ گیا۔ ایک بہادر انسان چل بسا۔ ایک ایسے شخص کی موت واقع ہو گئی جو سرتا پا باغ و بہار تھا۔ موت نے اس کو کس حوصلہ کے ساتھ منتخب کیا ہوگا۔

وہ چاہتا تو رہا بھی ہو سکتا تھا لیکن اُس نے ذاتی مچلکہ دینا بھی قبول نہ کیا جسم کی موت قبول کر لی لیکن عزت کی موت قبول نہ کی اسی کا نام ایثار ہے اور وہ ایثار کر کے امر ہو گیا ——



نظر بندی کا دوسرا سال شروع ہو چکا تھا۔ اس عرصہ میں صرف یہ فرق پڑا کہ نظر بندی کے حدود کارپوریشن تک وسیع ہو گئے۔ لیکن پولیس کی نگرانی بڑھ گئی۔ ہر وقت سی۔ آئی۔ ڈی کے اہل کار نکیرین کی طرح ساتھ رہتے۔ کوئی ملنے آتا تو اس کا پیچھا کیا جاتا۔ کون ہے؟ اور جب تک غلط یا صحیح پتہ نہ لگ جاتا کہ فلاں آدمی ہے، اُس وقت تک سی آئی ڈی کے اہل کار پریشان رہتے۔

کسی وقت طبیعت اُکتا جاتی۔ میں اُٹھ کے دوستوں کے ہاں چلا جاتا تو یہ لوگ ان کیلئے پریشانی کا باعث ہوتے۔ محلہ والوں سے ان کا حدود اربعہ دریافت کیا جاتا۔ تعلقات کی نوعیت معلوم کی جاتی۔ نتیجتہً وہ لوگ جو محض دوست تھے اور کسی اعتبار سے بھی سیاسی نہیں تھے ایک طرح کی سراسیمگی کا شکار ہوتے۔ کئی دوستوں نے اس ڈر سے ملنا چھوڑ دیا دو چار کنی کترا گئے۔ بعض ڈٹے جاتے اور سی۔ آئی۔ ڈی کی اس روش پر قہقہے لگاتے۔

بسا اوقات ہم سی آئی ڈی کے لیئے خود پریشانی پیدا کرتے، بعض دوستوں کو پُراسرار بناتے جس سے ان میں تجسس پیدا ہوتا۔ وہ اِدھر اُدھر دوڑے پھرتے اور کئی کئی دن بدھو بنے رہتے آخر تھک ہار جاتے۔ رپورٹوں کے متعلق تو معلوم نہیں کیا لکھتے اور کیا بکتے تھے لیکن کئی دفعہ زچ ہو کر ہاتھ جوڑنے لگتے اور ہتھیار ڈال دیتے۔ سی۔ آئی۔ ڈی میں کنسٹیبلوں سے لیکر سب انسپکٹروں تک کی عمارت عجیب و غریب تھی۔ انگریزوں نے اہلِ کار کے بجائے اہلکار قسم کے لوگ غداری اور وفاداری کے معیار پر بھرتی کیئے تھے جو صرف اس خدمت پر مامور تھے کہ جرائم کریدیں، انعام پائیں اور برائیوں کے ڈھیر چُن چُن کر آقایانِ ولی نعمت کی خدمت میں حاضر کریں۔

حقیقت یہ ہے کہ برطانوی عملداری میں سی۔ آئی۔ ڈی کے ہندوستانی اہل کار قوم فروشی اور ملک دشمنی کی شرمناک تصویروں کا البم تھے!

یامین کا انتقال میری اس نظر بندی کے دوسرے سال کی پہلی سہ ماہی میں ہوا تھا اور پر بودھ اُس کی رحلت سے کوئی مہینہ بھر پہلے رہا ہوا تھا۔ لیکن اس کی صحت کے در و دیوار ہل گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا اس کے چہرے مہرے کی تمام رونقیں رختِ سفر باندھکر رخصت ہو چکی ہیں ———— اِن واقعات کو سن و سال کے لحاظ سے نہیں بلکہ عنوان و تذکرہ اور بعض جگہ برائے نام تکرار کے تحت قلم بند کیا ہے ———— جو درد ان دنوں اندر ہی اندر گھُن کی طرح کھائے جا رہا تھا وہ میرے جواں سال بھائی یورکش کی بیماری تھی۔ وہ تئیس چوبیس سال کا ایک کڑیل جوان، بلا بلند خوبصورت، وجیہہ و شکیل ذہانت اور فطانت دونوں کے صدف کا موتی تھا قدرت نے اس کو تحریر و تقریر کی خوبیاں عطا کی تھیں وہ اپنا راہنما مولانا ابوالکلام آزاد کو سمجھتا اور اس پر اُن کے قلم کا بے حد اثر تھا۔ عملاً سیاسی آدمی نہ تھا۔ صرف کتابی مطالعہ نے اُسے اُن کا

گرویدہ کر دیا تھا۔ اُجلا سفید کھدر پہنتا جو اس کے گورے چٹے رنگ پر خوب کھلتا تھا۔ کبھی کبھار کھڈی کے چیک بھی پہنتا۔ پاؤں میں چپل، سر پر جناح کیپ، آنکھیں تو اُس نے ایک خوشحال گھرانے میں کھولی تھیں لیکن دس ہی برس کا تھا کہ صدموں سے دوچار ہونے لگا۔ موت تک وہ مصائب ہی کا شکار رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ خوشحالی اور خوشی نے اُس سے کُٹی کر لی ہے۔ جس مصیبت اور اذیت سے ہم نے تیرہ چودہ برس کا یہ زمانہ کاٹا اللہ تعالیٰ علیم و خبیر ہیں آج بھی اُن دنوں کا تصور آتا ہے تو دل کانپ کانپ اُٹھتا ہے اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو بھی اُن بُرے دنوں کی بددعا دیتے ہوئے خوف آتا ہے۔

شاعری اور ادب کی چیٹک نہ لگی ہوتی تو بلا شبہ مَیں یورش سے پہلے مر جاتا یا پاگل ہو جاتا لیکن اسی چیٹک نے مجھے زندہ رکھا اور اب تک جی رہا ہوں۔

اتفاقات دیکھیے جب بھی میری شادی کا معاملہ ہوا قید پیش آ گئی نتیجتہً ایک کے بعد دوسرا رشتہ ٹوٹتا گیا۔ اب کے صورتحال مختلف تھی احباب نے زور دیا کہ شادی ہو جائے تو اچھا ہے۔ مہینوں اِنکار کرتا رہا آخر سپر انداز ہونا پڑا نظربندی کے دن، روزگار مفقود۔ ع

کوئی ویرانی سی ویرانی تھی

کوئی انسان کسی سے امداد لیتا ہے تو جو چیز سب سے پہلے رخصت ہوتی ہے وہ عزتِ نفس ہے ایک عیرت مند شخص اپنی ہی نگاہوں سے گر جاتا ہے ان شدید احساسات کے باوجود مجھے امداد قبول کرنی پڑی یہ امداد مَیں نے سوال کر کے نہیں لی تھی بلکہ پیشکش ہونے پر قبول کر لی تھی۔ میاں قمرالدین رئیس اچھرہ بڑے ہی فیاض اور نیک دل انسان تھے قدرت نے انہیں دولت کے ساتھ ایمان بھی دیا تھا وہ بھی مصر تھے کہ شادی کر لوں۔ رشتہ موجود تھا لیکن سامان نہ تھا۔ گڑیوں کی شادی میں بھی دس بیس روپے خرچ ہو جاتے

ہیں۔ میرے پاس اتنی رقم بھی نہ تھی۔ میاں صاحب نے اس غرض سے پانچ سو روپے عنایت کیئے بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ انہی دنوں یورش کا مرض تیسرے درجے میں داخل ہو گیا وہ دن رات ہلکے ہلکے بخار میں پھنکتا اور خون تھوکتا۔ ایک دن اُسے قے میں اتنا خون آیا کہ بیٹھک کی نالی سُرخ ہو گئی اب تک وہ اونے پونے جی رہا تھا اُس نے صبر و رضا کا دامن تھام رکھا تھا اس کی یہ خطرناک حالت دیکھ کر مَیں گھبرا گیا۔ مجھے خوف محسوس ہونے لگا کہ اب وہ موت کی راہ پر آ گیا ہے اور چند روز کا مہمان ہے جو علاج ہو رہا تھا وہ علاج نہیں تھا صرف خواہشِ علاج کی ادھوری کوششیں تھیں معلوم ہوتا تھا جیسے اَفلاس اور مصیبت نے ہمیں انتخاب کر لیا ہے روپیہ ہو تو علاج ہو یہاں جیب میں پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ شورش کاشمیری کا نام تو ملک کے ہر سیاسی گوشے میں گونجتا تھا اور سیاسیئن کے اعلیٰ و ادنیٰ حلقے بھی متعارف و معترف تھے مگر یہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ جس شخص کی خطابت پر لوگ سر دھنتے ہیں اور جو ابھی ابھی قید کے پانچ سال گذار کے آیا اور اب نظر بندی کا دوسرا سال گذار رہا ہے اس کی جیب میں چند ٹکے بھی نہیں ہیں۔ والد کی آمدنی قلیل تھی بیماری پر خرچ ہو جاتی میری کوئی مستقل آمدنی نہ تھی کچھ لوگ خطبات لکھواتے یا مسودوں کی تصحیح کرا لیتے اُن سے پچاس ساٹھ روپے کی جو آمدن ہوتی وہ نام کے رکھ رکھاؤ پر اُٹھ جاتی تھی۔

مَیں نے محمد طفیل اب مدیر نقوش اور لطیف فاروقی اب مدیر زراعت کی خواہش پر مولانا ابوالکلام آزاد کے خطبات مرتب کیئے۔ ان دونو نے ان دنوں کتابوں کا مشترکہ کاروبار شروع کیا تھا اور یہ ان کی طرف سے پہلی کتاب شائع ہو رہی تھی انہوں نے مجھے دو سو روپے دیئے اُردو اکیڈیمی کی طرف سے میری ایک اور تالیف "آزاد ہند فوج کی تاریخ" "دہلی چلو" کے نام سے شائع ہوئی اس کے مجھے کل چار سو روپے ملے۔ یہ چھ سو روپیہ مَیں نے یورش کی بیماری پر

لگا دیا لیکن اس کا مرض انتہا مہنگا اور مہلک تھا کہ ہم لوگوں کے تصور و تخیل سے بھی پرے تھا ہم کسی بھی دروازے پر دستک نہ دے سکتے تھے۔ میو ہسپتال ہمارے لیے بند تھا۔ وہاں مریضوں کا اس قدر ہجوم تھا کہ نیا داخلہ ملنا قریب قریب ناممکن تھا۔ مَیں نظر بندی کے باعث میو ہسپتال میں جا نہیں سکتا تھا۔ ممکن تھا کہ مَیں ذاتی طور پر کسی ڈاکٹر سے مل ملا کر یا استدعا و التماس کر کے داخلہ حاصل کر لیتا لیکن اس وقت بے بس تھا والد لاچار تھے کسی ڈاکٹر کو اس مرحلہ میں راضی کرنا مشکل تھا ویسے بھی تپدق کے مریض کو آخری حالت میں کون داخلہ دیتا لاہور سے باہر کسی کلینک میں یا سینی ٹوریم میں بھجوانے کا سوال گھریلو حالات کی معاشی عاجزی کے باعث ناممکن تھا۔ زمانہ رسوخ کا تھا اور رسوخ کا ہر پہلو ہمارے لیے عنقا تھا۔

حکام کو بارہا لکھا کہ وہ نظر بندی کے حدود گوالمنڈی کے تھانے تک بڑھا دیں تاکہ بھائی کو میو ہسپتال میں لے جا سکوں سنتا کون؟ مدت تک درخواست پڑی رہی سی آئی ڈی کے "فرشتوں" نے رپورٹ کی کہ کلبیر سنگھ سحر گل اور یامین ڈار میو ہسپتال میں زیرِ علاج ہیں لہٰذا شورش کاشمیری کا وہاں جانا ان حالات میں نامناسب ہے انہیں احساس ہی نہ تھا کہ ایک کڑیل جوان تپدق سے مر رہا ہے اس کی حالت نازک ہے اور شاید چند ہفتوں کا مہمان ہے۔ سی آئی ڈی کے اہلکاروں کا شیوہ یہی رہا ہے کہ وہ انسانوں کے منفی پہلو تلاش کرے اور شقاوتِ قلبی کو احساس فرض قرار دے۔ ان لوگوں نے انگریزی حکومت کے مخالفوں کی قبریں اکھیڑیں، کفن پھاڑے اور لاشیں سونگھیں کہ شاید اس طرح انہیں کوئی چیز مل جائے جو اُن کی خدماتِ جلیلہ کے اعتراف و انعام کا باعث ہو ——

یورش موت کی طرف گامزن رہا جو علاج مقدرت میں تھا بے اثر رہا جہاں تک

قیمتی دواؤں یا بڑی فیسوں کا سوال تھا بس سے باہر تھیں۔ ڈاکٹر عبدالقوی لقمان کسی زمانے میں مجلسِ احرار کے خزانچی رہے تھے وہ بہت اچھے معالج سمجھے جاتے تھے ان کا نام ذہن میں آیا خیال تھا حالات سے آشنا ہیں اور رعایت کریں گے مگر انہوں نے صاف صاف کہدیا کہ مرض خطرناک ہے مریض بچ سکتا ہے ضرورت روپیہ کی ہے ——!!

"ڈاکٹر صاحب اس نوجوان کی زندگی ہر قیمت پر مطلوب ہے میرا بھائی ہے اور بھائی کے لیے جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب کچھ قربان کر سکتا ہوں" میں نے عرض کیا

ڈاکٹر صاحب نے دو انجکشن کیئے مکسچر کی ایک بوتل دی اور سولہ روپے نقد دھرا لیئے اگلے روز تین انجکشن اٹھارہ روپے نقد، تیسرے روز دو ٹیکے کچھ گولیاں اور اکیس روپے نقد — خطبات آزاد اور دہلی چلو کی رقم دِنوں میں اُڑ گئی۔ اب کہاں جائیں ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب بغیر پیسے کے علاج نہ کر سکتے تھے انہوں نے صحیح فرمایا کہ دو برس کے مرض کا علاج ہفتہ بھر میں ناممکن ہے اس بیماری میں ہر سانس روپیہ چاہتا ہے ستم یہ تھا کہ یورش جس کوٹھڑی میں رہ رہا تھا وہ بجائے خود بلیک ہول تھی وہاں دن کو سورج چمکتا نہ شب کو چاند! اس کی تعمیر ہی ایسی تھی کہ چوبیس گھنٹہ گھپ اندھیرا رہتا صفائی کا معاملہ اس سے بھی خراب تھا۔ افلاس اپنے عروج پر تھا احرار کانفرنسیں شورش کاشمیری زندہ باد کے نعروں سے گونجتی تھیں اور ملاقات کو وہ لوگ بھی آتے جاتے تھے جن کے کتوں کو بھی آبِ حیات مل سکتا تھا لیکن مریض کو ہم ایک سیب بھی خرید کر نہ دے سکتے تھے میں یورش کو اس کال کوٹھڑی سے نکال کر اپنی بیٹھک میں لے گیا بیٹھک کا حال اس سے مختلف ضرور تھا لیکن مریض کے لیے بہر حال مہلک تھا مرض میں اضافہ کا پورا سامان موجود تھا نیچے ڈھلائی کی بھٹیاں تھیں جہاں دوکاندار دن بھر لوہا پگھلاتے ظالم دھواں بیٹھک کے کونوں کھدروں

میں گھس آتا مریض کو سخت تکلیف ہوتی لیکن گردشِ تقدیر کا یہ تماشا ہوتا رہا اور ہم مجبور تھے خطرناک بیماری خطرناک غریبی اور خطرناک عاجزی کے ہاتھوں شکست کھا کر حکیموں کا علاج شروع کیا ہلکا بھی اور مفت بھی ——— ع

لیکن مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

شفاء الملک حکیم محمد حسن قریشی کے صاحبزادے حکیم آفتاب احمد قریشی میرے مخلص دوست تھے انہوں نے اپنے مطب کا ہر قیمتی نسخہ آزمایا لیکن مریض گرتا ہی رہا کسی نے کہا حکیم عبدالوہاب نابینا کے صاحبزادے اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کے بھتیجے نیلا گنبد کے چوک کی ایک عمارت میں مطب کرتے ہیں اُن سے رُجوع کرو معلوم ہوا کہ وہ اُمراء کے سوا کسی کے ہاں نہیں جاتے۔ میں یورش کو کاندھوں پر اُٹھا کر ان کے ہاں لے گیا مطب تیسری منزل میں تھا سیڑھیاں چڑھتے چڑھاتے خود میری سانس پھُول گئی حکیم صاحب نے دس بارہ منٹ توجہ ہی نہ کی کسی دوست سے گفتگو کرتے رہے پھر نہایت تمکنت سے مریض پر نگاہ دوڑائی اور کچھ پوچھے بچھوئے بغیر نسخہ لکھ کر اپنے اسسٹنٹ کے حوالے کیا اس نے خمیرہ قسم کی کوئی چیز دے دی قیمت پوچھی تو جواب ملا حکیم صاحب مفت علاج فرماتے ہیں شکر کیا گھر آ گئے۔ یورش سے کہا دوائی لو اُس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا "میں دوائی نہیں لوں گا جس طبیب کے چہرے پر شگفتگی نہیں اور جو مریض سے ہنس کر بولنے میں اپنی وضعداری کی ہتک سمجھتا ہے اس کی دوائی مریض پر کوئی اثر نہیں کر سکتی ہے۔"

میں نے زور دیا کہ دوا اور حکیم دو مختلف چیزیں ہیں اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خمیرہ اُٹھا کر زمین پر پھینک دیا کہنے لگا میں نے یہ دوائی کھائی تو فوراً ہی مر جاؤں گا۔

اس بے بسی میں ایک اور حکیم محمد دین الراعی کا پتہ چلا وہ کشمیر بلڈنگ میں مُدت

سے پریکٹس کرتے تھے شہرت اُن کی یہ تھی کہ تپدق کے اچھے معالج ہیں اور کئی مریض ان سے شفا پا چکے ہیں انہوں نے خود آ کر علاج شروع کیا اور اس شفقت کا ثبوت دیا کہ ایک لحظہ کے لیے اپنی بے مائیگی کا احساس جاتا رہا لیکن دوا مفت مل سکتی تھی غذا نہیں۔ تپدق کا مریض غذا بھی چاہتا ہے۔ حکیم صاحب نے دوستوں کو بھی مات کر دیا لیکن یورش کا مرض بڑھتا ہی گیا وہ تیزی کے ساتھ موت کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ معلوم ہوا کلکتہ کے ایک وید شاہ عالمی دروازے کے باہر مطب کرتے ہیں۔ ان کے پاس بڑا مفید نسخہ ہے اس نیک نفس انسان نے بھی علاج شروع کیا پہلے ایک دو روز تو دوائی کا روپیہ ڈیڑھ روپیہ لیتا رہا پھر چھوڑ دیا ہم نے اصرار کیا نہ مانا۔ وہ مریض اور گھر دونوں کی حالت دیکھ کر متاثر ہوا ایک دن اُس نے بازار سے کوئی دوائی تجویز کی کل دس روپے قیمت تھی لیکن اس دس روپے نے اس کا علاج بھی چھڑا دیا۔ مریض برشگال زدہ دیوار کی طرح گر رہا تھا ایک دن اِس قدر تڑپا کہ ہم سب مایوس ہو گئے والد اور میں نے بہنوں کو اس کے پاس چھوڑا اور خود بے سوچے سمجھے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ میرے پاس صرف تین روپے اور بارہ آنے تھے والد کے پاس ایک روپیہ اور دو آنے ایک سنگین کشمکش نے گھیر رکھا تھا کوئی چار گھنٹے تک میں اور والد موری دروازہ کے باہر گنپت روڈ کے چوک میں یونہی کھڑے رہے والد مجھ سے بھی زیادہ خوددار تھے انہوں نے سوال کرنا سیکھا ہی نہ تھا غور کیجئے ایک کا جوان بیٹا دوسرے کا جوان بھائی مر رہا ہے اور معاملہ صرف اس پر اٹکا ہوا ہے کہ گرہ میں مال نہیں اور علاج روپیہ چاہتا ہے یہاں کھڑا رہنا بھی علاج نہ تھا لیکن ہم دونوں باپ بیٹا، یہاں اس طرح کھڑے تھے جیسے کوئی اجنبی طاقت ہمارے لیے دوائی لا رہی ہے یا کوئی غیبی ہاتھ مدد کو آ رہا ہے گویا ہم نے اپنے نفس کو دھوکہ دے لیا تھا کہ

اِس طرح کھڑا رہنے سے مریض اچھا ہو جائے گا کوئی سی چیز بھی نہ تھی لیکن ہم کھڑے تھے کبھی چپ رہتے کبھی ایک آدھ لفظ بول لیتے والد کے منہ سے عاجزی میں نکل گیا ——

"کہاں جائیں۔ قرض مانگیں تو ملتا نہیں۔ مل جائے تو چکانے کی طاقت نہیں۔ بھیک مانگیں تو عزت جاتی ہے اللہ بے نیاز ہے امیروں کی بیماری غریبوں کو لگ گئی ہے۔"

اُن کا یہ آخری فقرہ میرے دل میں ترازو ہو گیا میں یوں ہو گیا جیسے کوئی لاش ہو۔

جو دوست میری شادی کی فکر میں تھے اور اپنے طور پر روپیہ جمع کر رہے تھے انہیں معلوم تھا کہ اس کا جوان بھائی مر رہا ہے لیکن اس سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا مولانا مظہر علی اظہر دوسرے تیسرے روز خبر لے جاتے باقی احرار دوست بے نیاز تھے انہوں نے گویا یہ فرض کر لیا تھا کہ سب اچھا ہے۔

ایک دن اچانک میاں قمر الدین نے یاد فرمایا۔ حاضر ہوا تو کہنے لگے۔

"شادی کب کر رہے ہو"؟

"مَیں تو بھائی کی وجہ سے سخت پریشان ہوں"

"سُنا ہے کہ اس کی حالت خراب ہے"

"جی ہاں"

"وہ پانچ سو روپیہ اس کی بیماری پر تو نہیں لگا دیا۔ دوبارہ مَیں شادی کے لیے کچھ نہ دوں گا"؟

ان کلمات سے مَیں لرز گیا میاں صاحب اس قسم کے آدمی نہ تھے لیکن ان کی زبان سے یہ کلمات نکل گئے —— مَیں آبدیدہ ہو کر اُلٹے پاؤں گھر آ گیا منشی شمس الدین

کو بلا بھیجا انہی کے پاس وہ روپیہ تھا اور وہی شادی کا انتظام کر رہے تھے ان سے کہا کہ پانچ سو روپیہ کی رقم فی الفور میاں قمرالدین کو واپس کر دو وہ بھاگم بھاگ مولانا منظہر علی اظہر کے ہاں پہنچے۔ مولانا نے مجھ سے واقعہ پوچھا میاں صاحب کے ہاں گئے میاں صاحب نے گاڑی بھیج کر مجھے بلوایا۔ دیر تک معذرت کرتے رہے انہیں خود بھی قلق تھا کہ نہ جانے اُن کے منہ سے یہ کلمہ کیونکر نکل گیا؛

مَیں یہی سوچتا رہا کہ پانچ سو روپیہ زیادہ وزن رکھتا ہے یا ایک جواں سال بھائی! جس کو افلاس نے تپ دق کے حوالے کیا اور تپدق نے قبر سے قریب کر دیا ہے۔ حضرت شفاء الملک نے کہلا بھیجا کہ وہ ایک طبی بورڈ ترتیب دے کر یورش کو دیکھنا چاہتے ہیں کیا رائے ہے؟ عرض کیا میری رائے کیا ہو سکتی ہے اس معاملہ میں رائے تو آپ کی ہے لیکن یہ بورڈ کوٹھیوں میں مفید ثابت ہو سکتے ہیں کوٹھڑیوں میں نہیں۔ مجھے نظر آ رہا تھا کہ یورش ختم ہو رہا ہے بلکہ ختم ہو چکا ہے اب طبی بورڈ کیا مسیحائی کر سکتے ہیں؟ نسبت روڈ کے چوک اور چیمبرلین روڈ کے نکڑ پر حکیم دینا ناتھ کو ہلی کا دواخانہ تھا۔ ان کے پاس دق کا تیر بہدف علاج بیان کیا جاتا تھا۔ ان سے عرض کیا تو وہ مریض کو دیکھنے گھر میں آ گئے پہلے وزن کیا پھر دوائی دی اگلے دن دوبارہ وزن کیا مایوسی ظاہر کر کے چلے گئے۔ کہنے لگے "مریض کو اس جگہ سے لے جاؤ یہ دھواں جو اُڑ اُڑ کر اندر آتا ہے اس کی زندگی کو اور تلخ کر رہا ہے مرض میں سڑاند پیدا ہونے کا خدشہ ہے"۔

کہاں لے جائیں؟ یہی سوچا کہ احاطہ لالو شاہ کی کچی کوٹھڑی میں واپس کر دیں جہاں اگر روشنی نہیں تو دھواں بھی نہیں ہے چنانچہ یورش کو بیٹھک سے اُٹھا کر کوٹھڑی میں بھجوا دیا ـــــ اس دردناک صورت حال کا ڈاکٹر گوپی چند بھارگو اور سیٹھ سدرشن کو پتہ

چلا تو تشریف لائے گنگارام ہسپتال میں داخلہ پر زور دیا داخلہ کی ذمہ داری وہ خود لے رہے تھے
ان کے بُشرہ سے معلوم ہوتا تھا کہ دل سے ہمدردی کر رہے ہیں لیکن مجھے یقین ہو چکا تھا
کہ یورش میں زندگی کی اب کوئی رمق باقی نہیں رہی وہ جلد ہی رخصت ہو رہا ہے اس کا
سپید و سرخ چہرہ زرد ہو کر ماند پڑ گیا تھا اس میں حرکت کرنے کی سکت بھی نہیں تھی
وہ چراغ آخر شب تھا۔ مَیں اُسے کن انکھیوں سے تک کر بیٹھک میں چلا آتا اور دروازہ
بند کر کے دیر تک روتا میرا بازو ٹوٹ رہا تھا زندگی اس کے لیے مشکل اور موت آسان ہو
گئی تھی کئی کئی گھنٹے سر بہ زانو ہو کر سوچا کرتا موت نے اسے کیوں منتخب کیا ہے؟ وہ اس
جواں سال کو چھوڑ نہیں سکتی؟ دماغ میں خیالات کا ایک تانتا بندھا رہتا۔ طرح طرح کے
افکار گھومتے پھرتے۔ ایمان کا دامن چھوڑتے ہوئے خوف محسوس ہوتا تھا آخر مشیت ایزدی
کے سامنے سر جھکا دیتا اور یقین کرتا کہ اللہ کی رضا ہی میں بہتری ہے کبھی کفر انگلی
تھام کر منفی خیالوں کے غار میں لے جاتا تو وہاں دیر تک "خدا ہے کہ نہیں ہے" کے
سوال پر سوچتا۔ مشیت پر نکتہ چینی کرتا لیکن دل ہمیشہ ہی مسلمان رہا۔ منفی خیالات جلد ہی
عنقا ہو جاتے اور مَیں پھر اپنے خدا سے رُجوع کرتا۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ یہ جو کچھ
بھی ہو رہا ہے اللہ کی طرف سے آزمائش ہے حق ذات اللہ کی ہے اور اللہ کے
سوا ہر چیز باطل ہے اللہ نہ ہوتے تو انسان انسان کو کھا جاتا حکومتوں کی پولیس انسانوں
کو ہڑپ کر جاتی۔ سی آئی ڈی کے مقربین انسانوں کو اس طرح نگل جاتے جس طرح
سانپ چھپکلی کھا جاتا ہے اور بلی کبوتر پر لپکتی ہے۔ یاس اور تلخی کے اس عالم میں مَیں
نے ڈاکٹر گوپی چند بھارگو اور سیٹھ سدرشن کو بھی جواب دے دیا انہوں نے بہتیرا زور
لگایا لیکن مَیں اپنے جواب پر قائم رہا۔ مجھ میں قدرتی طور پر جھنجلاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔

میرے ردعمل کا پارہ اس درجہ تیز ہو چکا تھا کہ میں نے اُن کے اخلاص یا ہمدردی کو بھی سیاسی احسان سمجھا اور بدتمیزی یہ کی کہ ان کے منہ پر کہہ دیا کہ مجھے اس سیاسی احسان کی ضرورت نہیں ہے ڈاکٹر صاحب کو قدرتی طور پر ناگوار گذرا لیکن وہ اتنے ٹھنڈے دل و دماغ کے آدمی تھے کہ مسکرا کر طرح دے گئے اُسی دن شام کو لالہ پنڈی داس کا پیغام آگیا کہ دیوان چمن لال نے کرنل (نام یاد نہیں رہا) سے وقت لیا ہے اور وہ شام کو مریض دیکھنے آرہے ہیں یہ پیغام لالہ جی کے چھوٹے بھائی کیپٹن لائے تھے لیکن میں نے اُن سے بھی خوبصورت الفاظ میں معذرت کر دی اور کہلا بھیجا کہ اب تو یورش گھڑی دو گھڑی کا مہمان ہے کوئی سی قیمتی دوا یا بڑا ڈاکٹر اس کی جانکنی کو ٹال نہیں سکتا ہے۔

میں دو دفعہ سرکار کو خط لکھ چکا تھا کہ میری پابندیاں ہٹا دی جائیں تاکہ میں اپنے جواں سال بھائی کا علاج کر سکوں لیکن حکومت کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی اور مریض تھا کہ رینگ رینگ کر موت کے دروازے پر آپہنچا تھا امیدوں کے بہت سے چراغ حکومت کی سنگدلی سے بجھ گئے ہر آس ٹوٹ گئی تھی ملک خضر حیات ٹوانہ وزیراعظم پنجاب اور مسٹر میکڈانلڈ ہوم سکیرٹری حکومت پنجاب کو میں نے ایک ہی مطلب کے دو مختلف خط لکھے تھے جن میں اُن سے کہا تھا کہ وہ خدا کا خوف کریں اور ایک ایسے نوجوان کے علاج کی خاطر پابندیوں کو منسوخ کر دیں جس نے خود کوئی جرم نہیں کیا لیکن حالات کی خانہ ویرانی کے باعث تیئس اور چوبیس سال کی عمر میں مر رہا ہے۔ ہوم سکیرٹری کے نام جو خط لکھا اس کا متن یہ تھا ——

بخدمت ہوم سیکرٹری

حکومت پنجاب لاہور

جناب محترم !

آپ نے مجھ پر جو پابندیاں لگا رکھی ہیں، میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ وہ قانوناً یا اخلاقاً کس حد تک درست ہیں لیکن ایک سنگین صورتحال جو اس وقت ہمیں درپیش ہے اُس طرف آپ کی توجہ منعطف کرانا ضروری ہو گیا ہے میرا بھائی محمد اقبال یورش بعمر ۲۳ سال تپدق کے موذی مرض میں مبتلا ہے اس کی حالت سخت نازک ہے علاج کی راہیں پیدا کرنے کے لیے اس نظربندی کا ختم ہونا ضروری ہے آپ ان احکام کو واپس لیں جو میرے نزدیک صریحاً ناجائز ہیں یہ انسان دوستی کا سوال ہے اگر آپ نے نظربندی کے یہ احکام واپس نہ لیے تو مجھے یقین ہو گا کہ آپ اس نوجوان بچہ کی موت کو قریب لانے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے بلکہ اس کے قاتل مرض میں برابر کے شریک ہیں۔

دوسرا خط ملک خضر حیات کو لکھا اس کا متن یہ تھا ——

ملک صاحب محترم !

سلام مسنون

ممکن ہے سی آئی ڈی نے آپ کو مطلع کیا ہو کہ میرا چھوٹا بھائی محمد اقبال یورش (بعمر ۲۳ سال) تپ دق کے موذی مرض کا شکار ہے اس وقت وہ موت وحیات کی کشمکش میں ہے۔ علاج کا سروسامان مہیا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ میری نظربندی ختم ہو تاکہ میں اس کے لیے زندگی تلاش کر سکوں یا اس کی موت سہل ہو جائے میں نے تین چار دفعہ ہوم سیکرٹری کو اس غرض سے خط لکھا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے وہاں انسانوں

کے بجائے پتھروں کی مورتیاں بیٹھی ہیں جن پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔۔۔ اب آپ سے رجوع کر رہا ہوں۔ آپ موجودہ وزارت کے سردار ہیں اور ان امور کی تمام ذمہ داری بالواسطہ اور بلاواسطہ آپ پر عائد ہوتی ہے۔ التماس ہے کہ آپ اُس جاں گداز صورتحال پر غور فرمائیں جو آجکل ہمیں درپیش ہے۔ درخواست صرف اتنی ہے کہ آپ نظربندی کے یہ احکام واپس لے لیں جن کی عمر سال ڈیڑھ سال ہو چکی ہے اگر میرا بھائی اسی حالت میں مرگیا تو ممکن ہے یہ آپ کے لیے کوئی واقعہ نہ ہو لیکن ہمارے لیے یہ ایک سانحہ ہوگا اور ممکن ہے قیامت کے روز آپ کو خدا کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے۔ والسلام

المخلص

شورش کاشمیری

دن گذرتے گئے جواب نہ آیا حکومتوں کی اپنی عزت کا سوال ہو تو آنکھ کی جھپکی میں کنواری مریم ہو جاتی ہیں لوگوں کا سوال ہو تو پتھروں کی طرح سوچنے سے انکار کر دیتی ہیں اس وقت ان کی حالت اُس نائکہ کی سی ہوتی ہے جس کے سینہ میں ضمیر نام کا کوئی کانٹا نہیں ہوتا۔ اور جو اپنے سوا ہر معاملہ میں بے حس ہوتی ہے حکومت طاقتور ہو تو چھنال ہے کمزور ہو تو نائکہ۔

آخر یورش کا آخری وقت آگیا۔ ۷ ار دسمبر ۱۹۴۴ء اس کی زندگی کا آخری دن تھا اس کی ہر چیز مر چکی تھی صرف آنکھیں کھلی تھیں جن سے وہ ٹکر ٹکر دیکھ رہا تھا یا دل حرکت کر رہا اور موت کے انتظار میں دھڑک رہا تھا اس کے پاؤں پر ورم آچکا تھا دونوں پاؤں سوج کر منوں بوجھل ہو گئے تھے اس نے اس ظلمت خانہ میں جہاں وہ دم توڑ رہا تھا دیواروں کو واپسیں نظروں سے تکنا شروع کیا اُسے بھی یقین ہو چکا تھا کہ اب وہ

ختم ہو رہا ہے اس کی نگاہیں ایک ایک سے معانقہ کر رہی تھیں ہم سب اس کی چارپائی کے گرد احاطہ کئے ہوئے تھے وہ ایک ایک کو دیکھتا اور نظریں جھکا لیتا تھا وہ ایک بہادر انسان تھا۔ پرلے درجہ کا غیور، مستقل مزاج، ضدی، خوددار، عزت مند، ذہین اور دلیر، غیرت کا پتلا۔ اس نے اپنے باپ اور بھائی سے بھی کبھی سوال نہ کیا تھا اب بے بس پڑا تھا۔۔۔۔ اس کے پھیپھڑے بالکل سڑ گئے تھے اس کا اندر کوئلہ ہو گیا تھا جب اس پر جانکنی سے پہلے کی رونق آئی تو اس نے اپنے بہنوئی کو انتہائی کرب کے عالم میں کہا۔۔۔۔

"مجھے خدا کے لیے بچاؤ"

لیکن اب اسے کوئی انسان نہیں بچا سکتا تھا اور خدا کی رضا اپنا فیصلہ دے چکی تھی تمام دن اسی تذبذب میں گزر گیا موت نے طول کھینچا میری آنکھ لگ گئی خواب دیکھا کہ شاخ سے گلاب کا ایک پھول ٹوٹ گیا ہے آنکھ کھلی تو پھول واقعی ٹوٹ رہا تھا۔ وہ دق ہی سے نہیں بلکہ مفلسی کی چوٹ کھا کھا کر مر رہا تھا۔ پچھلے دس دنوں کا نقشہ کھنچ کھنچ کے سامنے آتا رہا ہم اس کے لیے کچھ بھی نہ کر پائے تھے دواؤں کی خرید استطاعت سے باہر تھی اچھی غذا عنقا، پھل ہما، بڑی بہن ہر روز چند پیسوں میں گلے سڑے انار خریدتی اچھے دانوں کو چنتی اور اپنے میلے کچیلے دوپٹے کو دھو کر اس میں نچوڑتی یہ تھا جوس جو پرورش کو موت کے دروازہ تک ملتا رہا۔ آخری دفعہ اُس نے کوئی گیارہ بجے شب آنکھیں کھولیں تو صرف یہ کہہ سکا کہ "غریبی قدرت کی خوفناک سزا ہے اور غریب قدرت کا خوفناک مذاق۔ یہ دنیا کچھ نہیں۔ سب اللہ ہی اللہ ہے۔

مَیں ایک بجے شب بیٹھک میں چلا گیا والد دن بھر کے تھکے ماندے تھے ان کی آنکھ لگ گئی خواب دیکھا کہ چاند شق ہو گیا ہے اور سنہرے پروں کا ایک کبوتر اس کے اندر چلا

گیا ہے۔ روایت اُن کی یہ تھی کہ جب ان کے ہاں کسی لڑکے کی پیدائش ہوتی تو چاند کھلتا اور اندر سے کبوتر اُڑ کے باہر آجاتا لڑکی پیدا ہوتی تو کبوتری اُڑ کے آتی۔ یورش کی پیدائش پر سنہرے پروں کا کبوتر نکلا تھا وہی کبوتر آج واپس چلا گیا والد خواب دیکھتے ہی ہڑبڑا کر اُٹھے یورش اس وقت حملہ جانکنی کی آخری زد میں تھا۔ ———

"شورش!" یہ میرے بہنوئی کی آواز تھی۔

"خیریت ہے" میں نے اُوپر ہی سے آواز دی۔

"یورش کا انتقال ہو گیا ہے"

میں اُڑ کے پہنچا تو والد غش کھا کے اس کی پائنتی پر پڑے تھے دو بہنیں پچھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ میں نے سب سے پہلے یورش کا منہ چوما اس کو جھنجھوڑا۔

"اٹھو یورش اتنی جلدی سو گئے"

کب اٹھو گے

اُٹھتے کیوں نہیں؟

خدا کے لیے ایک دفعہ تو آنکھیں کھولو۔"

لیکن وہ ہمیشہ کی نیند سو چکا تھا۔ اب اس کا جگانا فضول تھا اس کو مرض سے بالکل آرام آچکا تھا۔

کوئی دس بجے صبح ہم اس کی میت لے کر میانی صاحب کے قبرستان کو چلے تو ایک ہجوم ساتھ تھا گریہ و زاری سے میرا حال بُرا ہو گیا کئی دوستوں نے مجھے اپنے بازوؤں میں لے رکھا تھا مولانا داؤد غزنوی، علامہ تاجور، ڈاکٹر گوپی چند بھارگو دیوان چمن لال، مولانا مظہر علی، سیٹھ سدرشن اور لالہ جگت نارائن سہارا دے رہے تھے۔

ساحر لدھیانوی سر جھکائے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اختر شیرانی جنازہ کی چارپائی کو پکڑے چلا چلا کے کہہ رہا تھا۔ "اللہ میاں اس کڑیل نوجوان پر یہ ستم کیوں توڑا ہے مجھے اُٹھالیا ہوتا ——— میں بے کار ہوں۔ میں نے زندگی کھا پی لی ہے ———"

پرانی انارکلی کے آخری نکڑ یعنی جین مندر تک میری نظربندی کے حدود تھے میں اس سے آگے نہیں جاسکتا تھا سرکاری گماشتہ ہمراہ تھا میں چاہتا تو قبرستان تک چلا جاتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ پابندیاں توڑنے کی پاداش میں مقدمہ چلتا اور میں قید ہو جاتا لیکن دوستوں نے روک کر واپس کر دیا۔ میں چوک میں کھڑا دور تک جنازہ کو تکتا رہا ——— ؎

اک جنازہ جا رہا تھا دوش پر تقدیر کے

نصف فرلانگ پر قبرستان تھا لیکن قانون نے پابہ زنجیر کر دیا تھا کہ اس حد سے آگے بھائی کے جنازہ کو بھی کندھا نہیں دے سکتے ہو۔ یہ ایک ایسا المیہ تھا جس کا لغت میں کوئی نام نہیں دوستوں کے چہروں پر زردی کا کفن تھا۔

لوگوں کی واپسی تک میں اسی چوک میں کھڑا رہا۔ لوگ میت دفنا کر گھر پہنچے تو پلیہ اچھا پولیس اسٹیشن کا سب انسپکٹر دروازہ پر کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہوم سیکرٹری کا دستخطی حکم نامہ تھا ——— "گورنر پنجاب بڑی مسرت کے ساتھ شورش کاشمیری پر عائد کردہ اُن پابندیوں کو واپس لینے کے احکام صادر کرتے ہیں جن کی رو سے وہ اب تک انارکلی پولیس کے علاقہ میں نظربند ہے یہ پابندیاں اس کے بھائی کی علالت کے پیش نظر واپس لی جاتی ہیں اس کی نقل و حرکت پر اب سے کوئی پابندی نہیں رہی ہے"

ساحر غصہ سے کانپنے لگا میرے ہاتھ سے حکم نامہ لے کر اُس نے ذیل کے اشعار

لکھے اور سب انسپکٹر کے حوالے کرتے ہوئے طنزاً کہا ——— "حکم حضور سے اطلاع پائی" ——— ۵

اِک دیا اور بُجھا اور بڑھی تاریکی   شب کی سنگین سیاہی کو مبارک کہہ دو
جاؤ بجھتی ہوئی آنکھوں کے سسکتے اشکو   جاؤ فرعونوں کی شاہی کو مبارک کہہ دو
جاؤ جمہور کے روندے ہوئے بے بس جذبو   جاؤ پگھلا ہوا تپتا ہوا لاوا بن جاؤ
جاؤ معصوم جنازے کے فسردہ پھولو   جاؤ قانون کے ایوان پہ شعلے برساؤ
جاؤ اے وقت کے تاریک بھیانک سایو   میکڈانلڈ سے کہو اب کوئی زحمت نہ کرے
جاؤ اس قتل کے بالواسطہ مجرم سے کہو   اب کوئی وعدہ تکلیفِ مروت نہ کرے
جاؤ پنجاب کی سرکار سے جاکر کہہ دو   سینکڑوں سینوں میں چنگاریاں رُخشندہ ہیں
موت ایوانِ وزارت پہ کھڑی ہنستی ہے   جاؤ اور خضر سے کہہ دو ابھی ہم زندہ ہیں

اور یہ تھا پسِ دیوارِ زنداں کی اس کہانی کا تکملہ ۔

قید و بند کی دو اور کہانیاں

پہلی کہانی

تمغۂ خدمت

شورش کاشمیری کا گستاخ قلم مزاجِ شاہاں سے ہمیشہ الجھتا رہا ہے۔ ۱۹۶۵ء کی سترہ روزہ جنگ میں
ورش کاشمیری نے اعلان کیا تھا — ع میرا سب کچھ مرے وطن کا ہے!
ایوب خان نے اس جنگ کی پہلی سالگرہ پر (چھ ستمبر ۱۹۶۶ء) شورش کاشمیری کو سنٹرل جیل منٹگمری (اب ساہیوال)
ں ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت نظر بند کر دیا —— یہ تھا تمغۂ خدمت
وہ ۱۰۹ روز قید و بند میں رہے، اِن دنوں کے احساسات کو شورش کاشمیری نے روزنامچہ کی شکل میں حوالۂ قلم کیا
مغۂ خدمت اُس زمانۂ اسیری ہی کے تاثرات کا مرقع ہے —— (زیرِ طبع)

دوسری کہانی

موت سے واپسی

۱۹۶۸ء میں شورش کاشمیری کو دوبارہ گرفتار کر کے پنجاب سے باہر ڈیرہ اسمٰعیل خان سنٹرل جیل بھیجا گیا ——
ایوب خاں اور موسیٰ خاں اپنے درباریوں سمیت خدا ہونے کا اعلان کر رہے تھے انہیں گھمنڈ تھا کہ شورش کاشمیری اس
ت مستعار میں اب باہر نہیں آسکے گا، لیکن آٹھ ماہ قید کے شب و روز جو پسِ دیوارِ زنداں کی دس سالہ قید کے مصائب پر
لے گئے۔ ایوب خاں کے اقتدار کی موت ہو گئی
شورش کاشمیری نے ۴۵ دن کی بھوک ہڑتال کے بل پر حکومت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا جن لوگوں
ورش کاشمیری کے قتل کا منصوبہ باندھا تھا اُن کی سیاسی نعشیں عبرت کے چوراہے پر لٹک گئیں۔
موت سے واپسی آزمائش و ابتلاء کے اِن ایامِ رفتہ کی روداد ہے (زیرِ طبع)

مطبوعات "چٹان"
۸۸ میکلوڈ روڈ لاہور

سرورق - استاد اللہ بخش ★ مطبوعہ چٹان پرنٹنگ پریس - لاہور